برائے طلبا بی اے اردو پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

شرح
نثری ادب

پروفیسر حفیظ صدیقی

صدر شعبہ اردو ایم اے او کالج۔ لاہور

پروفیسر شاہد صدیقی

شعبہ اردو گورنمنٹ گرلز کالج۔ ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ

علمی کتاب خانہ اردو بازار کبیر سٹریٹ لاہور

برائے طلبأ بی اے اردو پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

شرح

نثری ادب

پروفیسر حفیظ صدیقی

صدر شعبہ اردو ایم اے او کالج۔ لاہور

پروفیسر شاہد صدیقی

شعبہ اردو گورنمنٹ گرلز کالج۔ ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ

علمی کتاب خانہ اردو بازار کبیر سٹریٹ لاہور

پبلشرز ———— علمی کتاب خانہ
اُردو بازار لاہور

پرنٹرز ———— منظور پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ۲۴ روپے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ہ

اِنتساب

مُحِبّی

ڈاکٹر محمد احسان الحق

کے

نام

پیش لفظ

زیر نظر کتاب بی اے کے اُردو کے طالب علموں کے لئے لکھی گئی اور نثری ادب کی شرح پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ کہنے کو تو ضرورت ہی نہیں کہ یہ بی اے کے نصاب کے حوالے سے ہے یا نصاب کے عین مطابق ہے، اس لئے کہ اسے ہونا ہی نصاب کے حوالے سے نصاب کے عین مطابق چاہیئے۔ ضرورت صرف یہ بتانے کی ہے کہ یہ کس طرح رہنمائی کرے گی، اُن طالب علموں کی جو باقاعدہ کالجوں کے طالب علم ہیں اور اُن طالب علموں کی بھی جو اپنے طور پر امتحان کی تیاری کرتے ہیں اور پھر پرائیویٹ طور پر امتحان دیتے ہیں۔ ساری کی ساری شرح نہائیت سادہ اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے اور اسے اس قدر جامع بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں ہی طرح کے طالب علم اس سے یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب کے نمایاں پہلوؤں کا تھوڑا سا ذکر ضروری ہے۔

۱۔ سوانحی خاکے

اسباق کے آغاز میں مصنّف کا مختصر سوانحی خاکہ دے دیا گیا ہے۔ یہ خاکے تمام تر اختصار کے باوجود مصنّف کی زندگی کا پورا تعارف پیش کرتے ہیں۔ ہر طرح کی غیر ضروری طوالت سے گریز کیا گیا ہے۔ ایسے مصنفین کے سوانحی خاکے نہیں دیئے گئے جن کے بارے میں نصاب میں صراحت سے دیا ہوا ہے کہ امتحان میں نہیں پوچھے جائیں گے کیونکہ بنیادی طور پر امتحانی ضرورت ہی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۲۔ اندازِ تحریر کی خصوصیات

سوانحی خاکے کے بعد مصنف کے اندازِ تحریر کی نمایاں خصوصیات دے دی گئی ہیں۔ احتیاط کی گئی ہے کہ غیر ضروری طوالت سے بہتر اندازِ تحریر کی جُملہ خصوصیات ضرور شامل ہو جائیں۔ تاہم جن مصنفین کے اندازِ تحریر کے بارے میں امتحان میں سوال نہیں آسکتا، ان کے اندازِ تحریر کی خصوصیات نظر انداز کر دی گئی ہیں۔

۳۔ خلاصے :

فرہنگ سے قبل اسباق کے خلاصے دیئے گئے ہیں جن کی موجودگی میں نہ صرف تشریح کا کام آسان ہو جاتا ہے بلکہ اسباق کے حوالے سے سوالات کے جواب دینے بھی آسان ہو جاتے ہیں

فرہنگ

ہر سبق کے آغاز میں تمام مشکل الفاظ کے معانی دے دیئے گئے ہیں۔ اس امر کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ طالب علم کو پوری کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں بھی لغات کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے۔ یہ فرہنگ ایک طرح سے "نثری ادب" کے حوالے ایک مکمل لغت ہے۔ صفحات کے حوالے کتاب کے پہلے ایڈیشن (طبع شدہ ۱۹۸۶ء) کے مطابق ہیں۔

(۵) اقتباسات کی تشریح

ہر سبق کے اہم اقتباسات کی متن کے حوالے سے تشریح دے دی گئی ہے۔ یہاں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مفہوم کی وضاحت بھی ہو جائے، حوالے بھی آ جائیں اور تشریح میں زیادہ طوالت بھی نہ آ جائے۔ صرف اسی قدر وضاحت کی گئی ہے جتنی ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ ان اقتباسات کی تشریح پڑھ چکنے کے بعد فرہنگ کی موجودگی میں طالب علم ان تمام پیروں کی بھی بآسانی تشریح کریں گے جو شامل نہیں کئے گئے۔

۶۔ تنقیدی سوالات

جن اسباق اور مصنفین کے حوالے سے امتحان میں تنقیدی سوال پوچھے جا سکتے ہیں، ان کے حوالے سے اہم تنقیدی نوٹ دیئے گئے ہیں۔ یہاں بھی مناسب حد تک اختصار مگر جامعیت ہے۔ دیگر اسباق یا مصنفین کے بارے میں تنقیدی سوال نہیں دیئے گئے کہ امتحانی لحاظ سے یہ زائد تھے اور محض کتاب میں ضخامت کا باعث بنتے۔ جس قدر تنقیدی مواد دیا گیا ہے، وہ اس حد تک کافی ہے کہ اگر ان سوالوں سے ملتے جلتے اور سوال بھی امتحان میں آ جائیں تو طالب علم اسی مواد کی روشنی میں اُن کے جواب بآسانی لکھ سکیں گے۔

کوشش کی گئی ہے کہ نثری ادب کے حوالے سے ایک معتبر اور قابل انحصار دستاویز پیش کر دی جائے مگر ہزار احتیاط کی جائے تو بھی انسان کی ہر سعی میں خامی بھی ممکن ہے وہ اسے بہتر بنانے کے لئے امکانات بھی موجود رہتے ہیں۔ اساتذہ کرام کی خدمت میں یہ کتاب فخر سے نہیں، نہایت عاجزی سے پیش کی جا رہی ہے۔ ان کے مشورے نہ

صرف شکریے کے ساتھ قبول کئے جائیں گے بلکہ آئندہ اشاعتوں میں ان سے استفادہ بھی کیا جائے گا۔

یکم نومبر ۱۹۸۶ء

۱۔ پروفیسر حفیظ صدیقی

۲۔ پروفیسر شاہدہ صدیقی

فہرست

مکاتیب

مضامین

انشائیے

تنقید اور تحقیق

نصاب بی اے اردو (پرچہ الف)

پنجاب یونیورسٹی

۱۹۸۶ء-۸۷ تا بعد

۱۔ متن کے حوالے سے اشعار کی تشریحات ۳۰ نمبر

۲۔ متن کے حوالے سے نثری اقتباسات کی تشریحات ۴۰ نمبر

۳۔ منظور شدہ نصابی کتابوں میں سے مختلف اسباق اور اصنافِ نظم و نثر پر تعارفی سوالات۔ ۱۵ نمبر

۴۔ مندرجہ ذیل شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں سوانحی اور تنقیدی سوالات ۱۵ نمبر

(الف) میر، سودا، درد، نظیر، انیس، غالب، حالی، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، فیض، مجید امجد

(ب) میر امن، غالب، سید احمد خاں، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، عبدالحق، پریم چند، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس

منظور شدہ نصابی کتابیں

۱۔ شعری ادب — مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

۲۔ نثری ادب — 〃 ڈاکٹر سید معین الرحمان

۳۔ افسانوی ادب — 〃 سہیل احمد خاں

اسد اللہ خاں غالب

مکاتیب

سوانحی خاکہ

مرزا اسد اللہ خاں غالب پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اسد کی بجائے غالب تخلص رکھ لیا۔ آپ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ نہ صرف اردو اور فارسی کے اہم شاعر ہیں بلکہ اردو اور فارسی کے اہم نثر نگار بھی ہیں۔ آپ کے آباء و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور سمرقند کے رہنے والے تھے۔ آپ کے دادا ترکِ وطن کر کے ہندوستان آ گئے اور شاہ عالم کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان کی بہت عزت افزائی کی گئی اور جاگیر بھی عطا ہوئی لیکن جلد ہی ملک بدنظمی کا شکار ہو گیا اور جاگیر جاتی رہی۔ آپ کے والد مرزا عبد اللہ بیگ خاں ایک فوجی افسر تھے۔ وہ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے پاس ملازم ہوئے، پھر کئی سال تک حیدر آباد دکن میں ملازمت کرتے رہے۔ بعد میں الور چلے گئے۔ ابھی غالب کی عمر صرف پانچ سال کی تھی کہ والد ایک لڑائی میں مارے گئے۔ اب ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے ان کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ وہ آگرہ کے صوبہ دار تھے۔ بعد میں انہیں سرکارِ انگریزی کی طرف سے سترہ سو روپے، تنخواہ کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر بھی عطا ہوئی مگر چار ہی سال بعد جبکہ غالب کی عمر ابھی صرف نو سال تھی چچا کا انتقال ہو گیا اور ان کے وارث کی حیثیت سے آپ کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ پنشن ملنے لگی۔ چچا کی وفات کے بعد ان کے نانا خواجہ غلام حسین نے ان کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ خواجہ غلام حسین آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ ابھی غالب کی عمر صرف تیرہ سال ہی کی تھی کہ ان کی شادی دہلی کے ایک معزز خاندان میں نواب الٰہی بخش خاں کی بیٹی سے ہو گئی اور انہوں نے دہلی ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ذوق کی وفات کے بعد شہزادہ فخر الدین ولی عہد سلطنت نے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا فریضہ بھی انہیں سونپ دیا گیا اور باقاعدہ تنخواہ مقرر کر

دی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں جو ناگفتہ بہ حالات ہوئے ان کا غالب پر بھی اثر پڑا۔ ان کی تنخواہ اور پنشن بند ہوگئی۔ دو سال تک شدید مالی مشکلات کا شکار رہے۔ اس کے بعد نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور نے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جو انہیں تا حیات ملتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے تین سال بعد ان کی پنشن بحال ہوگئی لیکن انہیں حسبِ منشا فارغ البالی میسر نہ آسکی بلکہ ہمیشہ تنگ دست اور مقروض رہے۔

آپ بہت ملنسار انسان تھے اور وسیع دائرہ احباب رکھتے تھے۔ احباب سے ان کی باقاعدہ خط و کتابت تھی۔ مذہبی لحاظ سے آزاد طبیعت کے مالک تھے مگر مذہب کے بنیادی حقائق پر ایمان رکھتے تھے۔ آپ کے دائرۂ احباب میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ جن کی اپنی تنگدستی کے باوجود بوقتِ ضرورت مدد کرتے رہتے تھے۔ انتہا کے خوددار تھے۔ کبھی پالکی کے بغیر باہر نہ نکلتے۔ مزاجاً حق پسند، حق گو اور قطعاً غیر متعصب انسان تھے۔ تاہم شراب نوشی اور شطرنج کے کمزوری کی حد تک شوقین تھے۔ اسی شوق کے باعث قید کی مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اگرچہ آپ کو صرف تین ماہ بعد رہائی مل گئی لیکن آپ کی طبعِ احساس پر اس کا گہرا اثر پڑا اور زندگی بھر اس حادثہ کو اپنے نام پر بدنما دھبہ سمجھتے رہے۔ زندگی کا غالب حصّہ مصائب ہی میں کٹا۔ آخری عمر میں بیماری ان پر غالب آگئی اور وہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی کے مقام پر راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے۔ آپ کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں۔

(۱) دیوان۔ اردو (۲) کلیات فارسی (۳) اردوئے معلّٰی (۴) عودِ ہندی۔

نثرِ غالب یا خطوطِ غالب کے حوالے سے غالب کے اندازِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ سادگی و پرکاری

غالب کے خطوط اردو نثر کے اعتبار سے سادگی و پرکاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ جن میں کمال کی بے ساختگی ملتی ہے۔ اس سے قبل اردو نثر بشمول خطوط تصنع اور تکلفات کا شکار تھی۔ غالب نے مروجہ تصنع اور جملہ تکلفات کو خیر باد کہا اور سادہ نثر

نگاری یا مکتوب نگاری کا آغاز کیا۔ تاہم ان کے ہاں سادگی کے باوجود ایک ادبی شان ملتی ہے۔

۲۔ القاب و آداب کا خاتمہ

غالب سے پہلے خطوط میں لمبے چوڑے القابات و آداب رائج تھے۔ محض مزاج پرسی یا خیریت طلبی کے لئے بھی غیر ضروری تصنع سے کام لیا جاتا تھا اور کئی لمبے چوڑے جملے لکھ دیئے جاتے تھے جو یکسر غیر ضروری ہوا کرتے تھے۔ غالب نے القاب و آداب کے تکلفات کو خیرباد کہہ دیا اور کسی بھی نوع کے رسمی تکلفات سے یکسر بے نیاز ہو کر خطوط لکھنے کا آغاز کیا۔ چنانچہ ان کے تحریر کردہ خطوط چاہے وہ دوستوں کے نام ہیں، چاہے شاگردوں کے نام طویل اور رسمی القابات و آداب کے بغیر ہیں۔ اگر کہیں کوئی القاب استعمال بھی ہوا ہے تو نہایت مختصر اور بڑا بے تکلفانہ۔ مثلاً ارے بھائی، میری جان وغیرہ۔

۳۔ دعا سلام کے رسمی انداز کا خاتمہ

غالب نے دعا سلام کے مروج اور سراسر رسمی تکلفات کو ختم کیا اور اس کی بجائے سیدھا سادہ اندازِ تحریر اختیار کیا جس میں بے تکلفی کی مخصوص فضا موجود ہے۔

۴۔ مکالمہ کا انداز

غالب نے اپنے خطوط میں بات چیت کا انداز اختیار کیا جیسے مخاطب سامنے موجود ہو۔ چنانچہ ان کے خطوط میں ایسی ہی بات چیت ملتی ہے جیسے دو شخص آمنے سامنے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ خود بھی کہتے ہیں کہ میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ اس سے خطوط میں تکلفات کی بجائے دلچسپی کی فضا پیدا ہو گئی ہے اور پڑھنے والا اپنا بیت محسوس کرتا ہے۔ ان کے بعض خطوط میں اس انداز کے مکالمے بھی ملتے ہیں جیسے مکتوب الیہ غائب ہو۔ اُسے غائب فرض کر کے لکھتے ہیں تو خط کا انداز اور بھی دلچسپ اور لُطف کا حامل ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ان خطوں کا قاری مغالطے میں

پڑجاتا ہے کہ شاید ذکر کسی اور کا ہو رہا ہے حالانکہ باتیں تو مکتوب الیہ ہی کی ہوتی ہیں۔

۵۔ شوخیٔ تحریر

شوخیٔ تحریر خطوطِ غالب کا نمایاں وصف ہے۔ مولانا حالی کی رائے میں غالب نے شوخیٔ تحریر سے خطوط کو ناول اور ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ خط میں مخاطب کو چھیڑتے بھی ہیں اور بعض عام باتیں بھی دلچسپ اور ظریفانہ لہجے میں کرتے ہیں جس سے خط میں ایک خاص لُطف ہو جاتا ہے۔

۶۔ شخصیّت کی عکاسی

غالب کے خطوط، غالب کی شخصیّت کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ خطوطِ غالب کے مطالعہ سے غالب کی مصروفیات، ان کے مشاغل، ان کے نظریۂ حیات اور مذہبی عقائد کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ خط غالب کے وسیع مطالعہ اور ان کی علمیت اور قابلیت کے بھی مظہر ہیں۔

۷۔ حالات کی آئینہ داری

غالب کے اکثر خط ان کے شب و روز کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان میں ان کے شب و روز کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان میں حالاتِ زمانہ کا بھی ذکر ہے اور جُملہ مسائلِ زندگی کے حوالے بھی بعض خطوط میں تو خود ان کی اپنی اور دوسرے شعراء کی شاعری کا تذکرہ بھی ہے جس سے ان خطوط کی ادبی و تاریخی حیثیت بڑھ جاتی ہے۔

۸۔ شرحِ اشعار

غالب کے بعض خطوط میں اشعار کی شرح بھی ملتی ہے۔ غالب نے ان خطوں میں اپنے مشکل اور پیچیدہ اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔ یہ خط تفہیمِ غالب میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور پیچیدہ اشعار کے مطالب کی تہ تک پہنچنے میں آسانی فراہم

کرتے ہیں۔

۹۔ادبی مسائل کا حل

بہت سے خطوں میں غالب نے ادبی مسائل کے حل بھی پیش کئے ہیں۔ایسے خطوط عموماً ان کے شاگردوں کے نام ہیں جو ان سے بعض ادبی مسائل کے سلسلے میں رہنمائی طلب کرتے تھے اور الفاظ کی صحت، ان کے صحیح استعمال، محاورہ و روزمرہ تشبیہات، استعارات کے استعمال اور الفاظ کی تذکیر و تانیث وغیرہ کے بارے میں غالب کی رائے جاننا چاہتے تھے۔غالب نے شاگردوں کے نام لکھے ہوئے ان خطوط میں ان تمام امور کے بارے میں ماہرانہ رائے دی ہے جس سے یہ خط محض خط ہی نہیں، ادبی دستاویز بن گئے ہیں۔

۱۰۔جزئیات نگاری

غالب کے بہت سے خطوط میں حالات وواقعات یا مسائل کے حوالے سے گفتگو میں جزئیات نگاری ملتی ہے۔بات چیت تفصیل سے بیان کرتے ہیں، ایک ایک پہلو پر کھل کے باتیں کرتے ہیں، ایک ایک امر پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں جس سے حالات و واقعات کی واضح تصویر قاری کے ذہن میں اُبھر آتی ہے اور مسائل ضروریہ کے حل کے حوالے سے اس کا ذہن صاف ہو جاتا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ تفصیلات کے باوجود غالب کے خط بے مزہ نہیں ہوتے۔یوں یہ خطوط تاریخی حیثیت بھی اختیار کرتے ہیں اور اپنی ادبی حیثیت بھی برقرار رکھتے ہیں۔

۱۱۔تاریخی حیثیت

غالب کے بعض خطوط اپنے عہد کی مستند تاریخ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔دلی کے اُجڑنے، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کے انگریزوں کے مظالم بالخصوص اپنے مشاہدہ و مطالعہ کے علاوہ چشم دید حالات و واقعات کا جہاں ذکر آتا ہے، اس عہد کے حالات کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔اس طرح کے خطوط انہوں نے اپنے خاص دوستوں مثلاً ہرگوپال تفتہ ، میر مہدی مجروح اور بعض شاگردانِ خاص کو لکھے۔ان میں صرف

پڑ جاتا ہے کہ شاید ذکر کسی اور کا ہو رہا ہے حالانکہ باتیں تو مکتوب الیہ ہی کی ہوتی ہیں۔

۵۔ شوخیٔ تحریر

شوخیٔ تحریر خطوطِ غالب کا نمایاں وصف ہے۔ مولانا حالی کی رائے میں غالب نے شوخیٔ تحریر سے خطوط کو ناول اور ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ خط میں مخاطب کو چھیڑتے بھی ہیں اور بعض عام باتیں بھی دلچسپ اور ظریفانہ لہجے میں کرتے ہیں جس سے خط میں ایک خاص لُطف ہو جاتا ہے۔

۶۔ شخصیّت کی عکاسی

غالب کے خطوط، غالب کی شخصیت کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ خطوطِ غالب کے مطالعہ سے غالب کی مصروفیات، ان کے مشاغل، ان کے نظریۂ حیات اور مذہبی عقائد کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ خط غالب کے وسیع مطالعہ اور ان کی علمیت اور قابلیت کے بھی مظہر ہیں۔

۷۔ حالات کی آئینہ داری

غالب کے اکثر خط ان کے شب و روز کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان میں ان کے شب و روز کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ان میں حالاتِ زمانہ کا بھی ذکر ہے اور جُملہ مسائلِ زندگی کے حوالے بھی بعض خطوط میں تو خود ان کی اپنی اور دوسرے شعراء کی شاعری کا تذکرہ بھی ہے جس سے ان خطوط کی ادبی و تاریخی حیثیت بڑھ جاتی ہے۔

۸۔ شرح اشعار

غالب کے بعض خطوط میں اشعار کی شرح بھی ملتی ہے۔ غالب نے ان خطوں میں اپنے مشکل اور پیچیدہ اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔ یہ خط تفہیمِ غالب میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور پیچیدہ اشعار کے مطالب کی تہ تک پہنچنے میں آسانی فراہم

کرتے ہیں۔

۹۔ ادبی مسائل کا حل

بہت سے خطوں میں غالب نے ادبی مسائل کے حل بھی پیش کئے ہیں۔ ایسے خطوط عموماً ان کے شاگردوں کے نام ہیں جو ان سے بعض ادبی مسائل کے سلسلے میں رہنمائی طلب کرتے تھے اور الفاظ کی صحت، ان کے صحیح استعمال، محاورہ و روزمرہ تشبیہات، استعارات کے استعمال اور الفاظ کی تذکیر و تانیث وغیرہ کے بارے میں غالب کی رائے جاننا چاہتے تھے۔ غالب نے شاگردوں کے نام لکھے ہوئے ان خطوط میں ان تمام امور کے بارے میں ماہرانہ رائے دی ہے جس سے یہ خط محض خط ہی نہیں، ادبی دستاویز بن گئے ہیں۔

۱۰۔ جزئیات نگاری

غالب کے بہت سے خطوط میں حالات و واقعات یا مسائل کے حوالے سے گفتگو میں جزئیات نگاری ملتی ہے۔ بات چیت تفصیل سے بیان کرتے ہیں، ایک ایک پہلو پر کھل کے باتیں کرتے ہیں، ایک ایک امر پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں جس سے حالات و واقعات کی واضح تصویر قاری کے ذہن میں اُبھر آتی ہے اور مسائل ضروریہ کے حل کے حوالے سے اس کا ذہن صاف ہو جاتا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ تفصیلات کے باوجود غالب کے خط بے مزہ نہیں ہوتے۔ یوں یہ خطوط تاریخی حیثیت بھی اختیار کرتے ہیں اور اپنی ادبی حیثیت بھی برقرار رکھتے ہیں۔

۱۱۔ تاریخی حیثیت

غالب کے بعض خطوط اپنے عہد کی مستند تاریخ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ دلی کے اُجڑنے، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کے انگریزوں کے مظالم بالخصوص اپنے مشاہدہ و مطالعہ کے علاوہ چشم دید حالات و واقعات کا جہاں ذکر آتا ہے، اس عہد کے حالات کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس طرح کے خطوط انہوں نے اپنے خاص دوستوں مثلاً ہرگوپال تفتہ، میر مہدی مجروح اور بعض شاگردانِ خاص کو لکھے۔ ان میں صرف

تاریخ ہی رقم نہیں، غالب کی اپنے دُکھی دل کی دھڑکنیں بھی ہیں۔ وہ صرف حالات کا ذکر نہیں کرتا، ان حالات سے دل گرفتہ ہوکر خون کے آنسو روتا بھی ہے۔ گویا یہ شہر آشوب بھی ہیں اور غالب کی طبعِ حسّاس کے بعض نازک گوشوں کے عکاس بھی۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۲:۔ ہرکارہ، ڈاکیا، چپڑاسی، پیادہ؛ ہم عمر، ایک ہی عمر کے؛ پا در رکاب، چلنے کو تیار؛ ہم عصر، ایک ہی عہد کے؛ ربط، تعلق؛ وضع، انداز؛ معنی آفرین، معنی پیدا کرنے والا، پُر معنی؛ مکالمہ، زبانی، زبانی گفتگو؛ جنبش، حرکت؛ تمام ہوگیا، ختم ہوگیا؛ ہنوز، ابھی؛ خبط، سودا، جنون، دیوانگی؛ عافیت، خیریت؛ سخن سنجی، سخن دانی؛ مدّاح، تعریف کرنے والا؛

صفحہ نمبر ۳:۔ سررشتہ، محکمہ؛ از رُوئے احتیاط، احتیاط کے طور پر، احتیاطاً؛ بمقتضائے وہم، وہم کے تقاضے سے، وہم کی بنیاد پر؛ خاطر جمع، تسلی، اطمینان؛ دستاویز، تحریر؛ احیاناً، اتفاقاً، اتفاق سے، کبھی کبھی؛ مکتوب الیہ، جس کی طرف خط لکھا گیا ہو؛ دُونا، دُگنا؛ خواہی نہ خواہی، چاہو یا نہ چاہو، مجبوراً؛ سرنامہ، عنوان، خط کے لفافے پر مکتوب الیہ کا جو نام اور پتہ لکھا جاتا ہے؛ نگاشتہ، لکھا ہُوا؛ مرسلہ، بھیجا ہوُا، بھیجا گیا؛ چارشنبہ، بدھ وار؛

صفحہ نمبر ۴:۔ سلاطین، سلطان کی جمع؛ تواریخ، تاریخ کی جمع، مراد تاریخ ہی ہے؛ سخنوری، شاعری؛ شکوہ، شان؛ منافی، اُلٹ، برعکس؛ خلافِ طبع، طبیعت کے خلاف؛ ہنڈوی، روپے لینے کا کاغذ، قرض کا کاغذ، چیک (فی زمانہ)؛ ملفوف، لپٹی ہوئی، لفافے میں رکھی ہوئی؛ شتاب، جلدی؛ مضطرب، بے چین؛ موافق، مطابق؛ جواب طلب، جس کا جواب درکار ہو؛ ولادت، پیدائش؛ مطبع، پریس، چھاپہ خانہ؛

صفحہ نمبر ۵:۔ موقوف، منحصر؛ متعدد، کئی؛ ساہوکار، سود پر قرضہ دینے والا؛ سبیل، رستہ، ذریعہ؛ نوید، خوشخبری؛ دوشنبہ، سوموار؛ آہو، ہرن؛ شاخِ آہو، ہرن کے سینگ یعنی انوکھی بات؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱) سُنا ہو گا کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت غالب کے خط سے لی گئی ہے جو منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھا گیا تھا۔

سیاق و سباق:۔ اپنے شاگرد اور دوست کے نام لکھے گئے اس خط میں غالب مکتوب الیہ کے خط کے منتظر ہیں اور اس سے مخاطب ہونے کے متمنی ہیں۔

تشریح:۔ تم نے مومن کے انتقال کی خبر تو سُن ہی لی ہو گی۔ آج اسے وفات پائے دس روز گزر چکے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ ایک قافلہ ہے جو موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمارے بچے بھی مر رہے ہیں اور ہم عمر بھی، گویا عمر کا لحاظ کئے بغیر موت انہیں اپنی پناہ میں لے رہی ہے۔ ہم بھی اسی قافلے میں شامل ہیں اور چلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ مومن تو میرے عہد کا بھی تھا اور دوست بھی۔ ابھی ہم چودہ چودہ پندرہ پندرہ سال کے تھے کہ ہمارا تعلق شروع ہوا۔ دوستی کا یہ سلسلہ لگ بھگ بیالیس تینتالیس سال کا ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران ہمارے درمیان ایک بار بھی کوئی رنجش کی یا دل دکھانے والی بات نہیں ہوئی۔ ذرا سوچیے، وہ تو دوست تھا، چالیس چالیس سال کے تو دشمن بھی پیدا نہیں ہوتے، دوست کہاں سے لاؤں گا۔ اپنی وضع کا آدمی تھا اور بہت اچھا لکھنے والا شاعر تھا، اس کی طبیعت ہی معنی پیدا کرنے والی تھی، یعنی اس کا کلام پُر معنی ہُوا کرتا تھا۔

(۲) کیا کروں عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرے حالات سراسر میرے خلافِ طبیعت ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینہ بھر وہاں اور دو مہینے وہاں۔ صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا ہوا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ کاغذ تمام ہو گیا اور ہنوز باتیں بہت باقی ہیں۔ اس خط میں میں نے اپنے بچوں کو بھی دُعا نہیں لکھی، بھائی تم کہہ دینا۔ اپنے خط میں ان کی خیر و عافیت لکھنا۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس غالب کے خط بنام منشی نبی بخش حقیر سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:۔ اپنے شاگرد اور دوست کے نام خط میں وہ اپنے حالات کا تذکرہ اور مکتوب الیہ سے مخاطب ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

تشریح:۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ میری زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ زندگی بڑے عجیب انداز سے گزر رہی ہے اور میں ہوں کہ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ حالات ایسے ہیں کہ یکسر میری طبیعت کے خلاف ہیں۔ اس پریشانی کے عالم میں جی چاہتا ہے کہ چل پھر کر زندگی گزار دوں، کبھی مہینہ ایک جگہ گزار لوں، کبھی کسی دوسری جگہ — مگر — بے بس ہوں، بے بسی کا یہ عالم ہے کہ میں تو ہل بھی نہیں سکتا۔ بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر کیا کروں، کاغذ ختم ہو گیا ہے، مگر میری باتیں ختم نہیں ہوئیں —— بہت پریشان ہوں۔ پریشانی کی پیدا کردہ دیوانگی کا یہ حال ہے کہ بچوں کے لئے دعا بھی نہیں لکھ سکا، تم ہی انہیں دُعا کہہ دینا اور جب خط کا جواب لکھو تو ان کی خیریت سے مجھے آگاہ کر دینا۔

(۳) بھائی صاحب! جی چاہتا ہے باتیں کرنے کو۔ حق تعالیٰ عبدالسلام کی ماں کو شفا دے اور اُس کے بچوں پر رحم کرے ...... یہ ڈاک کا سر رشتہ کیا بگڑا۔ میں نے اپنے نزدیک از روئے احتیاط بیرنگ خط بھیجنا اختیار کیا تھا، گو مقتضائے وہم ہو۔ خط جب ڈاک گھر میں جاتا تھا، رسید ملتی تھی۔ پوسٹ پیڈ کی لال مہر، بیرنگ کی سیاہ مہر۔ خاطر جمع ہو جاتی تھی۔ ڈاک کتاب کو دیکھ کر یاد آ جاتا تھا کہ فلانا خط کس دن بھیجا ہے اور کس طرح بھیجا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس غالب کے خط بنام منشی نبی بخش حقیر سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:- اپنے شاگرد کے نام اس خط میں غالب ڈاک کے حوالے سے اپنی پریشانی کا حال بیان کر رہے ہیں۔

تشریح:- بھائی صاحب! تم سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔ خداوند کریم عبدالسلام کی ماں کو صحت عطا کرے اور اس کے بچوں پر رحم کرے۔ ڈاک کا محکمہ بُری طرح بگڑ چکا ہے۔ میں نے ڈاک کے نظام میں بگاڑ کے پیشِ نظر احتیاطاً بیرنگ خط بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ اگرچہ اسے بھی میرے وہم ہی پر مبنی سمجھنا چاہیئے یعنی یہ بھی میرا وہم ہی ہے کہ بیرنگ خط ضرور پہنچ جائے گا۔ پہلے تو یوں ہوتا تھا کہ ڈاک خانے سے خط کی رسید ملتی تھی۔ اگر ٹکٹ کے پیسے ادا کر دیئے ہوں تو پوسٹ پیڈ POST PAid کی سُرخ مہر لگتی تھی اور اگر بغیر ٹکٹ لگائے خط بھیجا ہو تو اس پر بیرنگ کی سیاہ مہر لگتی تھی۔ اس سے دل کو اطمینان حاصل ہو جاتا تھا۔ ڈاک کا رجسٹر دیکھ کر یہ بھی پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں خط کب اور کس طرح ارسال کیا تھا۔

(۴) اب ڈاک گھر میں ایک صندوق منہ کھلا ہُوا دھر دیا ہے جو جائے خط کو اس میں پھینکے اور چلا جائے۔ نہ رسید، نہ مہر، نہ مشاہدہ۔ خدا جانے وہ خط روانہ ہو گا یا نہ ہو گا۔ اگر روانہ بھی ہُوا تو وہاں پہنچنے پر ڈاک کے ہرکارے کو نہ انعام کا لالچ نہ سرکار کو محصول کی طمع۔ نہ دیا ہرکارے کو، یا دیا، ہرکارے نے نہ پہنچایا۔ اگر خط نہ پہنچا تو بھیجنے والا کس دستاویز سے دعویٰ کرے گا، مگر ہاں چار آنے دے کر رجسٹری کروائے۔

حوالۂ متن:- یہ اقتباس غالب کے خط بنام منشی بخش حقیر سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:- اس خط میں غالب ڈاک کے حوالے سے اپنی پریشانی کا حال بیان کرتے ہیں۔ وہ ڈاک کے نظام کی پہلی صورت کا جس سے وہ مطمئن تھے، موجودہ صورت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

تشریح:- اب ڈاک خانے کے نئے نظام کی صورت یہ ہے کہ ڈاکخانے میں ایک صندوق رکھ دیا گیا ہے جس کا منہ کھُلا ہوُا ہے۔ جسے خط ارسال کرنا ہو جائے اور اس صندوق میں ڈال کر چلا آئے۔ سو، نہ تو کوئی رسید ملتی ہے، نہ کوئی مہر لگتی ہے اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں کہ اس خط کا انجام کیا ہو گا، جائے گا بھی یا نہیں۔ اگر چلا بھی

گیا تو وہاں پہنچ جانے کے بعد نہ ڈاکیے کو انعام کا لالچ ہے اور نہ ہی حکومت کو ڈاک خرچ وصول کرنے کا کوئی لالچ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خط ڈاکیئے کو ملے ہی نہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے مل تو جائے مگر وہ پہنچائے ہی نہ۔ ان حالات میں اگر خط نہیں پہنچ پاتا تو کس تحریر کی بنیاد پر خط بھیجنے والا شکایت کر سکے گا — ہاں — ایک صورت اب بھی ہے کہ چار آنے ادا کر کے رجسٹری کرا دی جائے۔

(۵) ہم دوسرے تیسرے دن جا بجا خط بھیجنے والے، روپیہ آٹھ آنے رجسٹری کو کہاں سے لائیں۔ احیاناً ہم نے تین ماشے سمجھ کر آدھ آنے کا اسٹامپ لگا دیا۔ وہ خط دو رتی بڑھتی نکلا، مکتوب الیہ سے دونا محصول لیا گیا۔ خواہی نہ خواہی کانٹا باٹ رکھیے۔ کانٹے کا خارزار الگ، تولنے کا قصہ الگ۔ خط بھیجنا نہ ہوا، ایک جھگڑا ہوا، ایک مصیبت ہوئی۔ آج دسویں محرم کو یہ خط لکھا ہے، کل اسٹامپ کے ٹکڑے منگاؤں گا، سرنامہ پر لگا کر روانہ کروں گا۔ اندھیری کوٹھری کا تیر ہے، لگا لگا، نہ لگا، نہ لگا۔

حوالۂ متن: یہ اقتباس غالب کے خط سے لیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد اور دوست منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھا ہے۔

سیاق و سباق: وہ ڈاک کے نظام سے غیر مطمئن ہیں۔ وہ رجسٹری کے ذریعے خط بھیجنے کو خط کے پہنچنے کا یقینی ذریعہ تو سمجھتے ہیں مگر اس کی قباحتوں کے حوالے سے بھی پریشان ہیں۔

تشریح: ہم تو اکثر خط لکھتے ہی رہتے ہیں۔ دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں خط بھیجنا ہوتا ہے۔ ہر خط پر روپیہ آٹھ آنے رجسٹری کا خرچہ کہاں سے لائیں۔ اتفاق سے ہم نے خط کا وزن تین ماشے سمجھ کر دو پیسے کا ٹکٹ لگا دیا۔ خط کا وزن معمول سے زیادہ نکل آیا، اسی پر خط وصول کرنے والے سے دُگنا ڈاک خرچ وصول کر لیا۔ اب چاہو نہ چاہو ترازو اور باٹ اپنے پاس رکھو۔ ترازو رکھنے کی مصیبت بھی اٹھاؤ اور تولنے کی بھی۔ خط بھیجنا بھی عذاب بن گیا۔ آج محرم کی دس تاریخ ہے۔ میں نے خط لکھ لیا ہے، کل ڈاک کے ٹکٹ منگواؤں گا اور خط کے اوپر لگا کر بھیج دوں گا

پھر بھی خط کا پہنچنا یقینی نہیں، اندھیری کوٹھڑی میں چلایا ہوا تیر ہی سمجھو کہ پہنچ گیا تو پہنچ گیا، نہیں تو نہ سہی۔

(۶) اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان واقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس غالب کے خط بنام منشی شیونرائن آرام سے لیا گیا ہے۔ اپنے شاگرد کے نام لکھے گئے اس خط میں غالب اپنے خطوط کی اشاعت کی تجویز کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

تشریح:۔ میرے اُردو کے خط اگر آپ شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو میں اسے بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ شاید ہی کوئی خط ایسا ہو جو غور و فکر کے بعد اور جی لگا کر لکھا ہو، بس یونہی سرسری طریق سے لکھ دیا کرتا ہوں۔ ان سرسری سے خطوں کی اشاعت اور شہرت میری اس شان کے خلاف ہے جو میری شاعری کے حوالے سے قائم ہے۔ اس کے علاوہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ جیسے بھی معاملات ہیں وہ اب دوسروں کو بھی بتا دیئے جائیں۔ قصہ مختصر یہ خط اگر شائع کئے جائیں تو یکسر میری طبیعت کے خلاف کام ہوگا۔

(۷) خط کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ میرزا تفتہ کا خط جو آپ نے نقل کر کے بھیج دیا ہے، میں نے منشی شیونرائن کو بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو "رقعات عالمگیری"، یا "انشاء خلیفہ"، اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اس میں پسند آیا کرے، اپنے خط میں لکھ دیا کرو، خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمہارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس غالب کے خط بنام حاتم علی مہر سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس خط میں غالب مرزا حاتم علی بیگ مہر کے اندازِ تحریر کے

حوالے سے طنز کر رہے ہیں۔

تشریح :۔ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تم نے میری طرف توجہ تو کی لیکن آپ نے یہ خط کیا لکھا ہے۔ یہ تو مرزا تفتہ کے خط ہی کی نقل ہے۔ یہ خط پڑھنے کے بعد میں نے منشی شیو نرائن کو ارسال کیا ہوا اصل خط بھی دیکھ لیا ہے۔ اگر تمہیں پسند آئے تو ایک تجویز میری بھی سُن لیں، شاید تمہیں مناسب ہی لگے۔ خط لکھنے لگو تو "رقعاتِ عالمگیری" یا "انشائے خلیفہ" اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ ان میں سے جو عبارت اچھی لگے، اپنے خط میں نقل دیا کرو۔ یُوں مفت میں تمہارا خط بھی مکمل ہو جایا کرے گا اور تمہارا خط پہنچ پانے کا نام بھی ہو جایا کرے گا (یعنی اگر نقل ہی کرنی ہے تو مرزا تفتہ ہی کی کیوں، خطوط کے اعلیٰ پائے کے مجموعے مثلاً "رقعاتِ عالمگیری" بھی تو موجود ہیں، ان سے نقل کر لیا کرو)

تنقیدی نوٹ

خطوطِ غالب کو جدید اُردو نثر کا نقطۂ آغاز کہنا غلط نہ ہوگا۔ غالب کے ان خطوط سے پہلے ہمیں اُردو نثر کا کوئی ایسا نمونہ نہیں ملتا جو زندگی کے ٹھوس حقائق کو بیان کرنے کا حق ادا کرتا ہو۔ خطوطِ غالب سے پہلے ہمیں جو نثری نمونے ملتے ہیں وہ عام طور سے پُر تکلیف عبارت آرائی کے نمونے ہیں۔ نثر کو سادگی کی منزل کی طرف لانے کی کوشش فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی طرف سے بھی ہوئی تھی اور اس میں شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج ہی کی کوششوں سے اُردو نثر کو ایک ایسا انداز اور اسلوب حاصل ہوا تھا جو عملی زندگی میں کام آ سکتا تھا لیکن فورٹ ولیم کالج کی سرگرمیاں جلد ختم ہو گئیں۔ انگریزی حکومت سے لوگوں کے دل اُچاٹ ہو گئے تو حکومت کی ہر کوشش کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور اس کے زیرِ اثر پروان چڑھا ہوا ادب بھی تغافل کا شکار ہونے لگا۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کا نثری سرمایہ زیادہ تر قصص و حکایات یا اخلاق و تصوّف پر مشتمل تھا۔ اس لئے روزمرہ کی زندگی سے اس کا زیادہ رشتہ بھی نہ تھا۔ پھر سرور کے "فسانۂ عجائب" کی زبان اور دبستان لکھنؤ کی سرگرمیاں نثر کو اور بھی دُور لئے جا رہی تھیں اور سادگی کی بجائے تکلفات کی رنگینیوں میں کھو جانے کے رجحان کو

وی کر رہی تھیں۔

میرامن کی "باغ و بہار" اور اُردو ادب میں غالب کی خطوط نویسی کے درمیان تقریباً پینتالیس (۴۵) سال کا وقفہ ہے۔ اس سارے عرصہ میں ہمیں اُردو نثر کی کوئی ایسی قابلِ ذکر تحریر نہیں ملتی جسے سادہ اور کارآمد نثر کا عمدہ نمونہ قرار دیا جا سکے۔ غالب بھی تقریباً ۱۸۴۷ء سے پہلے فارسی ہی میں خط لکھتے رہے۔ اور ان خطوں میں زبان کے تکلف کا پورا پورا اہتمام کرتے رہے۔ انہوں نے آخری عمر میں اُردو میں خط لکھنا شروع کئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قلعہ معلّٰی کی فرمائش پر مہر نیمروز لکھتے ہوئے غالب کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ فارسی میں پر تکلف خط لکھ سکیں لیکن یہ بات قابلِ توجہ نہیں۔ دراصل غالب ہمیشہ حالات کو غور سے دیکھتے رہے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں ہی اصناف میں مشکل پسندی سے سہل پسندی کی طرف آئے ہیں۔ جس طرح وہ شاعری میں بیدل کی پیروی کے بھنوّر سے نکلے، اسی طرح اُردو خطوط میں بھی شعوری طور پر وہ فارسی کے رسمی تکلفات کو ترک کر کے اُردو کی دل نشیں سادگی کی طرف بڑھے۔

اُردو نثر کا عمدہ نمونہ ہونے کے علاوہ غالب کے خطوط کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ہمیں ان خطوط میں غالب کے زمانہ کے بہت سے حالات اپنی پوری سچائی کے ساتھ ملتے ہیں۔ غالب نے یہ خطوط بہت سے لوگوں کو لکھے ہیں۔ ان میں ان کے عزیز، شاگرد، دوست، محسن اور دوسرے کاروباری لوگ بھی شامل ہیں۔ ان سب سے معاملات کرنے میں ہمیں غالب کی شخصیت کے مختلف گوشے بے نقاب ملتے ہیں اور ہم ان خطوط کے ذریعے اُردو شاعری کے بطلِ عظیم کے حالاتِ زندگی، اس کے مشاغل، اس کی علمی استعداد، شعر و شاعری کے حوالے سے اس کے خیالات اور تبصروں سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں خطوطِ غالب نے خط نویسی کے انداز کو کہاں تک متاثر کیا اور آئندہ اُردو نثر کے لئے کس طرح راہ ہموار کی یہ بات بھی ہمیں خطوطِ غالب کے مطالعہ ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

الطاف حسین حالی

مکتوب

سوانحی خاکہ

خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت (کرنال) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے جا ملتا ہے۔ جبکہ والدہ کا تعلق سادات خاندان سے تھا۔ آپ کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ آپ کے آباو اجداد بلبن کے عہد میں ہرات سے پانی پت میں مقیم ہوئے تھے۔ پانی پت اور نواحی علاقے خدمتِ قضا کے معاوضے کے طور پر جاگیر میں عطا ہوئے۔ آپ کے والد متقی، پرہیز گار اور صوفی منش بزرگ تھے۔ گھر کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اس لئے انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت چھوٹی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور ابھی نو برس ہی کے ہوئے تھے کہ والد بھی دنیا سے اُٹھ گئے اور یوں آپ بالکل بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ آپ کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے آپ کی پرورش کی۔ پہلے آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر فارسی کی طرف توجہ دی۔ عربی پڑھنے کا بہت شوق تھا مگر پورا نہ ہو سکا۔ ۱۷ برس کی عمر میں رشتہ داروں کے مجبور کرنے پر اپنی مرضی کے خلاف شادی کرنا پڑی جو حالی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ آپ دہلی چلے آئے دو برس تک یہاں رہ کر عربی کا مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۸۵۶ء میں ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں معمولی تنخواہ پر ملازم ہوئے لیکن اگلے ہی برس ملازمت چھوڑنا پڑی کہ حالات سازگار نہ رہے تھے پھر پانی پت چلے گئے اور فقہ اور حدیث کا مطالعہ کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد نواب شیفتہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے اور جہانگیر آباد چلے گئے۔ شیفتہ کی صحبت رنگ لائی اور حالی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پنپنے کا موقعہ مل گیا۔ آٹھ برس تک انہی کے ہاں رہے اور ان کی صحبت سے خوب استفادہ کیا۔ پھر دہلی آ کر غالب کی شاگردی اختیار کر لی۔ غالب کی وفات کے بعد لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ

بگڈپو میں ملازم ہو گئے۔ لاہور میں کرنل ہالرائیڈ کو شعر وسخن کا بہت شوق تھا۔ حالی نے مولانا آزاد کے ساتھ مل کر مشاعروں کی ابتداء کی۔ یہ مشاعرے نئی طرز کے ہوتے تھے اور شعراء کو مشقِ سخن کے لئے مصرعۂ طرح کی بجائے "موضوع" دیا جاتا تھا۔ یہاں حالی نے آزاد کے ساتھ مل کر جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ آپ چار سال بعد واپس دہلی چلے گئے اور عربک سکول میں مدرس ہو گئے۔ انہی دنوں سرسید سے آپ کی ملاقات ہوئی جن کی وساطت سے نظام دکن کی طرف سے ۷۵ روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ملازمت سے فارغ ہوئے تو پانی پت کے ہی ہو کر رہ گئے۔ یہیں ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

آپ کی اہم کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) دیوانِ حالی (۲) مدو جذرِ اسلام یا مسدسِ حالی (۳) مقدمۂ شعر و شاعری۔
(۴) یادگارِ غالب (۵) حیاتِ جاوید (۶) حیاتِ سعدی۔

حالی کے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات

حالی سرسید سے ایک سچے عقیدت مند کی طرح متاثر تھے۔ اسی لئے ان کے ہاں بھی وہی سادگی، وہی بے ساختگی اور وہی مدعا نگاری ملتی ہے جو سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریروں کا خاصا ہے۔ لیکن حالی کی تحریروں میں سچائی اور خلوص کی رو دوسرے رفقائے سرسید کی تحریروں کے مقابلے میں زیادہ ہی نمایاں ہے جس کا سبب یہ ہے کہ وہ خود بھی زیادہ سچے اور مخلص انسان تھے۔ اسی خصوصی وصف کے باعث وہ دوسرے رفقاء کے مقابلے میں زیادہ ممتاز بھی ہیں اور ان کی شعری، تنقیدی اور سوانحی حوالے سے ان کی خدمات اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ ان کے اسلوبِ تحریر کے نمایاں وصف ان کی دیگر تحریروں کے علاوہ ان کے مکاتیب میں بھی ملتے ہیں۔ ذیل میں حالی کے اسلوبِ تحریر کی نمایاں خصوصیات دی جاتی ہیں۔

۱۔ سادگی

سادگی حالی کی تحریر کا امتیازی وصف ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں۔ "حالی کے طرزِ تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے۔ بعض لوگ اسے سپاٹ کہتے ہیں لیکن یہ خیال درست نہیں۔

جو لوگ پُر تکلف عبارت آرائی کو سٹائیل سمجھتے ہیں ان کو حالی کا طرزِ تحریر ضرور روکھا پھیکا نظر آتا ہے۔ ورنہ اسے سرسید کے اسلوب کا ہی ایک رنگ سمجھنا چاہیئے!!

۲۔ عام فہم تحریر حالی کی تحریر میں تصنع بالکل نہیں ہوتا بلکہ عام فہم ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جہاں جہاں انہوں نے سنجیدہ مسائل اور دقیق فلسفیانہ رموز بیان کیئے ہیں وہاں بھی ان کی تحریر عام فہم ہی رہتی ہے۔

۳۔ الفاظ کا انتخاب حالی کی تحریر میں طویل اور گنجلک جملوں کی بجائے چھوٹے چھوٹے مگر بامعنی جملے ہوتے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ انہیں الفاظ کے انتخاب اور ان کے برمحل استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے۔

۴۔ انگریزی الفاظ کا استعمال حالی کی تحریر میں انگریزی الفاظ کا استعمال بُری طرح کھٹکتا ہے، بالخصوص ایسے مقامات پر جہاں نہائیت موزوں اُردو مترادفات کے ہوتے ہوئے وہ انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انگریزی الفاظ ان کی نثر کے جملوں میں اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ تحریر کی روانی متاثر نہیں ہوتی۔ بہر حال انگریزی کے الفاظ کا بلاوجہ استعمال خوبی نہیں کہلا سکتا۔

۵۔ بے ساختگی سرسید ہی کی طرح، جن سے حالی متاثر تھے، حالی کی نثر [illegible] وصف بھی اس کی بے ساختگی ہے۔ ان کی نثر میں کہیں بھی تکلفات اور آرائشِ عبارت کی ارادی کوشش نظر نہیں آتی۔ وہ تو اپنے خیالات کو بے ساختگی کے ساتھ نہائیت فطری انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

۶۔ مدعا نگاری حالی کے لکھنے کا طریق یہ ہے کہ جیسے ان کے دل سے بات نکلتی ہے، وہ ویسے ہی اسے بیان کر دیتے ہیں جس سے ان کی تحریر میں شبلی جیسا رعب داب، سرسید جیسا خطیبانہ لہجہ اور آزاد کی سی شاعرانہ نثر کے نمونے تو نہیں ملتے مگر اثر آفرینی کی پوری کیفیت موجود ہوتی ہے۔

۷۔ خلوص حالی نہائیت مخلص اور سچے انسان تھے۔ ان کی شخصیت کی سچائی اور خلوص کی لہر ان کی تحریروں میں بھی موجزن ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں جذبے کی سچائی اور خلوص کی فراوانی صاف نظر آتی ہے۔ وہ کہیں بھی، کوئی بات اُلجھا کر

بیان نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی ایسی بات کرتے ہیں جس کے وہ دل سے قائل نہ ہوں۔ انہوں نے وہی کچھ لکھا ہے جو واقعی ان کے دل کی آواز ہے۔

۸۔ دردمندی کی کیفیت حالی مزاجاً شفیق و ہمدرد انسان تھے اور ایک دردمند دل کے مالک تھے۔ ان کے مزاج کی دردمندی اور ہمدردی ان کی عام تحریروں میں بھی ملتی ہے مگر ان کے خطوط میں ہمدردی، دردمندی اور محبت کی لہر خاص طور سے نمایاں ہے۔

۹۔ مقصدیت سرسیّد کے دوسرے رفقاء کی طرح حالی بھی ادب میں مقصدیت کے داعی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنی تحریروں میں مقصدیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور ہمیشہ اخلاقی اور اصلاحی عناصر کا خیال رکھا۔ چنانچہ ان کی شاعری تو قریب قریب ساری ہی اخلاقی اور قومی نوعیت کی ہے۔ ان کی نثر میں بھی یہ مقاصد کارفرما نظر آتے ہیں۔

۱۰۔ دھیماپن حالی طبعاً درویش منش، خاموش طبع، متین اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ ان کے ہاں ایک ٹھہراؤ، اعتدال اور رکھ رکھاؤ کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ خود جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں بھی جذبات سے مغلوبیت نظر نہیں آتی۔ بس ایک دھیما اور متین سا لہجہ ہے جس میں ان کی متین طبیعت، قلب کی وسعت، ٹھہراؤ، سکون اور اعتدال ہے۔

۱۱۔ استدلالیت اپنے معاصرین کی طرح حالی کے ہاں بھی استدلال کا رنگ موجود ہے جس سے تاثر آفرینی بھی بڑھتی ہے اور قاری کے لئے مصنّف کے پیش کردہ نظریات کو سمجھنا اور ذہن نشین کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ جب مصنف اپنا نقطہ نظر استدلال کے ساتھ بیان کرتا ہے تو قاری عقلیت کی بنا پر اسے تسلیم کرنے میں تامّل محسوس نہیں کرتا۔

۱۲۔ جدّت موضوع و مضمون کی جدّت اور تمثیلات کی برجستگی بھی ملتی ہے۔ یہ جدّت ان کی دوسری خوبیوں کے ساتھ مل کر ایک دل کش امتزاج پیدا کرتی ہے ______ اس سے حالی کی نثر کو

اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے۔ حامد حسن قادری اسی پہلو کے بارے میں کہتے ہیں "مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدّت، بیان کی صداقت، زبان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے —— اور —— بعض جگہ نادر بھی ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۶:۔ تلمیذ: شاگرد ؛ انکسار۔ عاجزی ؛ رفیق۔ ساتھی ؛ بصیرت۔ دل کی بینائی، عقل مندی، دانائی ؛ استقلال۔ مستقل مزاجی ؛ انجام دینا۔ کرنا، ختم کرنا، اختتام تک پہنچانا ؛ امر۔ بات ؛ بہ زور۔ زور سے، پوری طرح ؛ منہمک محو، مصروف ؛

صفحہ نمبر ۷:۔ مصطلحاتِ علمی، علمی اصطلاحات ؛ مٹیریل۔ مواد ؛ بہم پہنچانا۔ مہیا کرنا، اکٹھا کرنا ؛ عہدہ برآ ہونا۔ ذمہ داری پوری کرنا ؛ نارسا۔ جس کی پہنچ نہ ہو، کمزور ؛ ریویو۔ تبصرہ ؛ اصرار۔ ضد ؛ اختصار۔ مختصر ہونا ؛ مخدوش۔ خراب ؛ اشباع: حرکات کو کھینچ کر پڑھنا جس سے حروف کی آواز لمبی ہو جائے یعنی زبر سے الف، زیر سے ی اور پیش سے واؤ کی آواز پیدا ہو جائے ؛ اختصار کے برعکس اسے، طویل ہونا کہیں گے۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

عنایت نامہ پہنچا۔ "الناظر" وغیرہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ نے خدا کے فضل سے "شعبۂ ترقی اُردو" کے متعلق کام شروع کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ نہائت استقلال کے ساتھ اس کام کو انجام دیں گے۔ اس کام کی خاص قابلیت اور اس کے ساتھ پوری دلچسپی، یہ دو امر ایسے ہیں کہ آپ کو بہ زور اس مشغلے میں منہمک رکھیں گے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس حالی کے خط بنام مولوی عبدالحق سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق :- حالی مولوی عبدالحق کے خط کے جواب میں علمی اصطلاحات مرتب کرنے کے کام کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

تشریح :- آپ کا خط موصول ہوا۔ "الناظر" کے مطالعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے اللہ کی مہربانی سے "شعبۂ ترقی اُردو" کے بارے میں کام شروع کر دیا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ مستقل مزاجی سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ دو باتیں ایسی ہیں جو آپ کو اس کام میں پوری طرح مصروف رکھنے کا باعث بنیں گی۔ ان میں سے ایک تو آپ کو اس کام سے پوری دلچسپی ہے، دوسرے آپ کے اندر اس کام کے کرنے کے لئے خاص قابلیت بھی موجود ہے۔

(۲)

ظاہرا آپ نے "مصطلحات علمی" کی ڈکشنری لکھنی شروع کی ہے۔ بے شک یہ نہائیت ضروری کام ہے مگر معلوم نہیں کہ اس کے لئے میٹریل کہاں سے بہم پہنچایا گیا ہے؟..... بہرحال جہاں تک ہو سکے اصطلاحات علمیہ کی ڈکشنری ضرور مرتب کیجیئے اور اس کے بعد معمولی اُردو زبان کی ڈکشنری کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اگر آپ کی کوشش سے یہ دونوں لغات تیار ہو جائیں تو آپ قوم کی ایسی خدمت سے عہدہ برآ ہوں گے جو قومی ترقی کی جڑ ہے۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ میں بھی اپنے کمزور و نارسا ہاتھوں سے اس خدمت میں آپ کے شریک ہوتا، مگر افسوس ہے کہ میں اپنے میں اب کسی قسم کی قابلیت نہیں پاتا.....

حوالۂ متن :- یہ اقتباس حالی کے خط سے لیا گیا ہے جو انہوں نے مولوی عبدالحق کے خط کے جواب میں انہیں لکھا۔

سیاق و سباق :- حالی مولوی عبدالحق کی علمی اصطلاحات مرتب کرنے کے کام کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں عام لغت مرتب کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔

تشریح :- ظاہر ہے کہ آپ نے علمی اصطلاحات کی لغت لکھنی شروع کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام بہت اہم ہے، مگر معلوم نہیں آپ کو اس کے لئے ضروری مواد کہاں سے اور کیسے میسر آئے گا۔ بہرحال آپ علمی اصطلاحات کی لغت ضرور مرتب کریں لیکن اس کے بعد عام اردو زبان کی لغت مرتب کرنے کی طرف بھی توجہ دیجئے۔ اگر آپ کی ذاتی توجہ سے یہ دونوں ہی ڈکشنریاں مکمل ہو جائیں تو آپ ایسی قومی خدمت انجام دے لیں گے جو قومی ترقی میں بنیادی حیثیت کی حامل ہو گی۔ خود میرا دل بے قابو ہوا جاتا ہے، چاہتا ہے کہ میں بھی اس خدمت میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں مگر کمزوری و نارسائی کے سبب میں اپنے میں ایسی قابلیت نہیں پاتا کہ آپ کے ساتھ کام کر سکوں۔

(۳)

"حیات النذیر" پر میں نے آپ کا ریویو "الناظر" میں پڑھا۔۔۔۔ افتخار عالم کے اصرار سے میں نے بھی اس پر مختصر ریویو لکھا تھا۔۔۔۔ اب آپ کے ریویو کے بعد اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں ہے۔ مضمون کے لحاظ سے میرے اور آپ کے ریویو میں اختصار و اشباع یا ناقص و کامل کے سوا کچھ فرق نہیں ہے۔

حوالۂ متن:- یہ اقتباس حالی کے خط بنام مولوی عبدالحق سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:- اس خط میں حالی مولوی عبدالحق کی علمی اصطلاحات مرتب کرنے کے کام کے حوالے سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ایک عام لغت مرتب کرنے کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں۔ آخر میں ایک تبصرہ زیر بحث ہے۔

تشریح:- میں نے "حیات النذیر" میں آپ کا تبصرہ پڑھا ہے۔ افتخار عالم بضد تھے کہ میں بھی تبصرہ لکھوں۔ سو اس کے اصرار پر میں نے بھی اس کتاب پر ایک مختصر تبصرہ لکھا ہے۔ آپ کا تبصرہ پڑھنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا تبصرہ شائع ہونا ضروری نہیں رہا۔ مضمون کے لحاظ سے میرے اور آپ کے تبصرے میں بس یہی فرق ہے کہ میرا تبصرہ مختصر ہے جبکہ آپ کا تبصرہ طویل و جامع ہے۔ علاوہ ازیں اتنا سا فرق ہے کہ آپ کا تبصرہ ہر اعتبار سے مکمل ہے جبکہ میرا تبصرہ ناقص ہے۔

حالی کی ادبی خدمات

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو کو ایسے شاعر اور ادیب نصیب ہوئے جن کی مساعی سے اُردو زبان کو وہ مقام مل گیا جہاں وہ دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کی برابری کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ سر سید اور ان کے رفقاء کی نثری تحریریں اُردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ اُن کے رفقاء میں حالی بطورِ خاص اہم ہیں۔

حالی نے "مسدس حالی" پیش کر کے جہاں سوئی ہوئی قوم کو جگانے کے لئے پُر تاثیر شاعری کا نمونہ فراہم کیا اور قومی اصلاح کے لئے ایسا شعری راستہ کھول دیا جس سے بالآخر اقبال جیسے شعراء پیدا ہوئے، وہاں تنقید کے لئے بھی راہیں وا کر دیں۔ مقدمہ شعر و شاعری آج بھی اُردو تنقید میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اُردو تنقید کا کوئی بھی تذکرہ اس کے حوالے کے بغیر ترتیب پا ہی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے مکمل کہہ سکیں ——

لیکن شاعری اور اُردو تنقید کے میدان میں واضح خدمات کے باوجود حالی نے سوانح نگاری کے میدان میں جو کام کیا وہ بہت ہی اہم ہے —— "حیات جاوید"، "یادگارِ غالب" اور "حیات سعدی"، حالی کی سوانح نگاری کے شاہکار ہیں —— ان کے علاوہ سوانح عمری حکیم ناصر خسرو، سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن بھی براہِ راست اور "تاریخ محمدی" پر منصفانہ رائے بالواسطہ سوانح نگاری کے نمونے ہیں۔

حالی کی سوانح نگاری میں ان کی وسیع معلومات، تحقیق کی کاوش اور واقعات کی صحت کے علاوہ حالی کا اصلاحی جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ مولانا حالی کے نزدیک سوانح عمریاں بزرگوں کی لازوال یادگار ہیں۔ ان میں عبرت کا سامان بھی ہے اور ہمت کا سبق بھی۔ وہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ مولانا حالی نے جن بزرگوں کی سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں ان کا یہ نظریہ بروئے کار رہا ہے۔ مولانا حالی کی سوانح عمریاں محققانہ ہیں۔ لیکن حالی کی ذاتی شرافت اور بزرگوں کے احترام کے نظریہ نے ان تحقیقات میں ایک خاص جذباتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں کے نزدیک "مدلل مداحی" بن گئی ہیں لیکن یہ بات کُلّی طور پر درست نہیں۔ حالی نے اپنی سوانح عمریوں میں صاحبِ سوانح کے ان تمام پہلوؤں سے بحث کی ہے جو سوانح کے

دائرے میں آتے ہیں اور ان پہلوؤں میں بعض ایسے انسانی پہلو بھی ہیں جن کا عام طور سے ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

حالی نے اردو میں سوانح عمریاں لکھ کر سوانح نگاری کے میدان کو ہموار کر دیا۔ اور آئندہ جو سوانح عمریاں ترتیب دی جائیں گی ان میں حالی ہمارے پیش رو اور ہمارے لئے نمونہ ثابت ہوں گے۔

حالی کی ان سوانح عمریوں میں شعر و ادب پر جو بحثیں ہوئی ہیں وہ بھی ادب کے شائقین کے لئے مفید ہیں۔ خصوصاً حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب میں سعدی اور غالب کی شاعری اور ان کے نظریاتِ شاعری ہماری معلومات ایک مفید اور مستقل اضافہ کرتے ہیں ——— اور بقول آل احمد سرور "آج جس سکہ پہ حالی کی مہر نہیں وہ ٹکسال باہر کا سمجھا جاتا ہے"

مولوی عبدالحق

(مکاتیب)

سوانحی خاکہ

مولوی عبدالحق ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ علی حسین تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم فیروز پور (پنجاب) میں حاصل کی۔ ۱۸ سال کی عمر میں علی گڑھ چلے گئے اور ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد دکن میں گزارا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہوا تو آپ یونیورسٹی میں اردو کے پہلے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور زندگی بھر اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے۔ انہی خدمات کے پیش نظر آپ کو بابائے قوم کا لقب ملا۔ انجمن ترقی اردو نے آپ کی زیر نگرانی کئی مفید اور قابل قدر کتابیں شائع کیں جن میں سے اکثر پر آپ نے فاضلانہ مقدمے اور دیباچے لکھے۔ یہ مقدمے اور دیباچے بذات خود اردو ادب میں خوشگوار اضافے ہیں۔ آپ نے کئی نایاب کتابیں تلاش کر کے ان پر مبسوط مقدمے لکھ کر انہیں شائقین ادب سے متعارف کرایا۔ ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی اور ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں دیں ۱۹۴۷ء کے بعد آپ کراچی چلے آئے۔ کراچی کا اردو کالج آپ ہی کی مساعی کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ آپ نے ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

آپ کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :۔

(۱) قواعد اردو	(۲) اردو صرف و نحو
(۳) چند ہمعصر	(۴) مقدمات عبدالحق
(۵) تنقیدات عبدالحق	(۶) مکتوبات عبدالحق
(۷) خطبات عبدالحق	(۸) نصرتی

۹- اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصّہ
۱۰- مرحوم دہلی کالج ۱۱- افکارِ حالی
۱۲- سرسید احمد خاں ۱۳- قدیم اُردو

مولوی عبدالحق کے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات

۱- دبستانِ سرسید کی نمائندگی

مولوی عبدالحق اُردو نثر میں اہم مقام کے مالک ہیں۔ اندازِ تحریر کے اعتبار سے وہ نثر کی اس روایت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا۔ چنانچہ ان کے ہاں بھی لفاظی اور عبارت آرائی کی بجائے سلاست، سادگی اور روانی ملتی ہے۔ جس میں بے تکلفی کا احساس ہوتا ہے۔ عبدالحق سرسید سے بالواسطہ متاثر ہیں۔ اس لئے کہ وہ حالی سے متاثر اور ان کے مقلد ہیں جبکہ حالی براہِ راست سرسید سے متاثر اور ان کے مقلد تھے۔ چنانچہ جو خصوصیات حالی کے اندازِ تحریر کی ہیں، وہی مولوی عبدالحق کے اندازِ تحریر کی ہیں۔

۲- مفہوم کی ترسیل پر زور

مولوی عبدالحق کی نثر میں ـــــ حالی ہی کی طرح ـــــ محاورات و استعارات کے استعمال کی بجائے سیدھے سادے الفاظ میں مفہوم کی ترسیل پر زور نمایاں ہے۔ گویا ان کے پیشِ نظر عبارت آرائی کی بجائے یہ مقصد ہے کہ وہ جو کچھ بیان کریں قاری کے ذہن نشین ہوتا جائے اور یہی تحریر کا اصل مقصد ہونا چاہیئے۔

۳- سادگی و سلاست

حالی ہی کی طرح مولوی عبدالحق کی نثر کی خاص خوبی بھی سادگی و سلاست ہے جس میں سنجیدگی اور متانت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ گویا ان کی تحریریں سادہ بھی ہیں اور سنجیدہ بھی۔

۴- مشکل الفاظ سے گریز

عبدالحق کی نثر میں مشکل الفاظ بالخصوص عربی و فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ اور غیر معروف اور نامانوس تشبیہات و استعارات استعمال میں نہیں لاتے۔ جس سے تحریر میں گفتگو یا بول چال کی سی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو اثر آفرین ہوتی ہے۔

۵۔ قواعدِ زبان کا لحاظ

سرسید مفہوم بیان کرنے پر زور دیتے تھے، قواعدِ زبان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ مگر سرسید سے بالواسطہ طور پر متاثر ہونے کے باوجود اور مفہوم بیان کرنے کے پہلو کو اہم جاننے کے باوجود عبدالحق نے قواعدِ زبان کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ انہوں نے قواعد کی صحت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس کے مسلمہ اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ انہوں نے اُردو قواعد بھی مرتب کی جو قواعد کے موضوع پر اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔

۶۔ شگفتگی

تحریر میں یکسر سادگی و سنجیدگی ہو تو اس امر کا امکان بھی ہوتا ہے کہ تحریر زیادہ خشک اور غیر دلچسپ ہی نہ ہو جائے۔ عبدالحق کے ہاں یہ صورت نہیں ہے۔ ان کی تحریر میں سادگی کے باوجود شگفتگی کی فضا بھی ملتی ہے۔

۷۔ جزئیات نگاری

حالی ہی کی طرح عبدالحق کے ہاں بات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا رجحان ملتا ہے وہ ہر بات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس کی تمام تر جزئیات بیان کرتے ہیں۔ اس سے وہ اپنی بات قاری تک کما حقہٗ پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر کی یہ خوبی بھی حالی ہی کی تقلید کے باعث پیدا ہوئی۔

۸۔ استدلال

جس طرح حالی اپنے زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے بات کرتے ہوئے استدلال سے کام لیتے ہیں اسی طرح عبدالحق بھی استدلالیت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ استدلال کو زیادہ بروئے کار لانے والوں کے ہاں قطعیت آ جاتی ہے اور اس سے عبدالحق بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔

۹۔ مزاح

عبدالحق کی تحریر میں مزاح بھی ملتا ہے مگر یہ مزاح اس اعتبار سے منفرد ہے کہ ان کے مزاح کی بنیاد مبالغہ آرائی پر نہیں ہوتی۔ مزاح کے دوران بھی وہ صداقت اور صحت کے عناصر پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اُترنے پاتے۔

۱۰۔ تنوع

مولوی عبدالحق کی تحریر کی خاص خوبی ان کا تنوع بھی ہے۔ انہوں نے جن جن موضوعات پر لکھا ان میں صرف کثرت ہی نہیں تنوع بھی ہے، وہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف بھی ہیں مگر ہر موضوع پر لکھتے ہوئے انہوں نے اس کے

تقاضے پورے کئے ہیں۔ اور موقعہ و محل کی مناسبت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے، تنقید، تحقیق، تبصرہ نگاری، مذہب، ادب، سیاست، اقتصادیات، تاریخ، سائنس، خطبات وغیرہ پر قلم اٹھاتے ہوئے انہوں نے موضوع کی مناسبت سے مناسب ترین اسلوب اپنایا ہے جس سے موضوعات کے حوالے سے تحریر دلچسپ بھی ہو جاتی ہے اور جامع بھی۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۹:۔ توقع ۔ اُمید؛ عبث ۔ بے فائدہ ۔ بے کار ۔ فضول؛ روداد ۔ رپورٹ، احوال، سرگزشت؛ مصاحب، ساتھی، پاس بیٹھنے اُٹھنے والا؛ اعتبار، لحاظ؛ پامال ہو جانا، مٹ جانا؛ ایک ہی لکڑی سے ہانکنا، ایک ہی جیسا سلوک کرنا، اچھے بُرے کی تمیز کئے بغیر ایک ہی طرح پیش آنا؛ استعداد، قابلیت؛ صلاحیت، کام کرنے کی استطاعت؛ رجحانِ طبع، طبیعت کا رجحان، طبیعت کا میلان؛ اہل، لائق، حقدار؛ طبعاً، طبیعت کے لحاظ سے، مزاج کے اعتبار سے؛ مطلق، بالکل ہرگز؛ طبّاع، بہت ذہین؛ طبّاعی، بہت زیادہ ذہانت؛ متعدد، کئی؛ اکابرین بڑے لوگ، نامور شخصیتیں؛ روابط، تعلقات؛ شغف، دلچسپی؛ فرماں روا؛ حکمران؛

صفحہ نمبر ۱۰:۔ فرسودہ، پرانا؛ مآل اندیشی، انجام کے بارے میں سوچنا؛ مستحسن، اچھا؛ بالائے طاق رکھنا، الگ کر کے رکھ دینا، نظر انداز کرنا؛ ایں جانب، اس طرف، مراد ہے یں یعنی بات کرنے والا اپنے لئے یہ لفظ استعمال کر رہا ہے؛ نزول، نازل ہونا؛ نزولِ اجلال فرمانا، آنا، تشریف لانا؛

صفحہ نمبر ۱۱:۔ آگاہ، واقف؛ مطلع کرنا، اطلاع دینا؛ پارچہ، کپڑا؛ پارچہ ہائے پوشیدنی، پہننے کے کپڑے؛ عدول حکمی، حکم نہ ماننا، حکم کی تعمیل نہ کرنا؛ سزائے شدید کا مستوجب، بہت زیادہ سزا کا حقدار؛

صفحہ نمبر ۱۲:۔ قائل ہو گئے، مان گئے؛ لائقِ توصیف، قابلِ تعریف؛ صلہ، بدلہ، عوضانہ؛ سقیم، خراب، کمزور؛ گوارا کرنا، پسند کرنا؛ بِرتا، بل، طاقت، سہارا؛ ارادت مند، عقیدت مند؛ مکتوبات، خطوط؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

ہر شخص کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکنا چاہیئے۔ ہر ایک کی صلاحیت واستعداد اور رجحان طبع کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ دنیا کی سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسے کام پر لگا دیا جائے جس کا وہ اہل نہیں یا جس میں اس کا دل نہیں لگتا اور ایسے کام کا موقع نہ دیا جائے جس کے لئے وہ طبعاً موزوں ہے۔ میں نے دیکھا ہے اور تم نے بھی دیکھا ہو گا کہ بعض نہایت ذہین اور طباع شخصیتوں نے مجبور ہو کر محض پیٹ پالنے کی خاطر ایسے کام اختیار کر لئے ہیں جس کے وہ مطلق اہل نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری طباعی اور ذہانت خاک میں مل گئی۔ اگر وہ شخص ایسے کام میں لگا دیئے جاتے جس کے اہل تھے تو بڑا کام کرتے اور نام پیدا کرتے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس مولوی عبدالحق کے خط سے لیا گیا ہے جو انہوں نے مولوی محمد امین زبیری کو لکھا۔

سیاق وسباق:۔ اس خط میں مولوی عبدالحق مولوی محمد امین زبیری پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بچوں کو ان کے رجحانِ طبع کے مطابق کام پر لگانا چاہیئے، اپنی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ان سے وہی کام لینا چاہیئے جس کے لئے خداوند کریم نے انہیں صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ وہ نعمان کو بھوپال میں ملازمت دلوانا چاہتے ہیں جبکہ وہ اس کے لئے موزوں نہیں۔

تشریح:۔ ہر شخص کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیئے اور ایک ہی جیسی توقعات وابستہ نہیں کر لینی چاہیئں۔ ہر شخص کی اہلیت اور قابلیت بھی دیکھنی چاہیئے اور اس کا طبعی رجحان بھی۔ دنیا کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ کسی شخص کے سپرد ایسا کام کر دیا جائے جسے انجام دینے کی وہ صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو یا جس میں اس کا جی ہی نہ لگتا ہو اور اس کے برعکس اسے کسی ایسے کام پر لگنے کا موقع مہیا نہ کیا جائے جسے وہ اپنی فطری مناسبت کی وجہ سے انجام دینے کا اہل ہے۔ میرا (اور آپ کا بھی ہو گا) مشاہدہ ہے کہ بعض نہایت ذہین لوگوں نے محض مفلسی سے تنگ آ کر ایسا پیشہ اپنا

لیا جس کے وہ ہرگز اہل نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری ذہانت بالکل ضائع ہو گئی۔ اگر انہیں کسی ایسے کام پر لگایا جاتا جس کے وہ حقیقتاً اہل تھے تو وہ کارنامے بھی انجام دیتے اور شہرت بھی پاتے۔

(۲)

نعمان کو خوش قسمتی سے (اور محض اتفاق سے) ایک ایسا موقع مل گیا ہے جو بہت کم کسی نوجوان کو ملتا ہے۔ اسے اُدھر جانے دو اور اپنی فرسودہ مصلحتیں اور مآل اندیشیاں اپنے پاس ہی رہنے دو۔ ہوا کا رُخ بدلا ہُوا ہے اور تم جس سمت ناؤ کھینا چاہتے ہو، اُدھر ایک طوفان برپا ہے۔ کشتی کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جائیں گے۔ جب ایک نوجوان کام کرنا چاہتا ہے اور وہ کام تمہارے نزدیک بھی مستحسن ہے تو اسے جانے دو، روکو نہیں۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت مولوی عبدالحق کے خط بنام مولوی محمد امین زبیری سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ مولوی عبدالحق مولوی محمد امین زبیری کو سمجھا رہے ہیں کہ نوجوانوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق ہی کام دلانا چاہیئے۔ ان سے ایسے کام نہیں لینے چاہیں جو ان کے رجحان اور ان کی قابلیت کے مطابق نہ ہوں۔

تشریح:۔ نعمان خوش قسمت ہے کہ سراسر اتفاقیہ طور پر اسے ایسا موقع میسّر آ گیا ہے جو کسی کسی نوجوان کو مل پاتا ہے۔ تم اپنی پرانی مصلحتیں چھوڑ دو، انجام کے بارے میں بلاوجہ پریشان ہونا ترک کرو اور اسے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھیج دو۔ زمانے کے حالات اب بدل رہے ہیں۔ تم جس طرف جانا چاہتے ہو، وہ طوفانی راستہ ہے، پہنچنا تو در کنار، راستے ہی میں پاش پاش ہو جاؤ گے۔ —— کیوں ضد کرتے ہو۔ جب ایک نوجوان کام کرنے کا خواہشمند ہے اور جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے اسے خود تم بھی اچھا ہی سمجھتے ہو تو اسے جانے دو اور اس کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو۔

(۳)

وقت کی قدر و قیمت اب بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک ایک لمحہ عزیز ہے۔ دنیا اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ ہمارے وقت کا ایک سال، آج کل

کا ایک مہینہ ہے۔ سارے عالم میں ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہو گا۔ جو آج میدان میں اُترے گا، وہی کل کچھ کر دکھائے گا۔ اس لئے اب تم نعمان کا وقت ضائع مت کرو۔ اپنے مشوروں کو بالائے طاق رکھو اور بسم اللہ کر کے اسے بمبئی میں کام ...... شروع کرنے کی اجازت دے دو۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت مولوی عبدالحق کے خط بنام مولوی محمد امین زبیری سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق:۔ مولوی عبدالحق محمد امین زبیری پر یہ واضح کرنے کے بعد کہ نوجوانوں سے ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق ہی کام لینا چاہیئے، انہیں سمجھا رہے ہیں کہ نعمان کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام ملا ہے تو وقت ضائع نہ کرو۔

تشریح:۔ اب وقت کی قدر وقیمت کا تصور وہ نہیں رہا جو پہلے کبھی تھا۔ وقت کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک ایک سیکنڈ قیمتی ہے۔ دنیا اس تیزی سے بھیل رہی ہے اور ترقی کی جانب بڑھ رہی ہے کہ ہمارے زمانے کا ایک سال اب ایک مہینہ رہ گیا ہے۔ پوری دنیا میں شور بپا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے، کل کیا ہو جائے — جو شخص جتنا جلد کسی میدان میں آئے گا، اتنا ہی زیادہ کامیاب ہو سکے گا اور کچھ کر کے دکھا سکے گا۔ اس لئے اب تم بھی نعمان کا وقت برباد نہ کرو۔ اپنے مشورے رہنے دو اور خدا کا نام لے کر اسے بمبئی بھیج دو کہ جائے اور کام کا آغاز کرے۔

(۴)

یہ صحیح ہے کہ حکومت پاکستان نے پانسو روپیہ ماہانہ میری پنشن منظور کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ پنشن اُردو کی لائق توصیفِ خدمت کے صلے میں دی جاتی ہے۔ پاکستان کے وزیرِ تعلیم بنگالی ہیں اور اُردو نہیں جانتے مگر اُردو کے سب سے زیادہ حامی یہی ہیں۔ انہوں نے انجمن اور کالج کے معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ اُنہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ میری حالت سقیم ہے، اور میں اب نادار ہو گیا ہوں۔ حکومت میں تحریک کر کے پنشن کرا دی ہے اور مجھ سے بہت معافی مانگی کہ میری اجازت کے بغیر اُنہوں

نے ایسا کام کیا اور ایک ہمدردانہ خط لکھا ہے۔ میں نے اب تک رقم نہیں اُٹھائی۔ مجھے شرم معلوم ہوتی ہے۔ یہاں پاکستان کی خدمت کے لئے آیا تھا۔ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں اس پر بار ہوں۔ اس طرف سے کئی بار تقاضا ہو چکا ہے کہ رقم اُٹھالی جائے، انکار بھی نہیں کر سکتا اور کروں تو کس برتے پر۔ تقدیر کا لکھا پورا ہوتا ہے۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے.....

حوالۂ متن: یہ عبارت مولوی عبدالحق کے خط بنام حکیم محمد امام امامی سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق: اس خط میں مولوی عبدالحق اُردو کانفرنس کا تذکرہ کرنے کے بعد حکومتِ پاکستان کی طرف سے منظور ہونے والی پنشن کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کر رہے ہیں۔

تشریح: یہ بات تو درست ہے کہ پاکستان کی حکومت نے میرے لئے پانچ سو روپے ماہوار پنشن منظور کی ہے اور یہ وضاحت بھی کی ہے کہ یہ پنشن اُردو کی قابلِ قدر خدمات انجام دینے کے اعتراف کے طور پر ہے۔ پاکستان کے وزیر تعلیم اگرچہ بنگالی ہے، مگر اُردو کے زبردست حامی ہیں۔ انہوں نے انجمن اور کالج کے معاملات میں بہت مدد کی ہے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح سے پتہ چل گیا کہ میری مالی حالت خراب ہے اور میں غریب ہو گیا ہوں تو انہوں نے از خود کوشش کی اور حکومت سے پنشن منظور کرائی۔ انہوں نے تو مجھ سے معافی بھی مانگی ہے اور اپنے ہمدردی کے خط میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میری پیشگی اجازت کے بغیر انہوں نے پنشن منظور کرا دی۔ مگر مجھے پنشن وصول کرتے ہوئے شرم آتی ہے، اس لئے ابھی تک رقم وصول نہیں کی۔ میں تو یہاں پاکستان کی خدمت کرنے آیا تھا۔ شرم آتی ہے کہ اس پر بوجھ بنوں۔ حکومت کی طرف سے اصرار ہے کہ میں جلد رقم وصول کر لوں۔ میں نے وصول تو نہیں کی مگر انکار بھی کیا؟ آخر انکار بھی کروں تو کس بل پر ــــــ جو نصیبوں میں لکھا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے، مجھے یہ دن بھی دیکھنے تھے۔

مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی خدمات

مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی خدمات کا مختصراً احاطہ کرنا اتنا آسان نہیں، اس کے

لئے خاصی تفصیل کی ضرورت ہے، اس لئے کہ وہ ایک نامور نثر نگار ہی نہیں تھے بلند پایہ نقاد بھی تھے، اہم محقق بھی تھے، قابلِ قدر ماہر لسانیات بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اُردو زبان کی بھی خدمت کی اور اُردو ادب کی بھی — ان کی علمی وادبی خدمات اتنی متنوع، اتنی اہم اور اتنی بھرپور ہیں کہ وہ اپنی وسعت اور نتیجہ خیزی کے اعتبار سے بہت دور رس ہیں۔

مختصراً ان کی علمی وادبی خدمات کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) انجمن ترقی اُردو کے صدر اور سیکرٹری کی حیثیتوں میں آپ نے ترویج و ترقی اُردو کے لئے بے مثال خدمات انجام دیں۔

(۲) مختلف علمی وادبی رسائل و جرائد کے مدیر کی حیثیتوں میں آپ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

(۳) اُردو کی نشوونما میں دکن کا بڑا حصّہ ہے۔ دکنی شعراء اور ادباء نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کئے مگر ان کی خدمات اہلِ ادب سے پوشیدہ تھیں ——— یہ کارنامہ مولوی عبدالحق کا ہے کہ انہوں نے قدیم دکنی تصانیف سے اہلِ ادب کو روشناس کرایا۔ انہوں نے دکنی شعراء کے تذکرے اور ان کی کتابیں مرتب کر کے شائع کیں۔ دکنی ادب پر تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے اس سلسلے کے مضامین و مقالات کی تعداد بے شمار ہے۔ دکنی ادب کی اس قدر وسیع پیمانے پر دریافت مولوی صاحب کا خاص کارنامہ ہے۔

(۴) دکنی ادب کے علاوہ شمالی ہند کے ادب سے متعلق بھی بہت سی تحقیقی کتب لکھیں۔ علاوہ ازیں بعض دوسرے علاقوں کے قدیم مصنفین کی کتابیں بھی دریافت کر کے مرتب کیں اور انہیں شائع کر کے اہلِ ادب کو ان سے متعارف کرایا۔

(۵) قدیم کتابیں مرتب کرنے کے علاوہ انہوں نے بہت سی کتابوں پر گراں قدر مقدمے بھی لکھے۔ عبدالحق کے مقدمے بھی بذاتہٖ مقدمہ نگاری کے اعلےٰ نمونے ہیں۔

(۶) مقدموں کے علاوہ مولوی صاحب نے بیسیوں کتابوں پر حواشی لکھے اور بے شمار کتابوں پر تبصرے لکھے یوں بطور تبصرہ نگار بھی ان کا کام بہت وقیع ہے کہ ان کے تبصرے بھی محض رسمی تبصرے نہیں ہوتے تھے بلکہ ہر اعتبار سے جامع تجزیاتی

مضامین ہوتے تھے۔

(۷) عبدالحق ایک بلند پایہ نقاد بھی ہیں۔ ان کی تنقید میں گہرائی، توازن اور معقولیت ہے۔ زبان شستہ اور رواں ہے۔ تنقید میں انہوں نے شبلی اور حالی کی روایت کو زندہ رکھا ——— ان کی تنقید ہمیشہ بے لاگ رہی اور ان کے وسیع مطالعہ کی غمازی کرتی رہی۔

(۸) ان سب پہلوؤں کے علاوہ انہوں نے بطور خطیب اور مقرر کے بھی بہت کام کیا۔ انہوں نے بے شمار علمی و ادبی جلسوں اور کانفرنسوں میں تقریریں کیں اور خطبات پڑھے جو تحریری شکل میں بھی شائع ہوئے۔ ان خطبات میں مختلف مسائل (بالخصوص زبان و ادب اردو سے متعلق مسائل) زیر بحث آئے۔ جو کتابی صورت میں موجود ہیں۔

پطرس بخاری

مکاتیب

سوانحی خاکہ

سید احمد شاہ پطرس بخاری اکتوبر ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی جائے پیدائش پشاور ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں حاصل کی اور یہیں سے بی۔ اے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے (انگریزی) کا امتحان امتیازی درجہ میں پاس کیا۔ مزید تعلیم کیمبرج میں حاصل کی۔ جہاں سے فارغ التحصیل ہو کر آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد میں آپ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ جہاں ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے مسلمان پرنسپل متعین ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندہ مقرر کئے گئے۔ چند ہی سالوں میں آپ اقوام متحدہ میں انڈر سیکرٹری (اطلاعات) کے عہدے تک پہنچ گئے۔ آپ پہلے ایشیائی تھے جو اس منصب پر فائز ہوئے۔ نیویارک ہی میں آپ کا ۱۹۵۸ء میں انتقال ہوا۔

آپ کی شہرت آپ کے مضامین کی وجہ سے ہے جو "مضامین پطرس" کے نام سے شائع ہوئے۔ اگرچہ مقدار کے لحاظ سے پطرس بخاری کا کام اتنا زیادہ نہیں مگر معیار کے اعتبار سے اور اپنے مخصوص انداز تحریر کی وجہ سے آپ کو بہت شہرت ملی اور آپ کے مضامین ادبی یادگار کی حیثیت اختیار کر گئے۔

پطرس بخاری کے اندازِ تحریر کی خصوصیات

اگرچہ پطرس بخاری نے بہت تھوڑا لکھا اور صرف ایک مجموعۂ مضامین (وہ بھی ضخیم نہیں) چھوڑا مگر انہوں نے اُردو ادب میں لاثانی حیثیت حاصل کر لی اور اُردو مزاح کی نئی راہ کھول دی جو مروجہ سپاٹ مزاح سے مختلف تھی ——— ذیل میں ان کے

اندازِ تحریر کی اہم خصوصیات دی جاتی ہیں۔ یہ بیان مضامین کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں جو بے تکلف گفتگو کے نمونے ہیں۔

۱۔ فطری انداز پطرس بخاری کے مزاح کا انداز بالکل فطری ہے۔ وہ قاری کو زبردستی ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کا تسلسل اور کرداروں کی حرکات و سکنات سے وہ فطری انداز میں ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہی مزاح نگار کی کامیابی ہے۔

۲۔ سادگی پطرس کا انداز سادہ ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں، سیدھے سادے لفظوں اور عام فہم انداز میں اپنا مطلب بیان کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کا مزاح عام فہم ہوتا ہے اور فلسفیانہ نکات کا حامل نہیں ہوتا جن میں اُلجھ کر قاری مزاح کا لطف ہی نہ اُٹھا سکے۔ تاہم وہ بعض اوقات لفظوں کے اُلٹ پھیر اور متضاد اثرات کے حامل جملوں سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں مگر پیچیدگی کہیں پیدا نہیں ہونے دیتے۔

۳۔ محاورات کا استعمال اگرچہ پطرس کے ہاں مسلسل سادگی ہے مگر وہ سادگی کو برقرار رکھتے ہوئے جا بجا محاورات کا برجستہ استعمال بھی کرتے ہیں جس سے سادگی اور شگفتگی میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ بے ساختگی پطرس بخاری کے مزاح کا خاص وصف اس کی بے ساختگی ہے۔ وہ موزوں الفاظ اور حسبِ حال مناسب جملوں کی مدد سے کسی شے، واقعہ یا کردار کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ بے ساختہ مزاح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

۵۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ پطرس انسانی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی لئے انہوں نے انسانی کمزوریوں کا احاطہ بھی کیا اور اپنا اسلوب بھی برقرار رکھا۔ وہ بے باکی مگر زندہ دلی سے انسانی کمزوریوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جو ہمدردانہ لہجہ ملتا ہے اس کا سبب بھی ان کی انسانی نفسیات سے آگاہی ہے۔ وہ انسانی فطرت اور اس سے متعلق اہم باتوں کے علاوہ جزوی باتوں کا بھی بغور مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اپنے کرداروں کی حرکات و سکنات اور رفتار و گفتار کا بیان کرتے ہوئے نفسیاتی مطالعہ اور گہرے مشاہدہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

۶۔ خالص مزاح پطرس نے مزاح اور تمسخر میں عملی طور پر فرق واضح کر کے دکھایا کہ خالص مزاح کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں خالص مزاح ملے گا جو طنز و تمسخر سے پاک ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں ہمدردانہ جذبہ بھی موجود ہے۔ ہمدردانہ جذبے کے تحت تخلیق شدہ مزاح میں دل آزاری نہیں ہو سکتی، اسی لئے اس میں طنز یا تمسخر نہیں ہوتا جس سے ہنسنے ہنسانے کا کام تو لیا جا سکتا ہے مگر اسے معیاری مزاح نہیں کہہ سکتے۔

۷۔ مغربی ادب سے استفادہ کے اثرات پطرس نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس سے انہوں نے اثرات قبول کئے۔ چنانچہ انہوں نے مزاح نگاری کے مغربی حربوں سے بھی کام لیا مگر خوبی یہ ہے کہ مغربی ادب سے استفادہ کے اثرات کے رنگ کو غالب نہیں آنے دیا بلکہ اپنی انفرادیت پھر بھی قائم رکھی۔

۸۔ پیروڈی کے ذریعے مزاح پطرس نے پیروڈی یا تحریف نگاری کے ذریعے بھی مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کی پیروڈی قاری کو ہنساتی بھی ہے اور معاشرے کی بعض ناہمواریوں اور کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ یوں مصلح نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اصلاحِ معاشرہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۹۔ پلاٹ جو سادگی پطرس بخاری کے اندازِ تحریر کا خاصا ہے، وہی ان کے پلاٹ میں بھی ملتی ہے۔ ان کے پلاٹ بھی سیدھے سادے اور عام فہم ہوتے ہیں جو قاری کو بھول بھلیوں میں نہیں اُلجھاتے جبکہ خوبصورتی سے پڑھنے والے کو آئینہ دکھاتے ہیں جس میں اسے اپنی حماقتوں کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔

۱۰۔ ہنسی اور زہر خند کا امتزاج پطرس بخاری کے مزاح کا خاص پہلو یہ بھی ہے کہ یہ معصوم ہنسی اور زہر خند کا امتزاج ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کا معاشرے کا مشاہدہ و مطالعہ گہرا ہے۔ انہیں معاشرے کے مسائل سے ہمدردی ہے اور معاشرہ کی ناہمواریوں کا احساس بھی ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۳:۔ فراغ ۔ فرصت، اطمینان ٭ صاحب فراش ۔ بیمار ٭ علالت ۔ بیماری ٭ تکیہ کرنا ۔ انحصار کرنا ٭ حامی وناصر ۔ مددگار ٭ تشویش ۔ پریشانی ٭ مامون ۔ محفوظ مصؤن ۔ محفوظ ٭ بُعد ۔ دوری ٭ عالم اجل ۔ جلیل القدر عالم ٭ شاعر غرّا ۔ اعلیٰ شاعر، مشہور شاعر ٭

صفحہ نمبر ۱۴:۔ ہمسر ۔ برابر ٭ نادم ۔ شرسار ٭ مؤدّب ۔ باادب ٭

صفحہ نمبر ۱۵:۔ غارت ۔ برباد ٭ کمیاب ۔ کم مل سکنے والی ٭

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آسکتے ہیں ۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا، لیکن یہ نقشہ ذہن میں نہیں آتا کہ وہ بستر پہ دراز ہوں ۔ خدا ان کا حامی وناصر ہو اور خدا اُنہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون ومصؤن رکھے ۔ اے کاش! میں اُن کے پاس ہوتا اور ان کا دل بہلا سکتا ۔ ہو سکے تو اُن کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجیئے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کا ٭ اُن کا شریک ہو سکوں ۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو ۔ دل سخت اُداس ہے ۔ احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی ۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کانوں تک پہنچ جاتا ہے ۔ تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے ٭ ورنہ اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ: "اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا!"

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس پطرس بخاری کے خط بنام بیگم آمنہ مجید ملک سے لیا گیا ہے ۔

سیاق وسباق:۔ اس خط میں وہ اپنے دوست مجید ملک کی بیماری سے مطلع ہونے کے بعد اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہیں ۔

تشریح :- مجید صاحب کی کتنی ہی صورتیں میرے سامنے گھومتی ہیں ، کتنے ہی نقشے میرے ذہن میں آتے ہیں جن میں بڑے بڑے بے ڈھنگے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ایسے نقشے کا تو میں تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ وہ بستر پر پڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے اور اسے ہر پریشانی سے محفوظ رکھے۔ کاش ! میں بیماری کے ان ایام میں اس کے پاس ہوتا تو اسے تسلی دیتا۔ ممکن ہو تو مجھے اس کی خیریت مختصراً لکھ دیا کریں تا کہ مجھے اتنی دُوری کا احساس نہ ہو اور میں اس کی اور آپ کی پریشانی میں خود کو شریک تصوّر کر سکوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کب پاکستان آنا نصیب ہوگا۔ جی بہت اُداس ہے۔ میں کسی بھی لمحے دوستوں کی یاد کو دل سے نہیں بھلاتا ———— کبھی کوئی خوشگوار بات مجھ تک پہنچ پاتی ہے تو طبیعت دن بھر شگفتہ رہتی ہے ورنہ اگر اداسی کی ایسی فضا غالب رہتی ہے جس میں میں اپنے پیاروں کو یاد کرتا اور ان سے ملاقات کی آرزو کرتا رہتا ہوں۔

(۲)

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں کہ کہنے کو تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر غرّا اور جانے کیا کیا ہیں لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کی بدولت پنپے اور سرخرو ہوئے۔ وہ کتاب بھی اب نایاب ہے :-

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو!

حوالۂ متن :- یہ عبارت پطرس بخاری کے خط بنام بیگم آمنہ مجید ملک سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق :- اس خط میں وہ اپنے دوست مجید ملک کی بیماری کے حوالے سے پریشان ہیں اور شاکی ہیں کہ احباب انہیں خط نہیں لکھتے۔

تشریح :- ہمارے دوست یُوں تو ماشاءاللہ جلیل القدر عالم اور مشہور شاعر ہیں مگر خدا معلوم کیا بات ہے کہ انہیں خط لکھنا نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی لوگوں کے لئے جو لاچار ہیں اور خط لکھنا نہیں جانتے۔ شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ

میں ایک کتاب بکتی تھی جس کا نام تھا "عاشقانہ خط و کتابت" ——— اسی کتاب کی بدولت کئی لوگوں کے عشق پروان چڑھے اور کامیاب بھی ہوئے ——— مگر اب تو وہ کتاب بھی کہیں دستیاب نہیں ——— اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو تم ہی بتاؤ کہ محبت کرنے والے کیسے گزارا کریں جبکہ ان کے محبوب ایسی بے نیاز طبع کے مالک ہیں۔

(۳)

یہاں موسم مستقل خوشگوار ہے۔ کیو (Kew) باغ میں گارڈینا، میگنولیا اور چیری کے شگوفوں سے آگ سی لگ رہی ہے لیکن یہاں کے لئے تمہارا دل بہت ترسنے لگے تو یہ بھی سُن لو کہ یہاں زندگی واقعی کٹھن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جن گھروں کی آمدنی آٹھ دس پونڈ ہفتے سے زائد نہیں ہے وہ بسر کیسے کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں کمیاب ہیں اور جو ہیں انہیں پکانے میں غارت کر دیتے ہیں۔ لوگ لاپروا ہو گئے ہیں۔ میرے آپ کے سامنے چیزیں یوں لا کے پٹکتے ہیں کہ میاں لو، جی چاہے تو اٹھا لو ورنہ ہوا کھاؤ! ......

حوالۂ متن :- یہ عبارت پطرس بخاری کے خط بنام ایلس فیض سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق :- اس خط میں پطرس، ایلس فیض کے خط میں زیادہ بے تکلف انداز اختیار کرنے پر مزاحیہ انداز میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں اور پھر لندن کے موسم اور حالات کے بارے میں ایک تاثر لکھ رہے ہیں۔

تشریح :- موسم تو یہاں سدا ہی خوشگوار رہتا ہے۔ باغ میں گارڈینا، میگنولیا اور چیری کے غنچوں نے ہر طرف سُرخی کا سماں پیدا کر دیا ہے جو آگ کا منظر پیش کر رہا ہے لیکن یہ بھی تو سُن لو کہ اگر موسم کی خوبصورتی کو نظر میں رکھ کر تمہارا جی چاہنے لگے کہ یہاں آجاؤ تو یہاں کی زندگی بڑی مشکل ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ جن گھرانوں کی آمدنی صرف آٹھ دس پونڈ ہفتے سے زیادہ نہیں وہ گزارہ کیسے کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں بڑی مشکل سے میسّر آتی ہیں۔ انہیں بھی پکانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ لوگ بہت لاپروا ہو چکے ہیں۔ ہمارے سامنے یوں چیزیں پٹکتے ہیں کہ لینی ہے تو لے لو، ورنہ چلتے بنو۔

حمید احمد خاں

مکاتیب

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۶:۔ محب۔ دوست ؎ مکرم۔ قابلِ احترام ؎ وحشت۔ گھبراہٹ، اُداسی ؎ اہلاً وسہلاً و مرحبا۔ خوش آمدید، عرب لوگ مسافر کے آنے پر کہتے ہیں۔ دوچار ہونا واسطہ پڑنا ؎ غریب الوطنی۔ مسافری ؎ لازمہ۔ ضروری اسباب ؎

صفحہ نمبر ۱۷:۔ زمہریر۔ سخت جاڑا، سخت سردی ؎ کرۂ زمہریر۔ کرۂ ہوا کا سخت سرد طبقہ۔ دوزخ کا طبقہ جہاں سردی کا عذاب دیا جائے گا ؎ رسائی۔ پہنچ ؎ منہمک۔ مصروف ؎ یبوست۔ خشکی ؎ ریسرچ۔ تحقیق ؎ طراوت۔ تری، تازگی، نمی ؎ آثار۔ نشانیاں ؎ تفنن۔ دل لگی، شغل ؎ بفضلِ خدا۔ اللہ کی مہربانی سے ؎

صفحہ نمبر ۱۸:۔ سعی۔ کوشش ؎ بلیغ۔ کامل۔ مکمل۔ پورا ؎ سعیٔ بلیغ۔ پوری کوشش ؎ از سرِ نو۔ نئے سرے سے ؎ رحلت۔ وفات ؎ کم سن۔ تھوڑی عمر کا ؎ دورِ اوّل۔ پہلا دور ؎ معین۔ مقرر ؎ تجدید عہد۔ کسی عہد کو تازہ کرنا ؎ پیمانِ وفا۔ وفا کا عہد ؎ فضائل۔ خوبیاں ؎ دیارِ غیر۔ اجنبی ملک ؎

صفحہ نمبر ۱۹:۔ احوال۔ حالات ؎ اوائلِ عمر۔ ابتدائی عمر ؎ آب جو۔ پانی کی نہر ؎ متلاطم۔ طوفانی ؎ محاسبہ کرنا۔ حساب کتاب لینا ؎ جانچنا، پرکھنا، احتساب کرنا ؎ ماورا۔ بالا ؎ واجب التکریم۔ قابلِ احترام، محترم ؎ نکوکاری۔ نیکی ؎ راہِ راست۔ سچا راستہ، سیدھا راستہ ؎ نایاب۔ بالکل نہ ملنے والی، کہیں نہ ملنے والی ؎

صفحہ نمبر ۲۰:۔ ہمسرِ فلک۔ آسمان کی برابری کرنے والا۔ بلند مرتبے کا مالک ؎ غیور۔ غیرت مند ؎ راستی۔ سچائی ؎ ریا۔ دکھاوا ؎ عناد۔ دشمنی ؎ سپر۔

ڈھال - پناہ ✗ سرکش - باغی ✗ مقدرت - تقدیر ✗ کشادہ دل - کھلے دل کا مالک ✗ پاک نفس - نیک طبیعت والا ✗ نستعلیق شخصیت - متین شخصیت - سنجیدہ شخصیت ✗ سجل اسلوب - نفیس انداز، عمدہ اسلوب ✗ مترشح ہونا - ٹپکنا - ظاہر ہونا ✗ متخصص - ماہر ✗ پارکھ - جوہری - نقاد ✗ برمحل - برموقعہ - موقعہ کی مناسبت سے ✗ غیر معمولی قدرت - بہت زیادہ مہارت ✗

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

جس وحشت کے احساس سے آپ آج کل دوچار ہیں، وہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں غریب الوطنی کے ابتدائی دور کا لازمہ ہے۔ میں نے پچھلے سال، تین چار مہینے اسی پریشانی میں گنوائے۔ آپ اس بے اطمینانی پر فوراً غالب آنے کی کوشش کیجئے کیوں کہ یہاں کے محدود قیام کا ایک ایک دن کام میں صرف ہونا چاہیئے۔ اس ملک میں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!

حوالۂ متن:- یہ عبارت پروفیسر حمید احمد خاں کے خط بنام ڈاکٹر مختار الدین آرزو سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- پروفیسر حمید احمد خاں اس خط میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو کو مسافرت کے دوران کی پریشانی کے حوالے سے تسلی دیتے ہیں اور دیارِ غیر کے قیام سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتے ہیں۔

تشریح:- جس اداسی اور گھبراہٹ کے احساس میں آپ مبتلا ہیں، میں تو سمجھتا ہوں وہ مسافرت کے پہلے ایام کا خاصہ ہے یعنی ابتدائی ایام میں اداسی اور گھبراہٹ لازمی امر ہے۔ خود میں نے بھی پچھلے تین چار مہینے ایسی ہی پریشانی کی حالت میں ضائع کئے۔ کوشش کریں کہ اس بے چینی پر فوراً غلبہ پالیں تاکہ یہاں کے قیام سے جو بہت تھوڑا ہے، پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں اور ایک ایک دن صحیح مصرف میں لا سکیں۔ اس ملک میں تو جو وقت ضائع ہو جاتا ہے، اس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔

(۲)

اپنے 'مختصر' کمرے سے ہرگز نہ گھبرائیے۔ اس سرد ملک میں کمرہ جتنا مختصر ہو، اُسی نسبت سے قابلِ قدر ہوتا ہے۔ بڑے کمرے میں رہنا گویا کرۂ زمہریر میں رہنا ہے۔ نیچی چھت اور چھوٹا کمرہ یہ تو قسمت کی رسائی کی دلیل ہے...... میں شب و روز کام میں منہمک ہوں۔ ابھی مقالے کا ایک نصف بھی تکمیل کو نہیں پہنچا اور ارادہ یہ ہے کہ جون ۱۹۵۴ء میں کیمبرج کو الوداع کہوں! دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس پروفیسر حمید احمد خاں کے خط بنام ڈاکٹر مختار الدین آرزوؔ سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ پروفیسر حمید احمد خاں اس خط میں ڈاکٹر آرزوؔ کو مسافرت کے دوران کی پریشانی کے حوالے سے تسلی دیتے ہیں اور دیارِ غیر کے قیام سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتے ہیں۔

تشریح:۔ اگر آپ کا کمرہ چھوٹا ہے تو اس سے گھبراہٹ محسوس نہ کریں۔ اس سرد ملک میں تو کمرہ جتنا بھی چھوٹا ہو، اتنا ہی اچھا ہے بلکہ قدر کرنے کے لائق ہے۔ بڑے کمرے میں رہنا تو دوزخ کے اس طبقے میں رہنے کے برابر ہے جہاں سردی کا عذاب دیا جائے گا یعنی کمرہ جتنا بڑا ہو گا سردی کی شدت اتنی ہی زیادہ محسوس ہو گی۔ یہاں تو کمرہ جتنا چھوٹا ہو گا اور چھت جتنی نیچی ہو گی اس میں رہنے والے کے لئے اتنی ہی خوش قسمتی کی بات ہو گی۔ میں دن رات کام میں مصروف ہوں۔ ابھی تک مقالے کا آدھا حصّہ بھی مکمل نہیں کر سکا جبکہ ارادہ یہ ہے کہ جون ۱۹۵۴ء تک کیمبرج سے چلا جاؤں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

(۳)

آپ نے مضمون کی یبوست کا شکوہ کیا ہے۔ ریسرچ شروع ہو جانے پر یہ کیفیت نہیں رہے گی۔ خدا کا نام لے کر شروع کر دیجئے تو صحرائے اعظم میں بھی طراوت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ تفنن نہیں، حقیقتِ حال ہے اور آپ کا تجربہ بفضلِ خدا اس کی تصدیق کرے گا۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت پروفیسر حمید احمد خاں کے خط بنام ڈاکٹر مختار الدین آرزو سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- اس خط میں پروفیسر حمید احمد خاں ڈاکٹر آرزو کو اس کے مشکل مضمون کے حوالے سے سمجھا رہے ہیں کہ کام شروع کر دیا جائے تو آسان ہو جاتا ہے۔

تشریح:- آپ نے شکایت کی ہے کہ مضمون خشک ہے۔ جب آپ تحقیق کے کام میں محو ہو جائیں گے تو یہ حالت نہیں رہے گی۔ اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیں۔ پھر دیکھیں کیسے صحرائے اعظم میں بھی نمی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی یہی خشک مضمون دلچسپ معلوم ہونے لگے گا۔ میں دل لگی نہیں کر رہا ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں اور انشاء اللہ آپ کا ذاتی تجربہ بھی ثابت کر دے گا کہ میرا کہنا صحیح تھا۔

(۴)

۶ دسمبر کا دن میرے لئے ہر سال ایک پرانے عہد کو از سر نو تازہ کرنے کا پیغام لاتا ہے۔ یہ دن میرے والد مرحوم و مغفور مولانا سراج الدین احمد خاں کی رحلت کا دن ہے۔ اُن کی وفات کے وقت میں اتنا کم سن تھا کہ میرے لئے اُن کی یاد ایک دھندلی سی تصویر کے مانند ہے۔ لیکن اُن کی ذات و صفات کا جو تصور لڑکپن کے دنوں سے مجھے دیا گیا وہ آج بھی میرے ذہن میں ایک روشن ستارے کی طرح چمکتا ہے۔ زندگی کے دوراہوں میں جب مجھے کسی مشکل کا سامنا ہوتا میں اُس کے حل کے لئے اپنے آپ سے ہمیشہ پوچھتا کہ والد مرحوم کو اگر یہ صورت درپیش ہوتی تو وہ کیا کرتے؟ اور اس سوال کا جواب ہمیشہ میرے لئے صحیح راہ عمل متعین کر دیتا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ دن میرے لئے کیوں تجدید عہد کا دن ہے اور والد ماجد کے ذاتی کردار کے تصور سے وفاداری کا وعدہ میں خاص طور پر اس روز کیوں یاد کرتا ہوں۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت پروفیسر حمید احمد خاں کے خط سے لی گئی ہے جو پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کے نام لکھا گیا۔

سیاق و سباق:- یہ خط ۶ دسمبر کا لکھا ہوا ہے جبکہ یہی دن پروفیسر حمید احمد خاں کے والد محترم کی وفات کا دن ہے۔ اسی لئے وہ اسے تجدید عہد کا دن قرار دیتے ہیں اور

عظیم باپ کی شخصیت کے حوالے سے طلبا کو بلند کردار بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

تشریح :۔ ہر سال جب ۶ دسمبر کا دن آتا ہے تو میرے لئے ایک پرانے عہد کو نئے سرے سے تازہ کرنے کا پیام لاتا ہے۔ دراصل یہ دن میرے والدِ محترم جناب مولانا سراج الدین احمد خاں کا یوم وفات ہے۔ جب وہ فوت ہوئے تو میں اتنی چھوٹی عمر کا تھا کہ میرے لئے ان کی یاد بھی ایک دھندلی تصویر کی طرح ہے۔ لیکن لڑکپن کے زمانے میں ان کی ذاتی صفات اور کردار کا جو تصور میرے ذہن میں بٹھایا گیا وہ آج بھی ایک روشن ستارے کی طرح میرے ذہن میں روشن ہے۔ زندگی کے ابتدائی ایام میں جب مجھے کوئی مشکل پیش آتی تو میں اس کا حل یوں تلاش کرتا کہ اپنے آپ سے پوچھتا کہ اگر یہی صورتِ حال میرے والدِ محترم کو پیش آتی تو وہ کیا فیصلہ کرتے یا کیا قدم اٹھاتے۔ اس سوال کے جواب نے ہمیشہ میری رہنمائی کی اور عمل کے لئے صحیح راستہ دکھایا۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ دن میرے لئے پرانے عہد کو تازہ کرنے کا دن کیوں ہے اور والد محترم کے ذاتی کردار کے تصور سے وفاداری سنبھالنے کا وعدہ خاص اسی دن کیوں کرتا ہوں۔

(۵)

آج جب مجھے یہ پیمان وفا باندھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور میں دیارِ غیر میں وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوں، مجھے یکایک خیال آیا کہ میرے وہ عزیز طلبہ، جو پنجاب یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں، فضائلِ اخلاق کے کون سے نمونوں کو پیشِ نظر رکھے ہوئے آئندہ نصف صدی میں اپنی اپنی زندگی کا نقشہ تیار کر رہے ہیں؟ اور یہ سوچتے ہی میرا جی چاہا کہ ان ہزارہا نوجوانوں کو اپنے ذاتی احوال کی روشنی میں توجہ دلاؤں کہ کوئی نہ کوئی اچھا نمونہ اپنے سامنے رکھنا، اور بالخصوص اوائل عمر میں اپنے سامنے رکھنا، ہمارے لئے زندگی کی تیاری کی اوّلین شرط ہے۔

حوالۂ متن :۔ یہ عبارت پروفیسر حمید احمد خاں کے خط سے لی گئی ہے جو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کے نام لکھا۔

سیاق و سباق :۔ اس خط میں جو ۶ دسمبر (یوم وفات والدِ حمید احمد خاں) کو لکھا گیا اپنے تجدید عہد کے حوالے سے طلباء کو کچھ نصیحتیں کرتے ہیں اور کسی بڑی شخصیت کا تصور اپنے

پیشِ نظر رکھنے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

تشریح :۔ آج جبکہ مجھے اپنے والدِ مرحوم کے کردار کی روشنی میں اپنا کردار تعمیر کرنے کے عہد سے وفاداری نبھاتے پچاس سال سے بھی زائد عرصہ ہو چکا ہے میں ایک اجنبی ملک میں ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھا ہوُا اچانک اس احساس سے دوچار ہوُا ہوں کہ وہ طالب علم جو پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اخلاقی فضائل کے اعتبار سے اپنے سامنے ایسے کون سے نمونے رکھے ہوئے ہیں جن کو ملحوظ رکھ کر وہ آئندہ پچاس سال کی زندگی کا خاکہ تیار کر سکیں گے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا کہ اپنے ذاتی حالات کے حوالے سے ان ہزاروں طالب علموں کو متوجہ کروں کہ زندگی میں کوئی نہ کوئی اچھا نمونہ اپنے سامنے ضرور رکھیں۔ خاص طور سے زندگی کے پہلے سالوں میں ایسا کوئی نمونہ اپنے سامنے رکھ لینا کامیاب زندگی بسر کرنے کی پہلی شرط ہے۔

(٦)

انسان کا ضمیر ایک پُرسکون آب جُو سے کہیں زیادہ ایک متلاطم سمندر کی مثال ہے۔ اگر آپ کبھی اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو اندازہ ہو گا کہ ہمیں ہر وقت، خیال یا عمل کی دنیا میں، کوئی نہ کوئی نئی صورت در پیش ہے جو ہم سے مسلسل کسی نہ کسی نئے فیصلے کا مطالبہ کرتی ہے۔ یوں دیکھیے تو اخلاقی ارادہ کسی اچھے نصب العین کے مطابق فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا نام ہے۔ یہ اچھا نصب العین، جو بار ہا ہماری ذاتی رسائی سے ماورا ہوتا ہے، اگر کسی ایسی شخصیّت کا جامہ پہن سکے جو ہمارے دلی احترام و محبت کی مستحق ہے، تو اس کا اخلاقی حکم ایک نہ ٹلنے والا تقاضا بن کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہو گا۔ اس عمل کی کئی صورتیں ممکن ہیں: اکثر ہمارے والدین، یا کوئی بڑا بھائی بہن، کوئی شفیق اُستاد یا کوئی اور واجب التکریم بزرگ اس مثالی انداز میں ہماری اخلاقی قوت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ پختگی عمر کو پہنچ کر اس قسم کے سہارے کی ضرورت کم ہو جاتی ہے، لیکن وہ صرف اس لئے کہ نوعمری کے دنوں میں ہم نے کسی اعلیٰ درجے کے نمونۂ اخلاق کا سہارا لے کر نکوکاری کو اپنی عادت بنانے کی کوشش کی۔ اُن نوجوانوں کے لئے جو نیکی کی زندگی بسر کرنے کی

خواہش یا نیت رکھتے ہیں، یہ لازم ہے کہ اپنے حلقے کے اندر محبت و عقیدت کا ایک ایسا مرکز تلاش کر لیں جس کی کشش قدم قدم پر انہیں راہِ راست پر آنے کی دعوت دے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری دنیا میں نیکی کبھی اس حد تک نایاب نہیں ہوئی کہ ہم کسی اچھے نمونے کی تلاش میں نظر دوڑائیں تو شمع ہدایت کی کوئی نہ کوئی کرن پاس ہی جھلکتی ہوئی نہ مل جائے۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت پروفیسر حمید احمد خاں کے خط بنام طلبائے پنجاب یونیورسٹی سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- پروفیسر حمید احمد خاں طلباء کو احساس دلا رہے ہیں کہ زندگی میں کوئی اعلیٰ کردار کا نمونہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جیسا کہ انہوں نے اپنے والدِ محترم کی شخصیت کو پیشِ نظر رکھا۔

تشریح:- انسان کے ضمیر کی مثال کسی پُرسکون ندی کی نہیں بلکہ ایک طوفانی سمندر کی سی ہے اگر آپ کبھی اپنی ذات کے اندر جھانکیں اور اپنا احتساب خود ہی کریں تو خود ہی اندازہ کریں گے کہ ہم ہر لمحہ خیال یا عمل کے اعتبار سے کسی نہ کسی نئی صورتِ حال سے دوچار رہتے ہیں جس میں ہمیں کوئی نہ کوئی نیا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اخلاقی ارادہ دراصل کوئی اعلیٰ مقصدِ حیات پیشِ نظر رکھ کے فیصلہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ یہ اعلیٰ مقصدِ حیات جو اکثر و بیشتر ہماری پہنچ سے بہت باہر ہوتا ہے اگر کسی ایسی شخصیت کا روپ دھار لے جو ہماری دلی محبت و عزت کا حقدار ہو تو اس کے اخلاقی حکم ہمارے سامنے ایسے تقاضوں کی صورت میں آ کھڑے ہوتے ہیں جنہیں ہم کسی بھی صورت رد کر ہی نہیں سکتے۔ اس عمل کی کتنی ہی ممکنہ صورتیں ہیں۔

اکثر اوقات ہمارے ماں باپ یا کوئی بڑا بھائی یا بہن یا کوئی مہربان استاد یا کوئی اور محترم ہستی ہمارے لئے اخلاقی طاقت کا سرچشمہ بن جاتا ہے اور مثالی انداز میں ہمارے لئے نمونہ بن جاتا ہے۔ جب ہم پختہ عمر کے ہو جاتے ہیں تو ایسے سہارے کی اتنی ضرورت نہیں رہتی لیکن صرف اس لئے کہ لڑکپن میں ہم نے کسی اعلیٰ شخصیت کو اخلاقی نمونے کے طور پر اپنے پیشِ نظر رکھ کر نیکی کی راہ پر گامزن ہونے کی عادت اپنانے کی کوشش کی تھی۔ جو نوجوان یہ خواہش یا نیت رکھتے ہیں کہ نیکی کی زندگی گزاریں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دائرے

ہی کے اندر سے محبت اور عقیدت کا کوئی ایسا مرکز ڈھونڈیں جو قدم قدم پر انہیں سیدھی راہ اختیار کرنے کے لئے اکساتی رہے۔ خداوند کریم کا شکر ہے کہ ہماری دنیا سے نیکی کبھی غائب نہیں ہوئی، نیکی کے حوالے سے بے شمار نمونے ہمارے اردگرد موجود ہوتے ہیں، ڈھونڈنا چاہیں تو ہدائیت کی روشنی کی کوئی نہ کوئی شعاع ہمیں اپنے پاس ہی سے مل جائے گی یعنی کوئی نہ کوئی اخلاقی نمونہ ہمارے اردگرد ہی سے مل جائے گا۔

ابنِ انشاء

مکاتیب

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۲۱ :۔ خوفِ فسادِ خلق ، لوگوں میں فساد پھیل جانے کا ڈر ؛ قتل ۔ مقتول ، شہید ؛ خرمن ۔ اناج کا ڈھیر ؛ خوشہ چین ۔ فائدہ اٹھانے والا ؛ مربّی ۔ سرپرست ؛

صفحہ نمبر ۱۲۲ :۔ اعتباری ۔ معتبر ، قابلِ اعتبار ؛ بے مثل ۔ بے مثال ، جس جیسا کوئی اور نہ ہو ؛ آفاقی ۔ کائناتی ؛ بے لاگ ۔ غیر جانبدارانہ ؛

صفحہ نمبر ۱۲۳ :۔ بصیرت ۔ دانائی ۔ عقلمندی ؛ کج فہم ۔ بے وقوف ، کم عقل ؛ جہل نصیب ۔ جن کا مقدر ہی جہالت ہو ؛ اجتناب ۔ پرہیز ؛ انحصار ۔ دار و مدار ؛

صفحہ نمبر ۱۲۴ :۔ کوچ کرنا ۔ چلے جانا ؛ یک لخت ۔ اچانک ؛ نادر شاہی حکم ۔ ایسا حکم جسے ٹالا نہ جا سکے ، سخت اور جابرانہ حکم ؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

آپ نے پچھلے ہفتے تذکرہ کر دیا کہ ہاں یہ کتاب بھی چھپی ہے ، شکریہ ۔ لیکن آپ کو تبصرہ کرنا چاہیئے تھا ۔ آپ کو تو یہی لکھنا ہے کہ بے مثل کتاب ہے ، ایسا اچھا شاعر اُردو کیا کسی اور زبان میں بھی پیدا نہیں ہوا ۔ اس کی شاعری آفاقی ہے ، لوگوں کو بالخصوص لڑکیوں کو تکیوں کے نیچے رکھنی چاہیئے ۔ میں نے آپ کو بے لاگ تبصرے کو تھوڑی کہا تھا ۔ میری اپنی غیر جانبدارانہ رائے اپنے بارے میں بہت اچھی ہے ۔ اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے (اب اپنے ہی ہاتھ رہ گئے ہیں !) ۔

اس سے تو آپ بھی انکار نہیں کر سکیں گے کہ جو انصاف پسند اور صاحب بصیرت نقاد ہوگا میری کتاب کی تعریف کرے گا، صرف کج فہم اور جہل نصیب لوگوں کو وہ سطحی نظر آئے گی۔ کہیں کہیں الف اور بیشتر جگہ آپ مضمون گرتا پائیں گے۔ اس کو نظر انداز کرنا بہتر ہوگا، ورنہ میں نثری نظم لکھنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنا شروع کر دوں گا اور آپ پچھتائیں گے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت ابن انشاء کے خط بنام عطاء الحق قاسمی سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ ابن انشاء اپنی نئی کتاب کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

تشریح:۔ آپ نے پچھلے ہفتے میری نئی کتاب کی اشاعت کا ذکر کر دیا، اس کے لئے شکر گزار ہوں لیکن آپ کو چاہیئے تھا کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے —— اور پھر یہ کونسا مشکل کام ہے۔ یہی تو لکھنا تھا کہ کتاب بے مثال ہے، شاعری کی دنیا میں ایسا شاعر اُردو تو کجا، کسی بھی زبان میں پیدا ہی نہیں ہوا اور اس کی شاعری کا ثانی نہیں ہے، سب لوگوں کو خصوصاً خواتین کو چاہیئے کہ اسے اپنے زیر مطالعہ رکھیں —— یعنی آپ کو میری شاعری کی تعریف ہی کرنی تھی —— خود میری رائے اپنی شاعری کے بارے میں بہت اچھی ہے اور میں اپنے بارے میں اس رائے کو بے لاگ رائے کہتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر پیار آ رہا ہے۔ (اور اب سوائے اپنی ہی ذات کے اور کون ہے جسے پیار کیا جا سکے) —— اس سے تو آپ بھی انکار نہیں کر سکتے کہ منصف مزاج یعنی غیر جانبدار اور دانا نقاد میری کتاب کی تعریف ضرور کرے گا۔ یہ کتاب صرف ان لوگوں کو سرسری سی لگے گی جو کم عقل اور جاہل ہیں۔ اگر کہیں کوئی معمولی فنی سقم نظر آئے تو اس کی پروا نہ کریں ورنہ میں نثری نظم کے حامیوں میں شامل ہو جاؤں گا اور آپ کو پچھتانا پڑے گا۔

(۲)

دیکھو بی بی، ہماری اس غزل کی نحوست جاری ہے، "انشا جی اب اُٹھو کوچ کرو" —— کل شام ایک سخت حکم ملا کہ تمہاری پوسٹ ختم —— پہلی دسمبر سے ختم، فوراً چارج دو اور پہنچو —— اُس شخص کو جس کا تقرر تین سال کے لئے ہو، یک لخت ایسا نادر شاہی حکم ملے تو اس کی ذہنی کیفیت کا تم اندازہ کر سکتی ہو!

حوالۂ متن:- یہ عبارت ابنِ انشاء کے خط بنام بیگم سرفراز اقبال سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- لندن سے بیماری کے دوران لکھے ہوئے اس خط میں ابنِ انشاء نے اپنی بیماری اور ملازمت کے حوالے سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا ہے۔

تشریح:- میری وہ غزل جس کا مطلع تھا "انشاجی اُٹھو اب کوچ کرو" بڑی منحوس ثابت ہوئی ہے۔ اس کی نحوست کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا یعنی اسی پر بس نہیں ہوئی کہ میں بیمار ہوگیا بلکہ اس کے اثرات ابھی جاری ہیں —— کل شام اچانک مجھے ایک سخت حکم ملا کہ میری ملازمت ختم کردی گئی ہے —— یعنی آج سے پانچ دن بعد، پہلی دسمبر سے ملازمت ختم ہونے اور آکر چارج دے دینے کا حکم مل گیا ہے —— یہ اچانک حکم، ایک ایسا جابرانہ حکم ہے جسے ٹالنا بھی ممکن نہیں، خود اندازہ کریں جسے ایسا سخت حکم اچانک ملے اس کی ذہنی حالت کیا ہو گی۔

(۳)

علاج کا سلسلہ شروع ہے، گھر بھی مل گیا ہے، اگرچہ پہلی اپریل کو ملا ہے!
کام بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوا تم جیسا مددگار مل گیا ہوتا تو تنکا نہ دہرا کرنا پڑتا۔
ویسے مطمئن رہو، اب بھی نہیں کرتے! پاکستان کے اخبار یہاں نہیں آتے،
اس لئے ذرا بے مزہ گزرتی، لکھنے کا بھی لطف نہیں آتا۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت ابنِ انشاء کے خط بنام کشور ناہید سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- اس خط میں ابنِ انشاء اپنی بیماری کا ذکر کر رہے ہیں۔

تشریح:- میرا علاج شروع ہو گیا ہے اور رہنے کو گھر بھی مل گیا ہے۔ اگرچہ ملا یکم اپریل کو ہے۔ (اپریل فول کے حوالے سے یکم اپریل کا خاص طور سے حوالہ دیا ہے کہ مزاح ابنِ انشاء کا مزاج ہے) کچھ نہ کچھ کام بھی تو ساتھ ساتھ کرنا ہی ہوگا مگر میرے ساتھ کوئی ایسا معاون نہیں جو تم جیسا مددگار ثابت ہوتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو مجھے کچھ بھی نہ کرنا پڑتا اور کام بھی ہو جاتا —— ویسے اطمینان رکھو، اب میں کچھ نہیں کرتا —— پاکستان کے اخبار یہاں نہیں آرہے، اس لئے زندگی میں کوئی لطف نہیں رہا اور نہ ہی لکھنے میں کوئی لطف آرہا ہے —— (یعنی پاکستان کے اخباروں کی طرح یہاں کے اخبار دلچسپ نہیں ہوتے)

سرسیّد احمد خاں

سوانحی خاکہ

سرسیّد احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباء و اجداد شاہجہان کے زمانے میں ہندوستان آئے اور شاہی دربار سے وابستہ ہو گئے۔ تب سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک ان کا تعلق سلطنت مغلیہ سے قائم رہا۔ سرسید کے والد میر متقی آزاد طبیعت انسان اور قناعت پسند طبیعت کے مالک تھے۔ سرسیّد کی ننھیال کا تعلق خواجہ میر درد کے خاندان سے تھا۔ سرسید کی والدہ نہائت ذہین، نیک اور پاکباز خاتون تھیں۔ انہی نے سرسید کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ زمانے کے دستور کے مطابق انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ قرآنِ کریم، طب اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ نیز ریاضی، ہیئت، منطق، صَرف و نحو اور علمِ بیان میں بھی دسترس حاصل کی۔ شعر و سخن کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ آزاد، غالب اور مومن کی صحبتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

۱۸۳۶ء میں والد کی وفات کے بعد صدر امین دہلی کے دفتر میں سررشتہ دار ہو گئے۔ ایک سال کی ملازمت کے بعد آگرہ کمشنری کے دفتر میں نائب منشی ہو گئے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے ۱۸۴۱ء میں منصف ہو گئے۔ ۱۸۴۲ء میں بہادر شاہ ظفر نے انہیں جوادالدولہ کا خطاب دیا۔ ۱۸۵۵ء میں صدر امین ہو کر بجنور آ گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی شروع ہوئی۔ ان ایام میں سرسیّد دہلی سے اپنی والدہ کے ہمراہ میرٹھ چلے گئے۔ انہوں نے کئی عورتوں اور بچوں کی جان بچائی۔ اس کے صلے میں انہیں ایک قیمتی خلعت، ایک ہزار روپیہ نقد اور دو سو روپے ماہوار کی پنشن (دو پشتوں تک) دی گئی۔ ۱۸۶۹ء میں آپ کے بیٹے سید محمود اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان گئے تو آپ بھی اس کے ہمراہ چلے گئے اور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ و مشاہدہ کیا جس سے آپ نے گہرا تاثر قبول کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو ان کے دل میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر کالج قائم کرنے کا خیال پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے علی گڑھ میں

ایک سکول قائم کیا جو کچھ عرصہ بعد ترقی کر کے کالج بن گیا اور بالآخر یونیورسٹی بنا۔ باقی تمام عمر وہ تعلیمی، سیاسی اور سماجی مشاغل میں مصروف رہے۔ آپ نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو اخلاقی تعلیم دینا اور جدید تقاضوں سے آگاہ کرنا تھا۔ آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر آپ نے اپنا مشن جاری رکھا۔

آپ نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال کیا اور علی گڑھ کالج کی مسجد ہی میں دفن ہوئے

——— آپ کی اہم تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) آثار (۲) اسبابِ بغاوتِ ہند (۳) خطباتِ احمدیہ
(۴) ترجمہ کیمیائے سعادت (۵) تصحیح آئینِ اکبری (۶) تاریخِ سرکشیٔ بجنور
(۷) سفرنامۂ انگلستان۔

سرسیّد کے اندازِ تحریر کی خصوصیّات

سرسید احمد خاں ایک ہمہ گیر شخصیت اور جامع کمالات کے حامل انسان تھے۔ وہ صرف ایک مصنف ہی نہ تھے، وہ سیاسی، سماجی اور قومی رہنما بھی تھے۔ وہ قوم اور ملک کو جدید حالات اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے مشاغل کی نوعیت علمی و ادبی کے علاوہ سیاسی، تعلیمی، مذہبی، تحقیقی اور قومی بھی تھی۔ اسی لئے ان کے موضوعات میں بھی تنوع تھا۔ ابتداء میں انہوں نے قدیم اسلوبِ بیان ہی کو اپنایا۔ چنانچہ آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن اسی طرز پر لکھا گیا ہے۔ مگر بعد میں انہوں نے یہ روش ترک کر دی اور پرانی نثر نگاری کے فرسودہ اور پر تکلف انداز کو چھوڑ کر جدید طرز کو اپنا لیا۔ خود قدیم اسلوبِ نثر کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"علم و ادب و انشاء کی خوبی محض لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کی تک ملانے، دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں یہ سب برائیاں بھری ہوتی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے۔ مندرج نہ ہو۔ بس اسی طرزِ تحریر نے تحریر کا اثر ہمارے دلوں پر کر دیا اور ہم کو جھوٹی

اور بناوٹی تحریروں کا عادی بنادیا۔"

اس تحریر سے قدیم طرزِ تحریر کی خامیاں سامنے آتی ہیں۔ ان خامیوں کا احساس ہو جانے کے بعد جب سرسید نے جدید طرزِ تحریر اپنایا تو ان خامیوں سے پوری طرح گریز کر کے نیا اسلوب اختیار کیا جس میں لفاظی کی بجائے قاری تک اپنا مافی الضمیر پہنچانے پر زور ہے۔ وہ اس طرزِ تحریر کے بارے میں کہتے ہیں :۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ناچیز پرچوں (تہذیب الاخلاق) کے ذریعے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاوری کی الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات و استعارات سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں بہتی ہے اور دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا، تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفّٰی عبارت کہلاتی تھی۔ ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی تاکہ جو لطف ہر مضمون کے ادا میں ہو اور جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل ہی میں بیٹھے۔"

سرسید کے ان تاثرات کی روشنی ہی میں ان کے طرزِ تحریر کی بنیادی خصوصیات کا تعیّن کیا جاسکتا ہے :۔

۱۔ سادگی اور سلاست

سرسید نے مشکل اور پیچیدہ الفاظ و فقرات کی بجائے سیدھے سادے لفظ اور چھوٹے چھوٹے جملے لکھ کر مافی الضمیر بیان کرنے پر زور دیا۔

"سرسید کی بدولت اُردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی اور ہر قسم کے مضامین اس زور و اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہ ہوئی۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشاءپرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے

حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض لوگ ان کے دامنِ تربیت میں پلے ہیں بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔"

سرسید کی سادگی کے حوالے سے مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے بڑے مشکل اور فلسفیانہ مطالب بھی اتنی سادگی سے بیان کرنے پہ قادر ہو گئے کہ اس کے نتیجے میں نہ صرف قوم نے ان کی تحریروں سے بہت رہنمائی حاصل کی بلکہ اس اندازِ تحریر نے مقبولیت بھی حاصل کی اور لکھنے والوں نے ان کے اندازِ تحریر کو اپنایا بھی۔"

۲۔ بے تکلفی و بے ساختگی

سرسید نے محض عبارت آرائی کے ذریعے نثری کمالات دکھانے کی بجائے مطلب کی ادائیگی یعنی جو کچھ دل میں ہے، اسے اسی طرح قاری تک پہنچانے پر زور دیا۔ اسی لئے ان کے ہاں بے تکلفی اور بے ساختگی ملتی ہے۔ حالی سرسید کی بے تکلفی و بے ساختگی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"وہ اپنی تحریر میں اس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔"

۳۔ تشبیہات و استعارات سے گریز

سرسید چونکہ صرف مافی الضمیر کما حقہٗ ادا کرنے کے قائل تھے اسی لئے جہاں انہوں نے سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کو اپنایا وہاں اس میں مزید اثر پیدا کرنے کے لئے تشبیہات و استعارات سے گریز کیا تاکہ عبارت میں کسی بھی طرح کا اُلجھاؤ پیدا نہ ہو۔

حالی لکھتے ہیں۔

"وہ واقعات پر تشبیہ و استعارات کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ ان کی ننگی تصویر کھلم کھلا سب کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ الفاظ و قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ و قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔"

۴۔ تنوع

سرسید کی تحریروں میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی شخصیت بھی متنوع تھی۔ انہوں نے ادب سے لے کر مذہب و سیاست ما ہر موضوع پر لکھا مگر ہر طرح کے مضامین کو بڑے اچھے انداز میں تحریر کیا۔ انہیں اظہار پہ قدرت حاصل ہے،، اس لئے ہر موضوع کے لئے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جو اس کے لئے موزوں ترین ہو۔

۵۔ استدلال

سرسید کی اصلاحی تحریک ایک عقلی تحریک تھی۔ اس لئے سرسید کو استدلال اور منطق سے کام لے کر اپنی تحریر کی بنیاد دلائل پر رکھنی مقصود تھی جو اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے انہیں درکار تھی۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں استدلال اور منطق کی خصوصیت ملتی ہے۔ مذہبی موضوعات کے علاوہ ان کی علمی و ادبی تحریروں میں استدلال موجود ہے جو بڑی خوبی کی بات ہے۔ اس لئے کہ منطق اور دلائل کے ساتھ بیان کی ہوئی باتیں سمجھنا اور ذہن نشین رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

۶۔ قواعدِ زبان سے انحراف

سرسید کے پیشِ نظر چونکہ اصلاحی مقاصد تھے جن کے حصول کے لئے ابلاغ ہی کی ضرورت تھی، یعنی بات دوسرے تک اسی طرح اور اسی مفہوم کے ساتھ پہنچے جو بولنے یا لکھنے والے کا مقصود ہے۔ اس لئے انہوں نے سادہ اور رواں انداز اختیار کرتے ہوئے جہاں ضروری سمجھا قواعدِ زبان سے انحراف بھی کر لیا اور نامانوس اور غیر فصیح تراکیب بھی استعمال کر لیں۔

۷۔ انگریزی الفاظ کا استعمال

سرسید کی نثر میں انگریزی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں مگر ایسے الفاظ جنہیں اُردو دان طبقہ سمجھتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے مترادفات پہلے سے موجود تھے اور ان میں سے اکثر مانوس بھی تھے۔ بہرحال سرسید نے بے تکلفی کے ساتھ انگریزی الفاظ استعمال کئے۔ مثلاً

سولائیزیشن (CIVILIZATION) کلچر (CULTURE)

سپیچ (SPEECH) وغیرہ۔

۸۔ متروک الفاظ کا استعمال

سرسید کی تحریروں میں متروک الفاظ بھی ملتے ہیں اور الفاظ کی بے ترتیبی بھی جیسے وہ مترجم ہیں۔ وہ "کر کے" کی بجائے "کر کر" اور "جائے" کی بجائے "جاوے" "آئے" کی جگہ "آوے" وغیرہ استعمال کرتے ہیں :

۹۔ جوشِ بیان

سرسید جوشیلی طبع کے مالک تھے۔ انہوں نے جو کام بھی اپنے ذمہ لیا اسے جوش و خروش کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تگ و دو کی۔ ان کے جوش کے اس پہلو کی عکاسی ان کی نثر سے بھی ہوئی اور تقریر سے بھی (جو مطلوبہ شکل میں موجود ہیں) ایسی تحریروں میں خطابت کا رنگ آگیا ہے، تاہم قاری ان کے جوشِ بیان سے گہرا تاثر قبول کرتا ہے، اسے بُرا نہیں سمجھتا۔

۱۰۔ مقصدیت

سرسید کے پیشِ نظر واضح مقاصد تھے۔ انہوں نے انہی مقاصد کو اپنی تحریروں میں بھی پیشِ نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عبارت آرائی کے ذریعے کہیں بھی نثری کمالات نہیں دکھائے اور محض لطفِ بیان کے لئے کچھ نہیں لکھا۔

ذیل میں سرسید احمد خاں کے طرزِ تحریر کی اہم خصوصیات کے حوالے سے حامد حسن قادری کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے:۔

"سرسید کی تحریر میں زبان و محاورہ کی لطافت، بیان کی سادگی و صفائی، استعارہ و تشبیہہ اور دیگر صنائع کا اعتدال و بے ساختگی، بیان کا جوش، طرزِ ادا کی روانی، استدلال کا زور، محاکات و منظر کشی، حسب موقع متانت و ظرافت اس قدر کثرت، صحت اور موزونیت کے ساتھ ہے کہ ان سے پہلے کہیں نہ تھی۔ ان کے ساتھیوں میں ان سے بہتر نہ تھی اور ان کے ہم زمانہ لوگوں میں اکثر انہی کے اتباع کی بدولت تھی۔ سرسید پیچیدہ سیاسی مسائل کے باریک مذہبی نکات اور دشوار اصلاحی مباحث کو نہایت صفائی، سادگی، بے تکلفی اور زورِ قوت کے ساتھ بیان کر سکتے۔ ان کی برجستہ تقریروں اور قلم برداشتہ تحریروں میں بھی وہی انداز پیدا ہوا ہے جو غور و فکر سے لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین میں ہے۔ حسب موقع اسلوب بیان اختیار کرنا، شوخی و سنجیدگی سے برمحل کام لینا، جذب و اثر پیدا کرنا ان کے لئے بالکل فطری اور طبعی بات تھی۔ کسی خاص کوشش و ارادہ کو دخل نہ تھا۔ گویا ان کو خبر بھی نہ ہوتی تھی اور صحیح انداز خود بخود پیدا ہو جاتا تھا۔ جن الفاظ و محاورات کے بولنے کی ان کو عادت تھی بے تکلف ان کو استعمال کر دیتے تھے، یہ خیال

نہیں کرتے تھے۔ کہ اہلِ زبان یا اہلِ دِلّی کیا اور کس طرح بولتے ہیں۔ دینی
علمی، فلسفیانہ، سائنٹیفک، تنقیدی مضامین اس قدر سلجھا کر بیان کرتے تھے
کہ اس فن میں گویا ان کو اوّلیت حاصل تھی۔ ان کی تصانیف میں تاریخ و سیرت،
مذہب و اخلاق، سیاست و حکمت وغیرہ موضوعات شامل تھے۔ ہر جگہ سرسید
کا جوشِ بیان اور زورِ قلم نمایاں ہے انہوں نے اُردو زبان میں ہر قسم کے
مضامین ادا کرنے کی قابلیت ثابت کر دی۔ مزاح ظرافت سرسید کا فطری
رنگ تھا۔ لیکن یہ موقع محل پر صرف ہوتا تھا۔ خصوصاً پرائیویٹ خطوط یا
مخالفوں کے مباحثہ میں اس رنگ کی شوخی نہائیت دلچسپ اور کارگر ہے۔
جذب و اثر پیدا کرنے کے لئے کوئی روحانی قوت ان کے اندر کام کرتی ہوئی
معلوم ہوتی ہے۔"

خلاصہ

سمجھ

عقلمند اور بیوقوف دونوں ہی کی دلی کیفیات میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ دونوں کے دلوں میں بیہودہ اور لغو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ عقلمند بات چیت کے لیے ان میں سے اچھے خیال منتخب کر لیتا ہے اور بیوقوف جو دل میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔ انسانی صفات میں سے سمجھ سب سے عمدہ صفت ہے اور دانا اس سے گوناگوں فائدہ اٹھاتا ہے۔ بسطلی صاحب کا قول ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرو کہ وہ دوست بن جائے اور دوست سے ایسا برتاؤ کرنا چاہیئے کہ کسی وقت وہ دشمن بھی بن جائے تو نقصان نہ پہنچا سکے۔ ان کی پہلی بات تو درست ہے۔ لیکن دوسری بات مکاری کی ذیل میں آسکتی ہے اگر ایسا ہو تو پھر انسان کبھی بھی اپنے دل کی بات کسی دوست سے نہیں کہہ سکتا۔

عقل و شعور جسے دوسرے لفظوں میں سمجھ کہا جاتا ہے۔ انسانی صفات میں سب سے افضل ہے کیونکہ یہ ہمارے کاموں کی رہنمائی میں خدا کی نائب ہے۔ اس کے بل بوتے پر انسان دیگر صفات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کے بغیر علم و عقل بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ سمجھ کے بغیر ایک لائق آدمی بھی اس اندھے کی مانند ہے جس کے پاس زور و قوت تو ہو مگر اس سے کام نہ لے سکتا ہو۔ "سمجھ اور مکر" میں بھی نمایاں فرق ہے۔ "سمجھ" نیکی اور "مکر" خود غرضی پیدا کرتا ہے۔ "سمجھ" ایک روشن اور دور بین آنکھ کی مانند ہے جو دور دور کی چیزیں بھی دیکھ لیتی ہے جبکہ "مکر" کوتاہ بین آنکھ کی مانند ہے جسے قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں۔ سمجھ ایک دلکش چیز ہے جبکہ "مکر" اس کے برعکس اس کی بگڑی ہوئی نقل ہے۔ سمجھ دنیا اور آخرت دونوں کے لیے مفید ہے۔ اس سے اچھائی اور برائی کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک مصنف کے بقول سمجھ ایک ایسی لازوال چیز ہے جس کا حصول بہت آسان ہے یعنی اس کی تلاش نہیں کرنی پڑتی بلکہ یہ خود بخود ایسے دانا اور عقلمند کے پاس پہنچ جاتی ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہو۔ لیکن افسوس کہ ہماری قوم کے پاس سوائے "سمجھ" کے سب کچھ موجود ہے، جبکہ اس کے بغیر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تہی دست ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۲۶:- لغو / بے معنی / بے ہودہ ، فضول / وسوسے ، اندیشے / بے تردد ، بے سوچے سمجھے / کسی فکر کے بغیر۔

صفحہ نمبر ۲۷:- قادر مطلق ، پورے اختیار رکھنے والی ذات / خصلتیں ، عادتیں / موافق ، مطابق /

صفحہ نمبر ۲۸:- وبال ، مصیبت / منتہائے خوبی ، خوبیوں کی انتہا / معراج ۔ عروج / کوتاہ نظر ۔ تنگ نظر / ناچیز ، غیر اہم ، معمولی / نفس الامر ، اصل مدعا

صفحہ نمبر ۲۹:- عاقبت ، انجام /

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسانوں کے دلوں کو چیر کر اُن کا حال دیکھا جاوے تو دانا اور نادان دونوں کے دلوں میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق نکلے گا۔ دونوں کے دلوں میں ہمیشہ بہت سے لغو اور بے ہودہ خیال آتے ہیں۔ بے شمار وسوسے دونوں کے دلوں میں اُٹھتے ہیں مگر ان دونوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ دانا آدمی ان میں سے انتخاب کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کون سے خیالات ایسے ہیں جن کو گفتگو میں لانا چاہیئے اور کون سے ایسے ہیں جن کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ نادان آدمی ایسا نہیں کرتا اور جو خیال اس کے دل میں آتا ہے بے سوچے سمجھے منہ سے بکتا جاتا ہے۔ دانش مند آدمی بھی دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں نادان کی مانند ہوتا ہے جو اس کے دل میں آتا ہے بے تردد دوست سے کہتا ہے۔ گویا اس کو خیالات ہی ایک بلند آواز میں آتے ہیں۔

حوالہ متن:- یہ عبارت سر سید احمد خاں کے مضمون " سمجھ " سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق :۔ اس سبق میں سرسید نے سمجھ کی اہمیت بیان کی ہے۔

تشریح :۔ میرے خیال میں اگر تمام انسانوں کے دل چیریں اور ان کا حال معلوم کریں تو عقل مند اور بے وقوف دونوں کے دل قریب قریب ایک جیسے ہی نکلیں۔ دونوں ہی کے دلوں میں ہمیشہ بے معنی اور فضول قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں اور قسم قسم کے اندیشے اُٹھتے رہتے ہیں۔ مگر عقلمند اور بے وقوف میں فرق یہ ہے کہ عقلمند آدمی ان خیالات میں سے اچھے بُرے کی تمیز کرنے کے بعد طے کرتا ہے کہ کون سے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے اور کون سے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس بے وقوف آدمی ایسا نہیں کرتا۔ اس کے دل میں جو خیال بھی آتا ہے وہ بے ساختہ اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے عقلمند آدمی بھی بے وقوف ہی کی طرح ہوتا ہے یعنی ان کے ساتھ وہ بھی ہر بات بے سوچے سمجھے کر لیتا ہے۔

(۲)

پیٹلی صاحب کا یہ قول ہے کہ "انسان کو دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ اس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح کا برتاؤ کرنا چاہیئے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اُس کے ضرر سے بچنے کی جگہ رہے۔" اس قول کی پہلی بات جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کی ہے وہ نہایت عمدہ ہے مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ کی ہے وہ کچھ اچھی نہیں۔ اس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں ہے بلکہ نری مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بعضی دفعہ دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دنیا انہی کو دغاباز اور بُرا کہتی ہے اور دوست پر بھروسا کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتی۔ ہاں البتہ دوستوں کو منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیئے۔

حوالۂ متن :۔ یہ اقتباس سرسید احمد خاں کے مضمون "سمجھ" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق :۔ اس سبق میں سرسید نے سمجھ کی اہمیت بتائی ہے اور سمجھ کے حوالے سے

عقلمند اور بے وقوف میں فرق اور مماثلت واضح کی ہے۔
تشریح :- پیٹلی صاحب کا کہنا ہے کہ انسان کو اپنے دشمن کے ساتھ ایسا رویہ رکھنا چاہیئے کہ اُس کے دوست بننے کے مواقع موجود رہیں اور دوست سے ایسا رویہ رکھنا چاہیئے کہ اگر کبھی دشمن بھی بن جائے تو اس کے نقصان سے بچنے کی گنجائش موجود رہے —— میں دشمن کے حوالے سے کی گئی پہلی بات کو بہت اچھا کہتا ہوں مگر دوسری بات جو دوست کے حوالے سے ہے اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ اس میں سمجھ کی تو کوئی بات نہ ہوئی، یہ تو سراسر دھوکہ ہے۔ اس طرح کا برتاؤ کرنے والا آدمی زندگی میں بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے جو اپنے دلی دوستوں سے دل کی بات کہہ لینے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بعض اوقات دوست دشمن بھی بن جاتے ہیں اور دوست کے راز کو فاش کر دیتے ہیں مگر لوگ انہی کو مکار اور فریبی کہتے ہیں، بھروسا کرنے والے دوست کو تو بیوقوف نہیں کہتے —— ہاں —— یہ بات ضرور ہے کہ دوست منتخب کرنے میں سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔

(۳)

سمجھ صرف باتوں ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی متعلق ہے اور گویا ہماری زندگی میں ہمارے تمام کاموں کی رہنما اور ہمارے لئے ہمارے قادر مطلق خدا کی نائب ہے۔ انسان میں بہت سی بڑی بڑی عمدہ عمدہ صفتیں ہیں مگر سمجھ سب سے زیادہ مفید ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے اور تمام صفتوں کی قدر ہوتی ہے۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ تمام صفتیں اپنے اپنے موقع پر کام آتی ہیں۔ سمجھ ہی کے سبب سے وہ شخص جس میں وہ صفتیں ہیں اُن صفتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سمجھ بغیر، علم اور عقل دونوں ناچیز ہیں۔ بھلائی، برائی دکھائی دیتی ہے۔ باوجودیکہ انسان میں نہایت عمدہ عمدہ خصلتیں ہوتی ہیں مگر سمجھ بغیر، ان کے برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہے اور نقصان پر نقصان اٹھاتا ہے۔ سمجھ ہونے سے صرف انہی خوبیوں کا جو اس میں ہیں مالک نہیں ہوتا بلکہ دوسروں میں جو خوبیاں ہیں ان کا بھی مالک بن جاتا ہے۔

سمجھ دار آدمی جس سے گفتگو کرتا ہے اس کی لیاقت کو بھی جان لیتا ہے اور اسی کی لیاقت کے موافق گفتگو کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کے مختلف فرقوں اور گروہوں اور جماعتوں کی مجلسوں کے حالات پر غور کریں تو ہم کو صاف معلوم ہوگا کہ ہر ایک مجلس میں نہ کسی عقلمند کی گفتگو کو غلبہ ہوتا ہے اور نہ کسی بہادر اور دلیر کی گفتگو کو بلکہ اسی شخص کی گفتگو سب پر غالب رہتی ہے جس کو سمجھ ہے اور جو اہلِ مجلس کی لیاقتوں کو اور جو بات کہنی ہے اور جو نہ کہنی ہے اس میں تمیز کر سکتا ہے۔ جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو پر سمجھ نہ ہو وہ ایک نہائت قوی اور زبردست پر اندھے کی مانند ہے جو بسبب اپنے اندھے پن کے اپنے زور و قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا ہے۔ گو ایسے شخص کو دنیا میں اور سب طرح کے کمال حاصل ہوں مگر سمجھ نہ ہو تو وہ دنیا میں کسی کام کا نہیں۔ برخلاف اس کے اگر اس کی سمجھ پوری ہو اور صرف اسی ایک صفت میں اس کو کمال ہو اور باقی اوصاف متوسط درجے کے رکھتا ہو تو وہ اپنی زندگی میں جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔

حوالۂ متن: یہ عبارت سر سید احمد خاں کے مضمون "سمجھ" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق: اس مضمون میں سر سید سمجھ کی اہمیت اور سمجھ کے حوالے عقلمند اور بیوقوف کے رویے پر بحث کرتے ہیں۔

تشریح: سمجھ کا تعلق صرف باتوں ہی سے نہیں بلکہ ہر قسم کے کاموں سے بھی ہے۔ گویا سمجھ ہماری زندگی کے تمام کاموں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اور خداوند کریم، جو ہر چیز پر قادر ہے، کی نمائندگی کرتی ہے۔ انسان میں بڑے بڑے اوصاف موجود ہیں مگر سمجھ ان سب میں سے زیادہ فائدہ بخش ہے بلکہ اور اوصاف کی قدر بھی سمجھ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ اوصاف سمجھ ہی کی وجہ سے اپنے اپنے موقعہ پر فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ سمجھ نہ ہو تو علم اور عقل دونوں ہی بے کار ہیں۔ اس صورت میں بھلائی کے نتیجے میں بُرائی ملتی ہے اور انسان اپنے رویے میں ایسی ایسی غلطیاں کر جاتا ہے کہ اپنے اعلیٰ اوصاف کے باوجود فائدے کی بجائے نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر انسان میں سمجھ ہو تو وہ اپنی خوبیوں کے علاوہ دوسروں کی

خوبیوں کا بھی مالک بن جاتا ہے کیونکہ وہ بات کرتے ہوئے دوسرے کی قابلیت کا اندازہ لگا لیتا ہے اور اسی کے مطابق بات کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کے مختلف گروہوں جماعتوں اور فرقوں کی مجلسوں کے حال پر غور کریں تو ہمیں صاف پتہ چل جائے گا کہ ہر مجلس میں نہ عقلمند آدمی کی بات غالب آتی ہے نہ ہی بہادر اور دلیر آدمی کی، بلکہ اس کی بات غالب رہتی ہے جو سمجھ کا مالک ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسروں میں کتنی قابلیت ہے اور کون سی بات ان سے کہنی ہے اور کون سی نہیں کہنی۔ سمجھ سے خالی بڑے سے بڑا لائق بھی طاقتور اندھے کی طرح ہے جو اندھا ہونے کی وجہ سے اپنی طاقت کو مصرف میں نہیں لا سکتا۔ ایسا شخص دنیا میں ہر طرح کی ترقی کر جانے کے باوجود کسی کام کا نہیں۔ اس کے برعکس صرف ایک صفت یعنی سمجھ کا مالک آدمی دوسرے اوسط درجے کے اوصاف کے باوجود زندگی میں جو چاہے کر سکتا ہے۔

(۴)

سمجھ جس طرح کہ انسان کے لئے بہت بڑا کمال ہے اُسی طرح مکر، اس کے حق میں بہت بڑا وبال ہے۔ نیک دل کی منتہائے خوبی سمجھ ہے اور بد دل کی منتہائے بدی مکر۔ یا یوں کہو کہ وہ نیک دل کے لئے معراج ہے اور یہ بد دل کے لئے کمال۔ سمجھ، نہایت عمدہ اور نیک مقصد پیدا کرتی ہے اور ان کے حاصل ہونے کو نہایت عمدہ عمدہ اور تعریف کے قابل ذریعے قائم کرتی ہے۔ مگر مکر میں صرف خود غرضی ہوتی ہے۔ سمجھ، مثل ایک روشن آنکھ کے ہے جس میں بے انتہا وسعت ہے اور تمام دنیا کو اور دور دور کی چیزوں کو آسمانوں کو اور آسمانوں کے ستاروں کو بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ مکر، مثل ایک کوتاہ نظر آنکھ کے ہے جو پاس پاس کی ناچیز چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اور دور کی چیزیں، گو وہ کیسی ہی عمدہ اور روشن ہوں، اسے نظر نہیں آتیں۔
سمجھ جس قدر ہوتی ہے اسی قدر انسان کا اختیار اور اعتبار بڑھتا جاتا ہے۔ مکر، کاٹ کی ہنڈیا کی مانند ہے کہ جب ایک دفعہ کھل گیا تو پھر اس کی قوت اور عزت بالکل جاتی رہتی ہے، پھر انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سر سید احمد خاں کے مضمون "سمجھ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں سر سید سمجھ کی اہمیت اور سمجھ کے حوالے سے عقلمند اور بے وقوف کے طرزِ عمل پر بحث کرتے ہیں اور بتاتے ہیں سمجھ کا غلط استعمال سمجھ کو مکر میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔

تشریح:۔ جس طرح سمجھ انسان کے لئے بہت بڑی خوبی ہے، اسی طرح مکر انسان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ نیک دل کا عروج و کمال سمجھ ہے جبکہ بد دل کا عروج و کمال مکر ہے۔ سمجھ اچھے اور نیک مقاصد کو جنم دیتی ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے اچھے اچھے اور قابلِ تعریف ذرائع فراہم کرتی ہے۔ لیکن مکر سراسر خود غرضی ہے۔ سمجھ کی مثال اس روشن آنکھ کی ہے جو بڑی وسعت کی مالک ہو اور دور دراز کی چیزوں کو بھی دیکھ سکتی ہو، جیسے آسمان اور ستارے بھی اچھی طرح نظر آتے ہوں۔ اس کے برعکس مکر کی مثال ایسی آنکھ کی ہے جو تنگ نظر ہو، جسے آس پاس کی معمولی معمولی چیزیں تو دکھائی دیتی ہوں مگر دور کی اعلیٰ اور چمکدار چیزیں بھی دکھائی نہ دیتی ہوں۔ جتنی کسی آدمی میں سمجھ ہو، وہ اتنا ہی با اختیار اور با اعتبار ہوتا جاتا ہے۔ مکر تو لکڑی کی ہنڈیا ہے جو صرف ایک بار ہی چڑھ سکتی ہے۔ پھر جل جاتی ہے اور ناکارہ ہو جاتی ہے۔ مکر کا راز بھی ایک بار فاش ہوتا ہے تو انسان کی ساری عزت و آبرو یوں ضائع ہوتی ہے کہ وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

(۵)

سمجھ والے آدمی کی طبیعت ہمیشہ زمانۂ حال اور مستقبل دونوں پر لگی رہتی ہے۔ جو باتیں کہ زمانۂ دراز کے بعد ہونے والی ہیں اور جو اب ہو رہی ہیں دونوں کو دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ نہایت غور و فکر سے ان خوشیوں کے ہاتھ آنے کے لئے کوشش کرتا ہے جو قدرت نے اس کے لئے بنائی ہیں اور جن کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خیال کو ہر کام کے انجام تک دوڑاتا ہے اور اس کے حال و مآل کے نتیجوں پر غور کرتا ہے اور اس فانی دنیا کے تھوڑے سے نفع اور فائدے کو اگر درحقیقت وہ نفع اور فائدہ اس کی سچی عاقبت کے خیال کے مخالف ہو، چھوڑ دیتا ہے۔ غرض کہ

اس کی تمام تدبیریں عمدہ ہوتی ہیں۔ اس کا رویہ ایسے شخص کی مانند ہوتا ہے جو اپنا فائدہ بھی سمجھتا ہے اور اس کے حاصل کرنے کا مناسب طریقہ بھی جانتا ہے۔"

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سر سید احمد خاں کے مضمون "سمجھ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں سر سیّد سمجھ کی اہمیت اور سمجھ کے حوالے سے عقلمند اور بے وقوف کے طرزِ عمل پر بحث کرتے ہیں۔

تشریح:۔ جو شخص سمجھ کا مالک ہے، اس کی طبیعت ہمیشہ موجودہ زمانے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کی طرف بھی لگی رہتی ہے۔ وہ صرف اب ہونے والی باتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ ان باتوں کو بھی دھیان میں رکھتا ہے جو بہت عرصے کے بعد ہونے والی ہیں۔ اسی لئے وہ ان خوشیوں کے حصول کے لئے جو خداوند کریم نے اس کے لئے بنائی ہیں اور جن کے لئے خود اسے پیدا کیا ہے، بہت سوچ سمجھ کر کوشش کرتا ہے۔ وہ ہر کام کے انجام پر بھی نظر ڈالتا ہے اور اس کے حال اور انجام کے نتیجوں پر بھی توجہ دیتا ہے۔ اگر اسے محسوس ہو کہ فنا ہو جانے والی اس دنیا کے تھوڑے سے فائدے کا حصول، دوسری یعنی عاقبت کی زندگی کے حوالے سے نقصان دہ ہے، تو وہ اس فائدے سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کی تمام کوشش بہتر ہوتی ہیں اور اس کا عام رویہ ایسے شخص کی طرح ہوتا ہے جو اپنے فائدے کو بھی سمجھتا ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ اس فائدے کے حاصل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔

سر سیّد کی علمی و ادبی خدمات

سر سیّد کی علمی و ادبی خدمات کثیر بھی ہیں اور اہم بھی —— انہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم، مغرب کی ترقی اور صحت مند خیالات سے آگاہ کرنے کے لئے ۱۸۶۲ء میں غازی آباد میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ ہر نوع کی علمی کتابوں کو مغربی زبانوں سے اردو میں منتقل کیا جائے۔ ایک مدرسہ بھی قائم کیا اور انگریزی تعلیم اور جدید علوم کی اہمیت کے حوالے سے تقریریں بھی کیں۔ بعد میں ۱۹۶۴ء

میں وہ سائٹی کا دفتر علی گڑھ منتقل ہوگیا جہاں سے ۱۸۶۶ء میں وہ سائنٹفک سوسائٹی،،
کا ترجمان رسالہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ،، جاری کیا جواب " علی گڑھ یونیورسٹی گزٹ،، کہلاتا
ہے۔

۱۸۶۹ء میں سرسید احمد کے بیٹے تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو سرسید بھی اُن کے
ہمراہ گئے تا کہ وہاں کے تعلیمی طور طریقوں کا خود مطالعہ کر سکیں اور وہ کچھ سیکھ کر آئیں جس
سے ان کی قوم اور ملک کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں۔ وہاں انہوں نے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا
اور آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹی قائم کرنے کا عہد کیا (جو بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی
کی شکل میں ظاہر ہوا ۔) قیام انگلستان کے دوران انہوں نے چند ایک مذہبی کتابیں
بھی تصنیف کیں۔ واپس آکر علی گڑھ سکول کی بنیاد رکھی جو سکول سے کالج اور کالج سے
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اور اصلاحی
پروگرام کی اشاعت کے لئے انہوں نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق،، جاری کیا۔
جس میں سرسید کے علاوہ ان کے نامور رفقاء کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس
رسالے نے ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔

۱۸۷۶ء میں ملازمت چھوڑ کر سرسید اس کالج کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔
سرسید کی کوشش اور لگن کی وجہ سے ہندوستان کے علم دوست لوگوں نے ان کی مدد
کی۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، وحید الدین سلیم، مولوی چراغ علی
وغیرہ نے سرسید کو ان کے مقصد میں کامیاب کرنے میں عملی حصّہ لیا۔ ان لوگوں نے متعدد
مضامین اور کتابیں لکھ کر مسلمانوں کے اذہان کو بیدار کیا۔ سرسید احمد خاں نے تقریباً
بائیس سال جوان کی عمر اور تجربے کا نچوڑ تھے۔ ملک و قوم کی خدمت میں صرف کئے۔

سرسید احمد خاں بے شمار تصانیف اور مضامین کے مصنّف ہیں۔ یہاں ان کی اہم
تر تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جامِ جم :-

فارسی رسالہ ہے جو ۱۸۳۹ء میں چھپا۔ اس میں امیر تیمور صاحب قِران سے
لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے بادشاہوں کا مختصر حال ہے۔

تسہیل فی جرالثقیل:

اصل کتاب عربی میں ابوذر یمنی کی تصنیف تھی۔ جسے بوعلی نے فارسی میں ترجمہ کیا، اور معیار العقول کا نام دیا۔ ۱۸۴۴ء میں سر سید نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کی صورت میں پیش کیا جس میں جرِ ثقیل کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔

آثار الصنادید:

۱۸۴۷ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سر سید نے ان دنوں تصنیف کی جب وہ فتح پور سے تبدیل ہو کر دہلی آئے تھے۔ اس میں انہوں نے دہلی کی عمارات کا حال درج کیا ہے اور اس کے علاوہ دلی کے اکابر، علماء، اطباء، شیوخ کے حالات بیان کئے ہیں۔ دلی کی عمارتوں کی تصویریں اور نقشے بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ پہلے ایڈیشن کا اسلوبِ بیان مشکل ہے مگر دوسرے یعنی ۱۸۵۲ء والے ایڈیشن کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔

کلمتہ الحق:

یہ رسالہ ہے جس میں پیری مریدی کے طریقوں کی مخالفت کی گئی ہے۔

فوائد الافکار:

یہ سر سید احمد خاں کے نانا خواجہ فرید الدین احمد کی فارسی تحریروں کا اردو ترجمہ ہے۔ جو انہوں نے انگریز عالموں کی فرمائش پر کیا۔

کیمیائے سعادت:

امام غزالیؒ کے چند اوراق کا ترجمہ ہے جو ۱۸۵۳ء میں چھپا۔

تاریخ بجنور:

جب سر سید صدر امین ہو کر دہلی سے بجنور گئے تھے تو وہاں انہوں نے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی تھی جو کہ غدر کے زمانہ میں گم ہو گئی تھی۔ اس کا سال تصنیف ۱۸۵۵ء ہے۔

تاریخ سرکشی بجنور:

اس میں اپریل ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے واقعات درج ہیں۔

سرسید نے یہ واقعات بجنور میں جمع کئے تھے اور انہیں مراد آباد میں شائع کیا تھا۔

آئینِ اکبری:

اکبر کے عہد کی نہایت اہم تاریخ ہے۔ اس کی تین جلدیں تھیں لیکن ایک جلد غدر کے زمانے میں گم ہو گئی تھی۔

اسبابِ بغاوتِ ہند:

یہ ایک رسالہ ہے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کا ذکر ہے۔ اور بغاوتِ ہند کے اسباب پر بحث کی گئی ہے اور مسلمانوں کو ان الزامات سے بری قرار دیا ہے جو انگریزوں نے ان پر لگائے تھے۔ اس کا انگریزی ترجمہ کرنل گراہم نے کیا تھا۔

تبیین الکلام:

۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ توریت اور انجیل کی تفسیر ہے۔

سفرنامہ لندن:

سرسید احمد خاں نے انگلستان سے واپس آکر اپنے سفرِ انگلستان کے مشاہدات و تاثرات بیان کئے ہیں۔ اس کی کچھ قسطیں سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئیں۔

خطباتِ احمدیہ:

یہ کتاب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی۔ اس میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ہر عیب سے مبرّا قرار دیا ہے پوری کتاب بارہ مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سید صاحب کی تحقیق و جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ پہلے لندن میں انگریزی میں لکھی اور بعد میں واپس آکر اردو میں ترجمہ کیا۔

تفسیر القرآن:

سرسید احمد خاں کا نظریہ تھا کہ اسلام ایک ایسا مذہب تھا۔ جو فطرت کے عین مطابق ہے سرسید کے چند ایک نظریات سے بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ اس لئے وہ ان کی مخالفت کرتے تھے۔ سرسید نے معراجِ جسمانی، سود، جہاد، تعدّدِ ازدواج، آدم اور ابلیس کی کہانی، ملائکہ اور جنات، مسیح کی وفات، رویتِ باری وغیرہ کے مسائل

پر اختلاف کیا ہے۔ سرسید کی یہ تصنیف بھی دوسری دینی تصانیف کی طرح مقبول نہ ہو سکی۔

تہذیب الاخلاق:

سرسید نے یہ رسالہ انگریزی کے مشہور رسائل سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے انداز پر نکالا تھا۔ جن کے ایڈیٹر مشہور ادیب اڈیسن اور سٹیل تھے۔ یہ دونوں پرچے شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق سے علمی، ادبی اور اسلامی کام لیا۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید ولائیت گئے۔ تو وہاں انہوں نے تہذیب کے علم برداروں سے بہت کچھ سیکھا۔ اور ایڈیسن اور سٹیل کے رسائل سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کی طرز پر ایک رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ رسالے کا سرورق لندن ہی میں تیار ہوا۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ منظر عام پر آیا۔ اس کا مقصد قدیم رسوم کے خلاف آواز بلند کرنا اور ہندوستانی معاشرت کی برائیوں...... کو دور کرنا تھا۔ اس رسالے میں ہندوستان کے بڑے بڑے صاحبِ علم لوگوں نے عملی حصّہ لیا۔ جن میں سرسید، محسن الملک، حالی، وقار الملک، شبلی، چراغ علی، سید محمود، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

محمد حسین آزاد

کچھ مذہب کے بارے میں

سوانحی خاکہ

مولانا محمد حسین آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا محمد باقر تھے جنہوں نے اُردو کا پہلا اخبار "اخبارِ اُردو" جاری کیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم پہلے اپنے والد اور پھر ذوقؔ سے حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لے لیا جہاں آپ کو مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب سے ملنے کا موقعہ میسّر آیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایام میں آپ کو خستہ حالی کی کیفیت میں دہلی سے نکلنا پڑا۔ آپ اپنے اہلِ خاندان سمیت لکھنؤ چلے گئے مگر یہاں بھی بدحالی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ۱۸۶۱ء کے اوائل میں لاہور پہنچے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ فروری ۱۸۶۴ء میں محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ آپ کی تقرری بطور اہلمد ہوئی مگر آپ کی قابلیت سے متاثر ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم نے بعض اُردو اور فارسی کی تصنیف کے فرائض انہیں سونپ دیئے۔ بعد میں آپ کو سرکاری اخبار "اتالیقِ پنجاب" کی مجلسِ ادارت میں لے لیا گیا۔ اخبار بند ہو جانے پر آپ "پنجاب میگزین" کے نائب مدیر مقرر ہو گئے۔ ۱۸۶۵ء میں آپ نے کابل اور بخارا کا سفر کیا۔ ۱۸۸۳ء میں دوسری بار کابل کا سفر اختیار کیا جہاں انہیں جدید فارسی سیکھنے کا موقعہ میسّر آیا۔ ۱۸۶۹ء میں آپ کا تقرر گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ہوا جہاں آپ نے پندرہ سال تک عربی اور فارسی کی تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں آپ یونیورسٹی اورنٹیل کالج سے منسلک ہو گئے۔ ۱۸۸۷ء میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ آخری عمر بڑی خستہ حالی میں گزاری۔ ۱۸۸۹ء میں آپ کی انتہائی چہیتی بیٹی فوت ہو گئی تو اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے جس کے باعث جنون کی کیفیت طاری ہو گئی جو زندگی بھر رہی۔ آپ کی وفات

لاہور میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو ہوئی۔

آپ کی اہم تصانیف یہ ہیں:

(۱) آبِ حیات (۲) نیرنگِ خیال (۳) سخندانِ فارس (۴) دربارِ اکبری۔
(۵) قصصِ ہند (۶) دربارِ اکبری (۷) نگارستانِ فارس۔

محمد حسین آزاد کے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ رنگینیٔ بیان آزاد کی نثر میں سادگی اور سلاست کی بجائے رنگینیٔ بیان ملتی ہے اور مخصوص شعری فضا پائی جاتی ہے۔ یوں انہوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ آبِ حیات، کے بہت سے بیانات قابلِ انحصار نہیں مگر رنگینیٔ بیان کی بنیاد پر یہ کتاب اپنے اندر ایک خاص دلکشی رکھتی ہے۔

۲۔ الفاظ و محاورات پر عبور آزاد کو الفاظ و محاورات پر پورا عبور حاصل ہے۔ الفاظ و محاورات پر عبور کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے حسنِ انتخاب کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ انہوں نے الفاظ و محاورات کا انتخاب بڑی ذہانت اور ان کا استعمال بڑی مہارت سے کیا ہے۔ جس سے عبارت کی روانی میں بھی اضافہ ہوا ہے اور معنی آفرینی میں بھی۔

۳۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال نثر کو رنگین اور دلچسپ بنانے کے لئے آزاد نے تشبیہات و استعارات کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال ایسا برجستہ اور برمحل ہے کہ تحریر میں لطف پیدا کرتا ہے اور کہیں بھی کھٹکتا نہیں۔

۴۔ صنعتوں کا استعمال نثر میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے آزاد نے صنعتوں کا استعمال بھی کثرت کے ساتھ کیا ہے۔ انہیں صنعتوں کے انتخاب و استعمال پر پورا عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صنعتوں کا استعمال بڑی مہارت سے کیا ہے جس سے نثر میں شعریت کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

۵۔ مشاہدے کی گہرائی آزاد کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ یہ مشاہدہ ان کی تحریر میں بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اشیاء کی تصویر کشی اس عمدگی

سے کی ہے کہ وہ مجسّم صورت میں ہمارے سامنے آموجود ہوتی ہیں۔ وہ "سخندانِ فارس" میں جہاں جہاں انہوں نے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں یا اشیاء کا تذکرہ کیا ہے، ان کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے یہ واقعات ہمارے سامنے ہی رونما ہوئے اور یہ اشیاء ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نثرِ آزاد کا یہ پہلو قاری کو بہت متاثر کرتا ہے۔

۶۔ تجسیم کا عمل آزاد بسا اوقات بے جان اشیاء کی تجسیم (PERSONIFICATION) کر کے انہیں زندہ صورت میں پیش کر دیتے ہیں مثلاً اُردو زبان کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہجہان کے عہد میں پیدا ہُوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکا۔"

ایسی ہی اور بھی بے شمار مثالیں ان کے ہاں موجود ہیں جن سے تحریر میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ ڈرامائیت آزاد اپنی تحریروں میں جگہ جگہ ڈرامائیت بھی پیدا کرتے ہیں۔ ڈرامائیت کے مقصد کے پیشِ نظر وہ واقعات وحقائق میں تبدیلیاں بھی کر لیتے ہیں جس سے اگرچہ تاریخی حیثیت تو متاثر ہوتی ہے مگر تحریر میں دلچسپی اور رنگینی کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔

۸۔ ترجمہ آزاد نے بہت تراجم بھی کئے لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ جہاں ترجمہ کیا ہے وہاں بھی اُن کی مہارت کے سبب ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً نیرنگِ خیال کے کئی مضامین ترجمہ ہیں۔ مگر وہ طبع زاد لگتے ہیں۔

۹۔ محدود طرزِ بیان اگرچہ آزاد کے اسلوب میں رنگینئ بیان ایک خاص وصف ہے لیکن یہی وصف ان کی خامی بھی بن جاتا ہے کیونکہ تنقید، تاریخ، تحقیق، ہر میدان میں ان کا قلم ایک سے جوہر دکھاتا ہے۔ حالانکہ موضوعات کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں جن سے سر سیّد حالی اور شبلی واقف تھے۔ آزاد کے اس وصف یا خامی نے ان کے ہاں یکسانیت پیدا کر دی ہے جو اگرچہ قاری کو تھکاتی تو نہیں مگر بسا اوقات موضوع کے لحاظ سے نامناسب ہوتی ہے۔

آزاد کے طرزِ تحریر کے بارے میں چند آراء دی جاتی ہیں:-

۱۔ "الفاظ کا انتخاب اور زبان کی شیرینی، محاورات کی صحت اور جابجا تشبیہ اور اس کی گلکاری سے عبارت میں وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے کہ پڑھتے چلے جائیے سیری نہیں ہوتی۔" ——— ڈاکٹر اعجاز حسین

۲۔ "ادھر اُدھر کی کہیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے" ——— شبلی

۳۔ "اگرچہ آزاد کی زبان کو صنائع و بدائع کی دستکاری نے قلم لگایا ہے پھر بھی منہ سے پھول جھڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ آزاد کے فقرے گلستانِ سعدی کے فقروں کی طرح تقریروں اور تحریروں کو قوت نہیں دیتے تاہم ان کے پڑھنے میں زبان کو نظم کا چٹخارہ ملتا ہے۔ یہی وصف طرزِ آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اور بالکل انفرادی شان ہے جس میں کوئی دوسرا مصنف ان کا شریک نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، تشبیہ و استعارہ کی لطافت و برجستگی، بیان کی سلاست و روانی، الفاظ کی شیرینی اور موسیقیت، سب مل کر سادگی و پرکاری کا عجیب و نادر نمونہ پیش کرتے ہیں اور یہ اسلوب علامہ آزاد کی ہر تحریر میں موجود ہے۔ اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں کہ بظاہر بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن لکھ کر دیکھئے تو صفحہ دو صفحے لکھنے مشکل ہیں۔ آزاد اِسی اسلوب کے سبب سے صاحبِ طرز کہلاتے ہیں۔"

——— حامد حسن قادری

خلاصہ

کچھ مذہب کے بارے میں

اس مضمون میں محمد حسین آزاد مذہبی فرقہ بندیوں کی مذمت کرتے ہوئے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے بارے میں میرے خیالات سے ممکن ہے کہ دوستوں کو اختلاف ہو۔ مگر جب اسلام ایک، خُدا ایک، اور پیغمبر ایک تو فرقہ بندی کیوں۔ یہ ایک مذہبی فرقہ بندیاں یعنی شیعہ سنی کا اختلاف تیرہ سو سال قبل کے منصب خلافت پر ہے۔ ہر فرقہ سے متعلق لوگ اپنے اپنے حق کی بات کہتے ہیں۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ اب جب کہ لینے اور دینے والے دونوں ہی دنیا میں موجود نہیں تو پھر اس جھگڑے کو بلاوجہ طول دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بدگوئی و بدکلامی کرنا اور جاہلوں کی طرح لڑنا کہاں کی عقل مندی، تہذیب اور حسنِ اخلاق ہے۔ معمولی سی بات پر سالہا سال پہلے کی بات پر جھگڑے سے متعلق کوئی ایسی بات جس سے دوسرے بھائی کو دکھ پہنچے اس کی دل شکنی ہو اور پھر لاکھوں کا خون بہہ جائے کہاں کی دانش مندی ہے۔ جس جھگڑے پر گردشِ زمانہ نے ڈھیروں مٹی ڈال دی ہو اس کو دوبارہ اکھیڑنے کا کیا فائدہ ہے؟ بدقسمتی کی بات تھی کہ تاریخ اسلام میں یہ سانحہ درج ہونا تھا سو ہو گیا۔ تم تیرہ سو سال کے حق کے لیے کیوں جھگڑتے ہو اور ملک میں بدامنی اور انتشار کا باعث کیوں بنتے ہو۔ ممکن ہے۔ اس کے جواب میں شیعہ بھائی کہیں کہ جوشِ محبت میں کچھ حرف زبان سے نکل جاتے ہیں۔ یہ کیسا جوشِ محبت ہے کہ جو مصلحت کو نہیں سمجھتا کیا یہی اطاعت اور پیروی ہے۔

محبت تو ایک اتفاقی جذبہ ہے۔ تمہیں ایک چیز اچھی لگتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ دوسرے کو بھی اچھی لگے۔ کیا تم اپنی پسند دوسروں پر ٹھونسنا چاہتے ہو۔ میرے باکمال دوستو! جب بے لیاقت شیطان، صاحبِ لیاقت دشمن کو طاقتور پاتا ہے تو اپنا گروہ بڑا کرنے کے لیے مذہب کا جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ دنیا میں ایسے بہت سے بیوقوف ہیں جو معاملے کو سمجھے بغیر مذہب کے نام پر جوش میں آجاتے ہیں۔ ہم سب لوگ اس دنیا میں مسافر ہیں ہمیں زندگی کے سفر کو ہنسی خوشی طے کرنا چاہیے۔ بصورت دیگر ہمیں تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ زندگی جیسی نعمت مصیبت بن جائے گی۔ ہمیں دُوسرے مذاہب

سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ مثلاً انگریزوں میں یعنی دو فرقے ہیں۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں ہی اپنے اپنے طریقے پر عبادت کرتے ہیں اور مِل جُل کر طریقے ہیں۔ مگر کبھی مذہب کے نام پر آپس میں جھگڑتے نہیں۔ کیا ہم جھگڑنا بند نہیں کر سکتے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۳۰:۔ تلمیذ۔ شاگرد ، اوائل۔ اوّل کی جمع ، ابتداء ، ناگہاں۔ اچانک ، آراستہ۔ سجا ہُوا ، گراں بار۔ بوجھل ، جدِّ مرحوم۔ مرحوم دادا ،

صفحہ نمبر ۳۱:۔ حسنِ اعتقاد۔ عقیدت کی اچھائی ، صدقِ دل سے۔ سچے دل سے ، منصب۔ عہدہ ، سکوت۔ خاموشی ، طرفین۔ دونوں طرفیں ، دونوں فریق ، مذرعۃ الآخرۃ۔ آخرت کی کھیتی ، بدگوئی۔ بدزبانی ، آزردہ۔ افسردہ ، رنجیدہ ، خنک۔ ٹھنڈا ، بھٹیارا۔ نانبائی ، کمینہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

صفحہ نمبر ۳۲:۔ مقتدا۔ پیروی کیا گیا ، پیشوا ، رہنما ، بالعکس۔ برعکس ، اُلٹ ، واجب الرحم۔ قابلِ رحم ، نافہم۔ بے سمجھ ،

صفحہ نمبر ۳۳:۔ رفیق۔ ساتھی ،

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

مذہب کے معاملے میں ایک میرا خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو۔ اسلام ایک ، خدا ایک ، پیغمبر ایک۔ سنی اور شیعہ کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس کے واقعے کو آج کچھ کم تیرہ سو برس گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنہوں نے لیا حق لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ نہیں حق اوروں کا تھا ، ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا ؟

جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے لے کر اس وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں۔ لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں۔ اچھا، جب یہ صورت ہے تو آج تیرہ سو برس کے بعد اس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے، چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے، کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں، دوستیاں ہوں تو دشمنیاں ہو جائیں، دنیا جو مذرعۃ الآخرۃ ہے، اُس کا وقت کارہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا اُلجھے، قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے؟

حوالۂ متن: یہ اقتباس مولانا محمد حسین آزاد کے مضمون "کچھ مذہب کے معاملے میں" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق: آزاد اس مضمون میں شیعہ سُنی اختلافات کے حوالے سے سمجھاتے ہیں کہ آپس کے اختلافات بے معنی ہیں۔

تشریح: مذہب کے سلسلے میں جو رائے میری ہے، ہو سکتا ہے وہ میرے دوستوں کو اچھی نہ لگے۔ ذرا سوچو جب اسلام ایک ہے، خدا ایک ہے، اس کا رسولؐ ایک ہے تو باہمی اختلاف کیوں —— سُنی اور شیعہ فرقوں میں اختلاف صرف خلافت کے عہدے کی ہی بنیاد پر ہے۔ اس واقعے کو گزرے کم و بیش تیرہ سو سال ہو چکے ہیں۔ سُنی بھائی کہتے ہیں کہ جن کا حق تھا انہوں نے لے لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ جن کا حق تھا انہیں نہیں ملا تھا، انہیں مل گیا جن کا حق نہیں تھا —— اگر ان سے سوال کیا جائے کہ اگر ان کا حق تھا تو انہوں نے خود اپنا حق کیوں حاصل نہ کیا، تو کہیں گے کہ وہ چپ رہے، انہوں نے صبر کا مظاہرہ کیا —— اب اِن سے پوچھا جائے کہ کیا اب وہ حق انہیں واپس دلا سکتے ہو —— نہیں، بالکل نہیں —— دونوں ہی فریق اس وقت دنیا میں موجود نہیں، نہ حق دینے والے، نہ حق دلانے والے —— جب صورتِ حال یہ ہے تو تیرہ سو سال کے بعد اس مسئلے کو اتنا بڑھانا کہاں تک جائز ہے کہ قوم میں

بہت بڑا فساد برپا ہو جائے، مجلسوں میں بدمزگی ہونے لگے، چلتے کام رُکنے لگیں، دوست دشمن بننے لگیں، دنیا جو آخرت کی کھیتی ہے مفید کاموں کی بجائے جھگڑوں میں اُلجھ کر رہ جائے اور قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہو کر اسے کمزور کرنے لگے اور نقصانات سے دوچار کرنے لگے ——

(۲)

بہت خوب تم حق پر سہی، لیکن اُنہوں نے سکوت اور صبر کیا، پس اگر اُن کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیاروں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا انسانیت ہے؟ کیا تہذیب ہے؟ کیا حسن خلق ہے؟ تیرہ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اُس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے، اس میں خوبی کیا ہے؟

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس مولانا محمد حسین آزاد کے مضمون "کچھ مذہب کے معاملے میں" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:۔ آزاد اس مضمون میں شیعہ سُنی اختلافات کے حوالے سے بات کر رہے ہیں، اور شیعہ فرقہ کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں۔

تشریح:۔ بہت اچھا، مان لیتے ہیں کہ تم ہی سچے ہو لیکن جب انہوں نے خاموشی اختیار کی اور صبر سے کام لیا، تو تم بھی اگر ان کے سچے پیرو ہو، تو صبر سے کام لو اور خاموشی اختیار کرو۔ زبان سے بُرے کلمات ادا کرنا، بدتمیزی کی باتیں اور کمینوں کی طرح لڑائی جھگڑا کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیا یہ انسانیت ہے؟ کیا یہ تہذیب کی باتیں ہیں؟ کیا اچھا اخلاق اسی کو کہتے ہیں؟ تیرہ سو سال پرانی بات کسی بھائی کے سامنے اس طرح کہہ ڈالنا کہ نہ صرف اس کا دل دُکھے بلکہ وہ بے چارہ جل کر راکھ ہو جائے، کہاں کی بھلائی ہے؟

(۳)

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے؟ ..... ایک اتفاقی پسند ہے۔ تمہیں ایک

شئے بھلی لگتی ہے۔ دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اسی طرح بالعکس۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو چیز تمہیں بھاتی ہے، وہی سب کو بھائے؟ یہ بات کیوں کر چل سکے گی...... ابوالفضل نے ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص تمہارے خلاف رستے پر چلتا ہے یا حق پر ہے یا ناحق پر۔ اگر حق پر ہے تو احسان مند ہو کر پیروی کرو۔ ناحق پر ہے تو یا بے خبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے۔ بے خبر ہے تو اندھا ہے، واجب الرحم ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو۔ جان بوجھ کر چلتا ہے تو ڈرو اور خدا سے پناہ مانگو۔ غصہ کیا اور جھگڑنا کیا؟

حوالۂ متن: یہ عبارت مولانا محمد حسین آزاد کے مضمون "کچھ مذہب کے معاملے میں" سے لیا گیا ہے۔

سیاق وسباق: آزاد اس مضمون میں شیعہ سُنی اختلافات کے حوالے سے سمجھاتے ہیں کہ آپس کے اختلافات بے معنی ہوتے ہیں۔

تشریح: تمہیں معلوم ہی ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ تو اتفاق سے ہو جاتی ہے۔ پسند ناپسند بھی محض اتفاقیہ بات ہے۔ ایک چیز تمہیں اچھی لگتی ہے، دوسرے کو اچھی نہیں لگتی، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک تمہیں اچھی نہیں لگتی، دوسرے کو اچھی لگتی ہے —— کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو شے تمہیں اچھی لگتی ہے، وہی سب کو اچھی لگے۔ یہ بات نبھ سکنے والی نہیں —— ابوالفضل نے ایک جگہ لکھا ہے اور بہت اچھی بات کہی ہے کہ جو شخص تمہارے مخالف رستے پر چل رہا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو، یہ بھی ہو سکتا کہ وہ سچا نہ ہو —— اگر وہ سچا ہے تو اس کے احسان مند ہو جاؤ اور اس کی تقلید کرو۔ اگر وہ سچا نہیں یا وہ جانتا ہی نہیں یا جان بوجھ کر اس راستے پر چل رہا ہے تو بھی اس کی مخالفت نہ کرو کیونکہ اگر وہ جانتا ہی نہیں تو اندھا ہے اور قابلِ رحم ہے، اس کی رہنمائی کرو۔ اگر وہ جان بوجھ کر اس راہ پر چل رہا ہے تو خدا سے ڈرو اور اس سے امان مانگو۔ ناراض ہونے یا جھگڑنے کا کیا مقصد؟

(۴)

میرے باکمال دوستو! میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ اس میں فقط دشمنی ہی نہیں بڑھتی بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو اُس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے اور ان شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم، بے خبر بہت ہیں کہ بات تو نہیں سمجھتے، مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے....

حوالۂ متن: یہ عبارت آزاد کے مضمون "کچھ مذہب کے معاملے میں" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق: آزاد اس مضمون میں شیعہ سُنی اختلاف کے حوالے سے بات کر رہے ہیں اور اسے شیطانی فعل ثابت کر رہے ہیں۔

تشریح: میرے دوستو! تم خود صاحبِ کمال ہو، میں نے اکثر اوقات دیکھا ہے کہ جب کوئی نالائق شیطان اپنے مخالف کی قابلیت کو اپنی طاقت کے مقابلے میں بہت زیادہ سمجھتا ہے یعنی وہ سمجھتا ہے کہ قابل مخالف کو محض اپنی طاقت سے نقصان نہیں پہنچا سکتا تو اپنا گروہ پیدا کرنے کے لئے مذہب کو درمیان میں لے آتا ہے کیونکہ اس سے محض دشمنی ہی نہیں بڑھتی بلکہ لائق مخالف کا اتحاد بھی متاثر ہوتا ہے اور شیطانوں کی نفری بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اپنی بے سمجھی اور بے خبری کی وجہ سے بات کو سمجھتے نہیں مگر مذہب کا نام سنتے ہی بھڑک اُٹھتے ہیں۔

(۵)

ہم سب ایک ہی منزلِ مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گزرگاہ دنیا میں یک جا ہو گئے ہیں۔ رستے کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے، مل جل کر چلو گے، ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھاتے چلو گے، ہمدردی سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی

پیدا کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے، ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے، بدمزہ ہو جائے گی۔

حوالۂ متن: یہ عبارت آزاد کے مضمون "کچھ مذہب کے معاملے میں" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق: آزاد اس مضمون میں شیعہ سنی اختلافات کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ اور سمجھا رہے ہیں کہ اختلاف بالکل بے معنی ہے اور اتفاق سے رہنا زندگی کے لئے ضروری ہے۔

تشریح: ہم سب ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ ہم ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ محض اتفاق کی بات ہے کہ ہم دنیا میں اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا ساتھ ہے ہی کتنا، بس رستے کا ساتھ ہے۔ ایک قافلہ جو چلا جا رہا ہے۔ اگر اتفاق سے رہو گے، ایک دوسرے سے محبت سے پیش آؤ گے، ایک دوسرے سے ہمدردی کرو گے، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاؤ گے تو یہ رستہ خوش خوش طے ہو جائے گا لیکن اگر ایسا نہ کرو گے اور جھگڑنے لگو گے تو نقصان اٹھاؤ گے، خود بھی تکلیف اٹھاؤ گے اور اپنے ساتھیوں کے لئے بھی تکلیف کا سبب بنو گے۔ اس طرح وہی زندگی جو خدا نے مزے سے گزارنے کے لئے عطا کی ہے، بدمزہ ہو کر رہ جائے گی۔

محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات

لاہور میں آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی تائید سے جدید شاعری کا دور شروع کیا۔ اور ایک بزم ادب "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم کی۔ اس میں شاعر طرحی غزلوں کی بجائے مختلف قومی، اخلاقی اور مناظر و حقائق کے موضوعات پر نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ اس کوشش میں حالی بھی ان کے شریک کار تھے۔ آزاد نے مثنوی "زمستان" اور "ابر کرم" اور حالی نے "حب وطن" اور "برکھارت" اسی عہد میں لکھیں۔ ان دنوں جدید نظم گوئی کی بنیاد پڑی۔ ادبی لحاظ سے آزاد و حالی کی یہ بہت بڑی خدمت تھی۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت اور نئی منزل کی طرف گامزن کر دیا۔

محکمۂ تعلیم کی ملازمت کے دوران آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی فرمائش پر اردو ریڈریں، فارسی ریڈریں، قواعد اردو اور قصص ہند مرتب کیں۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور بچوں کی درسیات میں اعلیٰ کتابیں تھیں۔ اس طرح "قند پارسی"، جدید فارسی کے متعلق لکھی۔ یہ بھی ایک

مفید کتاب ہے "نصیحت کا کرن پھول"، اخلاقی اور تعلیمی قصہ ہے جو آزاد نے لڑکیوں کی تدریس کے لئے لکھا۔ یہ کتابیں پنجاب میں ایک طویل عرصہ تک نصاب میں شامل رہیں۔ لیکن اُردو ادب میں آزاد کے کارنامے کچھ اور ہیں۔ ان کی درجِ ذیل کتابیں ان کی ابدی شہرت کا سبب بنیں۔

آبِ حیات:۔ یہ اُردو شاعری کی پہلی تاریخ ہے۔ جو قدیم تذکرہ نگاری کے اور جدید ادبی تاریخ کے درمیان کی کڑی ہے۔ مگر یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ اس کتاب میں آزاد نے وہ تمام تاریخی اور معاشرتی ماحول ازسرِ نو زندہ کر دیا ہے، جس میں اُردو شاعری نے جنم لیا اور عہد بہ عہد فروغ پایا۔ کردار نگاری، منظر کشی، مرقع نگاری، تصویر کشی، معاشرتی فضا کی عکاسی اور افسانوی اسلوبِ بیان، اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انہوں نے پہلی بار شعراء کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا۔ شاعروں کا حسب نسب، شکل و صورت، وضع قطع، حالاتِ زندگی، کچھ اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ ہر عہد کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس میں شاعری کی تاریخ بھی ہے اور شعراء کے کلام پر تنقید بھی۔ ہر شاعر کے کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔

نیرنگِ خیال (دو حصے):۔ یہ ان کے رمزیہ یا تمثیلی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں انہوں نے انگریزی انشا پردازی کا اسلوب اختیار کیا ہے یہاں یا تو انگریز مصنفوں کے مضامین کے ترجمے پیش کر دیئے ہیں یا ان کا چربہ ——— تاہم ان مضامین میں آزاد کا تمثیلی اندازِ بیان بے مثال ہے۔ تمثیل کا مطلب ہے غیر ذی روح چیزوں کو جاندار فرض کر کے ان کے ذریعے کہانی بیان کرنا۔ مثلاً حسن کو خوبصورت عورت فرض کر لینا، عشق کو اندھا جوان اور عقل کو ایک بزرگ اور بوڑھا۔ اس اندازِ بیان کا مقصد اخلاقی و اصلاحی ہوتا ہے۔ تمثیل کے الفاظ گہرے معانی کے حامل ہوتے ہیں اور ظاہر سے زیادہ ان کے باطن میں گہرائی ہوتی ہے۔ نیرنگِ خیال میں آزاد کے تخیل کی بلند پروازی، اندازِ بیان کی دلکشی، صناعی اور رنگینی و رعنائی اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ افسوس کہ یہ اسلوب اُردو میں عام نہ ہو سکا۔

دربارِ اکبری:۔ یہ حقیقت میں اکبرِ اعظم کے عہد کی تاریخ ہے، مگر آزاد مؤرخ سے زیادہ انشاء پرداز اور ادیب تھے۔ انہوں نے اپنے اسلوب اور ادیبانہ مزاج سے اس تاریخ کو افسانہ اور ناول بنا دیا ہے۔ اگرچہ اس میں اکبری عہد کے حالات و واقعات

کا ذکر موجود ہے مگر اندازِ بیان ایک مؤرخ جیسا نہیں ہے۔ انہوں نے حقائق اور تاریخ کے سچے واقعات کو داستان کی طرح دلچسپ اور رنگین بنا دیا ہے۔

سخندانِ فارس و نگارستانِ فارس:۔ سخندانِ فارس میں آزاد نے لسانی مسائل کو چھیڑا ہے۔ اور سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی تعلق پر مفصل بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں ایران کی آب و ہوا اور تہذیب و معاشرت نے وہاں کی شاعری اور نثر پر جو اثرات ڈالے ہیں، ان کی تفصیل لکھی ہے۔ نگارستانِ فارس، ایران اور ہندوستان کے فارسی شاعروں کا تذکرہ ہے جس میں ان کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام درج ہیں۔

دیوانِ ذوق:۔ غدر کے زمانے میں اپنے استاد ذوق کا کلام دہلی سے اٹھا کر ساتھ لے آئے اور اسے شائع کیا لیکن اس میں جا بجا اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی۔ اس میں ذوق کے حالات بھی ہیں اور تشریحات بھی۔

نظمِ آزاد:۔ یہ اُن کی قومی و ملی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتابیں تو ان کی زندگی میں چھپ گیئں۔ مگر ان کی وفات کے بعد بھی ان کے وارثوں نے ان کے مسودوں سے کئی کتابیں شائع کیں۔ ان کے نام درجِ ذیل ہیں۔

(تذکرہ علماء)۔ ۴۰ مشاہیر ہند کا تذکرہ) سپاک و نماک (یہ مجذوبانہ تحریر ہے) کائناتِ عرب (جغرافیہ و احوال عرب) لغتِ اُردو (اردو الفاظ کے فارسی مترادفات) ڈرامۂ اکبر (فسانۂ جہانگیر و نورجہاں)، سیرِ ایران (سفرنامہ) فلسفۂ الہیات، جانورستان، مکتوباتِ آزاد۔ بیاضِ آزاد (پسندیدہ اشعار) خمکدۂ آزاد۔

مولانا آزاد خالص ادیب تھے۔ ان کے پیشِ نظر وہ مقصدیت اور اجتماعیت نہ تھی۔ جو سرسید، شبلی، حالی، یا نذیر احمد کے سامنے تھی۔ وہ تمام عمر اپنی علمی و ادبی لگن میں مصروف رہے۔ ان کی تمام تر کوششیں اُردو زبان کے فروغ اور ارتقاء کے لئے وقف رہیں۔ انہوں نے اصلاح و تعمیر کا وہ انداز اختیار نہیں کیا۔ جو ان بزرگوں کا نصب العین تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُردو ادب میں آزاد کی خدمات کم اہمیت نہیں رکھتیں۔

آزاد پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کی تاریخ مرتب کی اور اسے تذکرہ نگاری

سے نکال کر جدید دور میں داخل کر دیا۔ تاریخ نگاری میں بھی انہوں نے اس دور کے ادبی ذوق، ذہنی میلانات کی حقیقی تصویریں پیش کر دی ہیں۔ شاعروں پر تنقیدی رائے کا اظہار جس انداز سے کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ وہ چند جملوں میں کلام کی سب خصوصیات سمیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ انہوں نے اُردو شاعری کو روایتی غزل پرستی کی قدیم روش سے ہٹا کر نظم گوئی کی طرف متوجہ کیا اور مناظر فطرت اور نیچرل شاعری کی ابتداء کی۔ اس طرح انہوں نے موضوع کے لحاظ سے شاعری میں بڑی واضح اور اہم تبدیلیاں کیں اور اس طرح جدید نظم گوئی کی بنیاد رکھی۔

لسانی مسائل پر بھی غالباً آزاد نے پہلی بار تحقیق کی۔ اگرچہ اُردو زبان کی تاریخ کے بارے میں ان کا پیش کردہ نظریہ بعد میں غلط ہی ثابت ہوا۔ پھر بھی وہ لائق توجہ ہے۔ اور اس نے مزید تحقیق کے دروازے وا کئے۔

اُردو نثر میں بھی آزاد نے ایسا اسلوب ایجاد کیا جو صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا۔ اس میں نظم کی بھی چاشنی ہے اور نثر کا لطف بھی۔

غرض آزاد کی خدمات بحیثیت انشاء پرداز، نقاد، شاعر، مؤرخ، محقق، ماہر تعلیم اور ماہر لسانیات اتنی واضح ہیں کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اُردو ادب میں محمد حسین آزاد کا مقام

انیسویں صدی جو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے زوال کا دور تھی۔ ادبی اعتبار سے خاصی اہم ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ایک طرف حالی، اکبر اور داغ اُردو ادب میں گراں قدر اضافے کرنے میں مصروف تھے تو دوسری طرف سر سید اور ان کے رفقاء نثری ادب میں قابل قدر اضافے کرنے میں مشغول تھے۔ چنانچہ جہاں حالی، اکبر اور داغ کی کاوشوں نے شعری ادب کو مالا مال کیا اور شاعری میں نئے امکانات کا راستہ ہموار کیا، وہاں نثری ادب میں سر سید، آزاد، نذیر احمد، شبلی اور حالی نے لازوال اضافے کئے اور سنجیدگی سے نثر نگاری کی طرف متوجہ ہونے کی راہیں کھول دیں۔ آزاد کی نثر میں شعر کی سی لطافت ہے۔ "آب حیات" پر نظر ڈالئے تذکرہ کے مضمون کو کس حسن سے ادا کیا ہے۔ زبان کی تاریخ جیسے خشک موضوعات پر کس شگفتگی سے روشنی ڈالی ہے۔ شاعروں کے طبقات کی خصوصیات کس طرح واضح کی ہیں کہ بیان کی

لطافت کے ساتھ واقعات کی صداقت برقرار رہتی ہے۔

آزاد نے اپنے خاص اسلوب سے بہت سے تجریدی تصورات کو تجسیمی انداز عطا کیا ہے۔ ہم ان کی تحریروں میں بہت سی صفات کو چلتا پھرتا اور بولتا چالتا محسوس کرتے ہیں۔ یہ اندازِ نگارش تمثیلی اور ڈرامائی اندازِ نگارش ہے جو ان کی تحریروں میں نہائیت واضح صورت میں پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی خود کو مخاطب کے انداز میں پیش کرتے ہیں اور خود کلامی کی ڈرامائی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔

دراصل آزاد اُردو نثر کے سب سے بڑے انشاپرداز ہیں۔ انہوں نے خیالات و تصورات کا ایک نگارخانہ سجا رکھا ہے۔ ان کے الفاظ اور جملے اس حسن کاری میں ان کے بہترین آلات ہیں وہ تخیلات و تصورات کے ایسے مصوّر ہیں کہ ان سے زیادہ واضح اور صاف تصاویر ہمیں اُردو نثر میں نہیں ملتیں۔

رشید احمد صدیقی

(جینے کا سلیقہ)

سوانحی خاکہ

رشید احمد صدیقی جونپور کے قصبہ مریاہو میں ۲۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ میں تحصیل علم کر چکے تو مالی حالت نے کچہری میں کلرکی پر مجبور کیا مگر آپ حالات سے سینہ سپر رہتے اور اپنی ذہانت اور خداداد قابلیت کے بل پر ترقی کے لئے مسلسل کوشاں رہتے جس کے نتیجے میں آپ نے پرائیویٹ طور پر ایم۔ اے کر لیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اُردو اور فارسی کے لیکچرار بن گئے جہاں بالآخر شعبۂ اُردو کے صدر بن گئے اور ۱۹۵۸ء میں صدرِ شعبۂ اُردو ہی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے انہیں ۱۹۷۰ء میں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آپ ۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء میں علی گڑھ ہی میں فوت ہوئے۔

آپ کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) گنجہائے گراں مایہ (۲) مضامینِ رشید (۳) طنزیات و مضحکات (۴) خنداں (۵) جدید غزل (۶) آشفتہ بیانی میری (۷) ہم نفسانِ رفتہ ۸۔ عزیزانِ ندوہ کے نام (۹) غالب کی شخصیت اور شاعری (۱۰) اقبال شخصیت اور شاعری (۱۱) علی گڑھ ماضی و حال (۱۲) آپ بیتی — رشید احمد صدیقی ۔ (یہ کتاب ڈاکٹر معین الرحمن نے مرتب کی) (۱۳) نقش ہائے رنگ رنگ (یہ کتاب نذیر صدیقی نے مرتب کی)

رشید احمد صدیقی کے اندازِ تحریر کی خصوصیات

رشید احمد صدیقی عالمانہ شان اور بلند فکری کے حامل کامیاب مزاح نگار ہیں جن کا اپنا ایک فطری اسلوب ہے۔ ذیل میں ان کے اندازِ تحریر کی اہم خصوصیات دی جاتی ہیں۔

۱۔ سنجیدگی اور عالمانہ شان

رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں مگر ان کے مزاح میں بھی سنجیدگی اور عالمانہ شان پائی جاتی ہے اور ایسا مزاح گہرے مطالعہ، وسیع مشاہدہ، بلند تخیل اور اعلیٰ انسانی قدروں پر ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ فرحت اللہ بیگ اپنا مزاح مُردوں سے، پطرس زندوں سے اور رشید احمد صدیقی شعروادب سے حاصل کرتے ہیں۔ یعنی فرحت اللہ بیگ ماضی کی شخصیتوں کو موضوع بناتے ہیں۔ پطرس عام انسان اور اس کی مختلف حالتوں کو جبکہ رشید احمد صدیقی محدود علاقے علی گڑھ کی اقامتی زندگی کو۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ علی گڑھ کی اقامتی زندگی سے باخبر نہیں وہ اس مقامی رنگ کی ادبی چاشنی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ اعلیٰ ذوق کا قاری ان کے اعلیٰ سطح کے مزاح سے لطف اندوز نہ ہو سکے اور اس میں چھپی طنز کے ذائقے سے آشنا نہ ہو سکے۔

۲۔ طنز

رشید احمد صدیقی افراد، جماعت، اشیاء یا تصوّرات کی ناہمواریوں پر اپنے خاص اسلوب میں طنز کرتے ہیں جس میں زہرناکی نہیں ہوتی۔ ان کی سوچ کا انداز فلسفیانہ ہے اور اسی انداز میں کسی نامناسب چیز کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طنز میں بھی عالمانہ اور فلسفیانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ فلسفیانہ اندازِ فکر ان کے جملہ ہائے معترضہ میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ جہاں بات محض جملہ معترضہ تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ بعض حقائق پر بحث بھی کرتے ہیں۔ لطافت اور بذلہ سنجی کے رنگ میں رنگے ہوئے یہ جملہ ہائے معترضہ بظاہر مضمون سے الگ معلوم ہوتے ہیں مگر مجموعی تاثر میں وہ مضمون کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔

۳۔ طنز میں پاکیزگی

ان کی طنز کی سطح بہت بلند ہے جسے سمجھنے کے لئے بھی ایک خاص شعوری بلندی کی ضرورت ہے۔ یہ بلندی ایک طنز نگار کے لئے ضروری ہے ورنہ طنز طعن و تشنیع کی سطح تک اتر سکتا ہے۔ تاہم طنز کرتے ہوئے بھی وہ ابتذال سے دور رہتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کسی کی دلآزاری نہ ہو۔ ان کا مقصد چونکہ اصلاحی تھا اس لئے طنز کا یہ انداز ضروری تھا اسی لئے انہوں نے کسی مخصوص فرد سے زیادہ کسی جماعت یا کسی مخصوص تصوّر کو اپنا ہدف بنایا۔

۴۔ آمد کی کیفیت

ان کے مزاح میں سراسر آمد کی کیفیت ہے، آورد کا شائبہ

تک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں دلپذیری اور اثر آفرینی کی کیفیات نمایاں ہیں۔

۵۔ الفاظ کے استعمال پر عبور

انہیں انتخابِ الفاظ پر پورا عبور حاصل ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قاری کو بھی اِن الفاظ کے ذریعے دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اِسی لئے انہوں نے لفظوں کی تراش خراش پر زیادہ توجہ دی جس کے نتیجے میں ایسا مزاح پیدا ہوا اور ایسی طنز نے جنم لیا جس پر نہ وہ خود قہقہہ لگاتے ہیں اور نہ ہی قاری کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ ہمیں ایک ہلکا سا تبسّم زیرِ لب ملتا ہے جس میں نشتر کی سی کاٹ ہوتی ہے۔ یہی طنز کے کارگر ہونے کی دلیل ہے۔ کہیں کہیں ان کا طنز بیک وقت خود انہیں اور قاری دونوں کو تمسخر کا نشانہ بناتا چلا جاتا ہے۔ جہاں ایسی صورت پیدا ہوتی ہے وہاں طنز و مزاح نے کچھ اور ہی کیفیت اور اثر آفرینی دکھائی ہے۔

۶۔ شرافت کی زبان

رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ کسی شریف اہلِ قلم کے لکھے ہوئے ہیں جس میں درد کی کسک بھی ہے اور فلسفیانہ نکات بھی اسی لئے ان کی طنز اور مزاح قاری کو تفکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اور یہ کسی مزاح نگار کی کامیابی کی دلیل ہے۔

۷۔ تنوع

ان کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ وہ معمولی معمولی موضوعات پر بھی لکھتے چلے جاتے ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف انہیں اپنے اسلوب پر عبور ہے بلکہ مطالعہ و مشاہدہ بھی وسیع ہے۔

رشید احمد صدیقی کا مقصد معاشرتی خرابیوں کی اصلاح بھی تھا۔ اسی لئے وہ معاشرتی خرابیوں کی مذمت اور اوصاف کی تعریف کھل کر کرتے ہیں جس سے مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ وہ معاشرتی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیتے چلے جاتے ہیں۔

خلاصہ

جینے کا سلیقہ

سلیقہ سے مراد زندگی میں کسی کام کو بخیر و خوبی انجام دینا ہے۔ مذہب، اخلاق فن اور علوم و تجربہ کا زیادہ تر انحصار سلیقہ پر ہے۔ پھر سلیقے کے بغیر زندگی کے کسی شعبہ میں بھی انسان کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک حکیم اور ایک عطائی دونوں کے علاج سے مریض مر جاتے تھے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ مریض کی جان تو دونوں ہی لیتے تھے۔ لیکن حکیم قاعدہ سے جان لیتا تھا اور عطائی بے قاعدہ۔ یعنی یہ قاعدہ ہی دوسرے معنوں میں سلیقہ ہے۔ زندگی کو سلیقہ سے گزارنا ہر شخص کی صوابدید پر منحصر ہے۔ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ ہو جائے وہ لوگوں میں بنے بنائے سلیقے تقسیم نہیں کر سکتی۔ یعنی امریکہ اگرچہ بہت ترقی یافتہ ہے۔ لیکن وہ بھی اس سلسلے میں ناکام رہا ہے۔ ہر شخص کا اچھا یا بُرا اپنا ذاتی سلیقہ ہوتا ہے۔ میں اپنی ہمت و استعداد کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس لیے حسد کے مرض سے بچا ہوا ہوں۔ جینے کا دوسرا سلیقہ یہ ہے کہ زندگی ہر صورت میں بڑے مزے کی چیز ہے اور ہم اپنی خوبیوں سے دوسروں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ میں جس مرتبے پر ہوں کسی ہیرا پھیری کے ذریعے اس سے بلند ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ لیکن میری یہ کوشش رہی ہے کہ بچوں کی صحت و تندرستی، تہذیب اور تعلیم و تربیت کا خصوصی خیال رکھوں۔ اب جب کہ میرے بچے جوان ہو گئے اور میں بوڑھا تو ان کی خواہش ہے کہ میں ان کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزاروں۔ میرے ایسا نہ کر سکنے سے ان کی رسوائی ہونے کا خدشہ ہے۔ یہ چیز مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ نوجوان نسل اپنے بیوی بچوں کی اصلاح کی بجائے بوڑھے باپ دادا کی اصلاح کی کیوں فکر کرتی ہے

میری رائے ہے کہ دونوں نسلوں کو اپنی اپنی طرز پر زندگی گزارنی چاہیے نہ تو بوڑھے نوجوان نسل سے اپنی بات منوانے کی ضد کریں اور نہ ہی نوجوان نسل بوڑھوں کو اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔ جینے کا سلیقہ قدرت سے نہیں آتا۔ بلکہ اسے ہماری زندگی خود فراہم کرتی ہے۔ یعنی زمانے کے حوادث، معاشرہ اور کائنات کی نیرنگیاں جینے کا سلیقہ

سکھا دیتی ہیں۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۳۴:۔ منّاد۔ ندا کرنے والا، پکارنے والا ٭ نقیب۔ خبر دینے والا، تشہیر کرنے والا ٭ محکمی۔ مضبوطی ٭ رفعت۔ بلندی ٭ شیفتگی۔ دیوانگی، جنون ٭ عصرِ حاضر۔ موجودہ زمانہ ٭ بے تحاشا۔ بہت، اندھا دھند، بے تابانہ ٭

صفحہ نمبر ۱۳۵:۔ ریاض۔ محنت، مشقت ٭ باعتبارِ ریاض۔ محنت کے اعتبار سے ٭ مضائقہ۔ حرج، ڈر، تنگی، دشواری، خوف ٭ مدار۔ انحصار ٭ بھڑوا۔ بے حیا، بے شرم، بے غیرت ٭ دغل فصل۔ چالاکی۔ فریب ٭ وضع کرنا۔ بنانا ٭

صفحہ نمبر ۱۳۶:۔ بُوتا۔ زور، طاقت، ہمت، سہارا ٭ استعداد۔ قابلیت ٭ بساط۔ قدرت، طاقت، قوت ٭ عافیت۔ خیریت ٭ مترادف۔ ہم معنی۔ برابر۔

صفحہ نمبر ۱۳۷:۔ اعزا۔ رشتہ دار ٭ رسوائی۔ بدنامی، بے عزتی ٭

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

خود میں نے کوئی جینے کا سلیقہ نہیں برتا لیکن زندگی نے میرا ساتھ بڑے سلیقے سے دیا ہے۔ زندگی کو جس شخص پر اعتماد ہو جاتا ہے وہ اس شخص سے کبھی دغل فصل نہیں کرتی۔ یہی بات شخص کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگر شخص، زندگی کا احترام کرے اور اسے ایک قیمتی امانت اور آزمائش سمجھے تو وہ ایسا سلیقہ وضع کرے گا جو زندگی اور خود اُس کے شایانِ شان ہوگا۔ زندگی کا یہ پھیر ہمیشہ یاد رکھیئے کہ وہ ہر شخص سے ایک ہی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتی۔ اس لیئے یہ ناممکن ہے اور نامناسب بھی کہ امریکہ سے کوئی جینے کے بنے بنائے بے شمار سانچے تیار کرا کے اپنے ووٹروں میں تقسیم کر دے!

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "جینے کا سلیقہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مصنف اپنی زندگی کے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں

جینے کا سلیقہ بتاتا ہے۔

تشریح:۔ میں نے تو کبھی سلیقے کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش نہیں کی مگر زندگی نے ہمیشہ سلیقے سے میرا ساتھ دیا ہے۔ زندگی جس شخص پر اعتبار کرنے لگے وہ اس کے ساتھ کبھی فریب نہیں کرتی۔ ہر شخص کے بارے میں یہی بات درست قرار پائے گی۔ اگر ہر شخص زندگی کی قدر کرے اور اسے ایک قیمتی امانت اور آزمائش تصور کرے تو وہ ایسا سلیقہ سیکھ ہی لے گا جو اس کے بھی لائق ہو اور زندگی کے بھی یعنی دونوں ہی کے لئے باعثِ فخر ہو۔ زندگی کا یہ اصول یاد رکھئے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتی۔ اس لئے یہ بالکل ناممکن اور یکسر غیر مناسب بات ہے کہ امریکہ سے زندگی گزارنے کے بنے بنائے اصول وضوابط منگوا کر اپنے رائے دہندگان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔

(۲)

ہر شخص کے جینے کا سلیقہ بھلا ہو یا بُرا، اُس کا اپنا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو زندگی بسر کرنی محال ہو جائے۔ مجھے تمام عمر نہ اس کی فرصت ملی، نہ اس کا حوصلہ ہُوا کہ اپنی ذمہ داریوں اور اپنی دلچسپیوں کے علاوہ کسی اور کی ذمہ داری یا دلچسپی میں حصّہ لیتا۔ میں سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ایک محدود حلقے میں ایک محدود زمانے تک ایک محدود خدمت کے لئے پیدا کیا گیا، اس لئے اللہ نے مجھے اتنی ہی عقل، اتنا ہی حوصلہ اور اسی قسم کی شکل وصورت دی ہے کہ میں اپنا کام چلاتا رہوں اور کسی ایسے چکر میں نہ پڑوں جو میرے بوتے کا نہ ہو۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "جینے کا سلیقہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق:۔ اس مضمون میں مصنّف جینے کا سلیقہ خود اپنی زندگی کے حوالے سے سکھا رہا ہے۔

تشریح:۔ ہر شخص کا زندگی گزارنے کا اپنا ہی ایک سلیقہ ہوتا ہے، چاہے یہ اچھا ہو چاہے بُرا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی گزارنا ہی ناممکن ہو جائے۔ خود مجھے تو ساری زندگی نہ فرصت ملی، نہ حوصلہ ہُوا کہ سوچ سکوں کہ زندگی گزارنے کا سلیقہ کیا ہے۔ میں تو بس اپنی ذمہ داریوں اور دلچسپیوں ہی میں مصروف رہا اور یہ کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ میں زندگی بھر یہی سمجھتا رہا اور اب بھی

یہی سمجھتا ہوں کہ میں اس کائنات کے اندر ایک نہایت محدود وقت کے لئے آیا ہوں اور مجھے ایک نہایت محدود طبقے کی نہایت محدود سی خدمت انجام دینی ہے۔ اس لئے خداوند کریم نے مجھے اتنی ہی عقل، شکل اور حوصلہ سے نوازا جس سے میں اپنا کام چلاتا رہوں اور کسی ایسے مسئلے میں نہ اُلجھ جاؤں جسے حل کرنے کا میرے اندر حوصلہ ہی نہ ہو۔

(۳)

جینے کا میرا دوسرا سلیقہ یا تصور یہ ہے کہ زندگی نادر، ناقابلِ فہم، مقدس، اعلیٰ، ارضی یا غیر ارضی کچھ ہی کیوں نہ ہو، بڑے مزے کی چیز ہے۔ مزے کی چیز سے میری مراد شراب و شاہد و شعر وغیرہ قسم کی چیز سے نہیں بلکہ دوسری اور بہت سی چیزیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اپنی خوبیوں سے دوسروں کی خامیوں کی اصلاح اور تلافی کر سکتے ہیں۔ کسی شے یا حالت کو بہتر بنا دینے کی قابلیت اور حوصلے سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا نعمت ہو سکتی ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "جینے کا سلیقہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مصنف نے اپنے تجرباتِ زندگی کے حوالے سے جینے کا سلیقہ سکھانے کی سعی کی ہے۔

تشریح:۔ جینے کا میرا دوسرا سلیقہ یا تصور یہ رہا ہے کہ زندگی جو بھی ہے جیسی بھی ہے، مزے کی شے ہے۔ یعنی چاہے زندگی نایاب شے ہے یا سمجھ میں نہ آ سکنے والی ہے، پاکیزہ ہے، اعلیٰ ہے، زمینی ہے یا آسمانی ہے، جو بھی ہے اور جیسی بھی ہے بہرحال لطف حاصل کرنے والی شے ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ زندگی لطف حاصل کرنے یا مزے لینے والی شے ہے تو میں قطعاً یہ کہنا نہیں چاہتا کہ شراب پیو، عاشقی کرو، شاعری کرو یا پڑھو وغیرہ۔ بلکہ بہت سی اور صورتیں ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ ہم اپنی اچھائیوں کو ذریعہ بنا کر دوسروں کی کمزوریوں کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی کر سکتے ہیں۔ دنیا میں اس سے بہتر اور کونسی نعمت ممکن ہے کہ انسان کسی شے یا حالت کو بہتر بنا سکنے کے لئے ضروری قابلیت بھی رکھتا ہو اور حوصلہ بھی۔

(۴)

خدمت کرنے کا میرا تصور بہت ہی معمولی اور مختصر ہے۔ وہ اس لئے کہ میری

یہی اور اتنی ہی بساط ہے۔ چنانچہ جتنا بڑا اپنے نزدیک میں ہوں، اُس سے بڑا بننے کے لئے مارا مارا پھرنے، جیل خانے جانے، لوگوں پر عافیت حرام کردینے یا شہادت پا جانے کے پھیر میں کبھی نہیں پڑا۔ میں خدمت کرنے کو ایسا قرض اُتارنے کے مترادف سمجھتا ہوں جو بغیر لئے بھی عائد رہتا ہے۔ چنانچہ مرنے کے بعد اس دنیا میں کوئی میموریل بنوانے یا بہشت میں قصرِ زمرّدیں حاصل کرنے کی تمنا میں نے کبھی نہ کی۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "جینے کا سلیقہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں رشید احمد صدیقی اپنے تجربات و نظریات کی روشنی میں جینے کا سلیقہ بتاتے ہیں۔

تشریح:۔ خدمت کرنے کا میرا تو تصور ہی بڑا معمولی اور بڑا ہی مختصر سا ہے۔ وہ یوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں بس یہی کچھ کر سکتا ہوں یعنی میری بس اتنی ہی ہمت ہے۔ چنانچہ میں کبھی اس چکر میں نہیں پڑا کہ جتنا بڑا ہوں اس سے بہت بڑا بن جاؤں اور اس مقصد کے تحت دن رات مصروفِ عمل رہوں، جیل خانوں کی ہوا کھاؤں اور لوگوں کا آرام حرام کردوں یا شہید بننے کی ٹھان لوں۔ میں خدمت ایسا قرض تصور کرتا ہوں جو بغیر لئے بھی واجب لادا رہتا ہے۔ چنانچہ میں نے نہ تو کبھی یہ خواہش کی ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری یاد میں کوئی یادگار قائم کی جائے یا میں مروں تو جنت کے ہیرے جواہرات سے تعمیر شدہ محلات میں پہنچ جاؤں۔

(۵)

میں نے چاہے جس سلیقے سے زندگی بسر کی ہو یا اب کرنی پڑے، ایک چکر میں اکثر مبتلا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ جب اولاد ناتواں اور ناسمجھ تھی تو میرا تمام وقت، آرام، قابلیت، توجہ اور ذرائع اور وسائل اس پر صرف ہوتے کہ وہ اچھی تعلیم، تہذیب اور تندرستی سے بہرہ مند ہوں۔ اس سلسلے میں اُن کی جیسی نگرانی کرنی پڑتی تھی، وہ ان کی ناسمجھی کی بناء پر اُن پر کتنی گراں گزرتی تھی، وہ مجھے خوب معلوم ہے۔ اس لئے کہ میں خود اس مرحلے سے گزرا ہوں۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "جینے کا سلیقہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق :۔ اس مضمون میں مصنف اپنے تجربات، مشاہدات اور نظریات کی روشنی میں زندگی گزارنے کا سلیقہ زیر بحث لاتے ہیں۔

تشریح :۔ میں نے جیسے بھی زندگی گزاری ہے، ایک چکر میں اکثر پڑا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ جب اولاد کمزور اور بے سمجھ تھی تو میرا تمام وقت، آرام، لیاقت، توجہ، ذریعے اور وسیلے سب انہی کے لئے استعمال کئے تاکہ انہیں اچھی تعلیم میسر آجائے، وہ تہذیب یافتہ بن جائیں اور صحت مند رہیں۔ اس سلسلے میں جس جس طرح ان کی طرف توجہ دینی پڑتی تھی وہ ان کی بے سمجھی کی وجہ سے انہیں بُری لگتی تھی ——— اور ——— کس قدر بُری لگتی تھی۔ اس کا بھی مجھے اندازہ ہے کہ میں خود اس منزل سے گزر چکا ہوں یعنی میں بھی تو کبھی بچہ تھا اور میرے باپ کا بھی میرے حوالے سے یہی اندازہ تھا۔

(۶)

پھر بھی میری رائے ہے کہ جب والدین بوڑھے اور اولاد جوان ہو جائے تو والدین کو میدان چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ میدان چاہے خاندان کا ہو یا علم و ادب کا، چاہے حکمت و فن کا، چاہے اخلاق و مذہب کا۔ بوڑھوں کا نئی نسل سے اپنی منوانے کی ہوس میں مبتلا رہنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں اور بوڑھوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ نوجوانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔

حوالۂ متن :۔ یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "جینے کا سلیقہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق :۔ اس مضمون میں مصنف اپنے تجربات و نظریاتِ حیات کے حوالے سے زندگی گزارنے کا سلیقہ زیرِ بحث لاتے ہیں۔

تشریح :۔ اگرچہ والدین کو بچوں پر پوری توجہ دینی چاہیئے پھر بھی میری رائے یہ ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو جائیں اور اولاد جوان ہو جائیں تو والدین کو چاہیئے کہ ان کی نگرانی کی ذمہ داری سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ ذمہ داری چاہے خاندان کے حوالے سے ہو یا علم، ادب، دانائی، فن، اخلاق یا مذہب کے حوالے سے ہو۔ میری رائے میں یہ بات ہرگز مناسب نہیں کہ بوڑھوں پر دھن سوار ہو جائے کہ نئی نسل سے اپنی بات منوا کر ہی رہیں گے اور میں بوڑھوں کی اس رائے کو بھی غلط قرار دیتا ہوں کہ نوجوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ برباد ہو جائیں گے۔

سجاد حیدر یلدرم

(جہاں پھول کھلتے ہیں)

خلاصہ

جہاں پھول کھلتے ہیں

زندگی بسر کرنے کا صحیح لطف موسم بہار میں پھولوں اور گلاب کی خوشبوؤں بھری پُر سکوت وادی میں ہے۔ جب بہار اپنے پورے جوبن پر ہوتی ہے۔ یعنی ہر طرف رنگا رنگ پھول کھلے ہوتے ہیں اور ٹھنڈی ہوائیں اور بادل سرسبز پہاڑوں اور ٹیلوں پر اپنا سایہ کرتے ہیں تو بے اختیار اس موسم پر جان فدا کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ یعنی جینے اور مرنے دونوں ہی کا مزہ اسی موسم میں ہے۔

میرے دوست تمہیں شائد یاد ہو کہ نہ ہو۔ جب شام کے سناٹے میں دریا کی موجیں لوریاں سُنا رہی ہو۔ اور اس پر سکوت فضا میں کشتی چپ چاپ اپنا سفر طے کر رہی تھی، اسی طرح کئی کشتیاں چلیں اور پھر اندھیرا چھانے لگا تو تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اس خوبصورت وادی کا ماحول پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے تو ایسی وادی میں رہنے والا انسان یقیناً خوبصورت پاکیزہ اور معصوم ہوگا۔ یہ واقعی حقیقت ہے کیونکہ ماحول کی پاکیزگی انسانی روح پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ اذان، مندر اور کلیسا کی گھنٹیوں کی آواز سے نئے نئے خیالات جنم لیتے ہیں۔ شب بہار آدمی کو ابدی لذت عطا کرتی ہے۔ آسمان پر جگنوؤں کے مقابل ستارے ہوتے ہیں۔ اس وقت زمین و آسمان خاموش نغمے گاتے ہیں۔ اے روشن آسمان! اگر یہ سرسبز اور شاداب دنیا میری بوڑھی روح کا نذرانہ تمہیں پیش کرے تو کیا تم اسے قبول کر لوگے۔ میرے نزدیک پُر سرور جُدائی غمگین وصال سے بہتر ہے۔ اس لیے میں عین موسم بہار میں پھولوں بھری دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں تاکہ اس کی خوبصورت یادیں ہی میرے ساتھ جائیں۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۳۸:۔ پروردہ۔ پلا ہوُا، پرورش پایا ہوُا؛ بایقین۔ یقیناً؛ ماخوذ۔ اخذ کیا ہوُا، نکالا ہوُا؛ مدارج۔ درجے؛ تابندہ۔ روشن؛ دبدبہ۔ رعب، شان؛ دغدغہ۔ اندیشہ، کھٹکا، خوف، ڈر؛ ہم آہنگ۔ ہم آواز، ساتھی، متفق الرائے؛ دورِ ثانی۔ دوسرا دور؛

صفحہ نمبر ۳۹:۔ کثیف۔ غلیظ، گندا، میلا؛ ترش رُو۔ بدمزاج، بددماغ؛ خفیف۔ ہلکا، تھوڑا، کم؛ حسنات۔ نیکیاں۔ بھلائیاں؛ قاز۔ ایک آبی پرندہ، کونج، راج ہنس؛ ملوث۔ لتھڑا ہوُا، آلودہ؛

صفحہ نمبر ۴۰:۔ صفائے رُوح۔ روح کی پاکیزگی؛ صَومعہ۔ گرجا، عیسائیوں کی عبادت گاہ؛ ناقوس۔ بگل؛ کلیسا۔ چرچ۔ گرجا؛ لذتِ ابد۔ ہمیشہ کی لذّت؛ مرصع۔ جڑاؤ، آراستہ؛ ہدیہ۔ تحفہ؛ دغدغۂ حیات۔ زندگی کا اندیشہ؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

جہاں پھول کھلتے ہیں اور گلاب کی خوشبو شام کے سائے میں پھیلتی ہے، ایسے وادی کے خاموش گوشے میں جہاں نہ دبدبہ ہو نہ دغدغہ، زندگی بسر کرنے کا لُطف ہے۔

جب پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترش رو دنیا ہنسنے لگتی ہے، ہوا میں حسنِ عشق سے مشابہہ آہنگ نرم، ایک اسرار انگیز خفیف روانی پیدا ہوتی ہے، جب فرشتہ گل خوشبو کے منہ کو کھولتا ہے اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے اُس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مرجانے کا لطف ہے!

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سجاد حیدر یلدرم کے مضمون "جہاں پھول کھلتے ہیں" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق:۔ اس مضمون میں یلدرم یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ روتے ہوئے جینے کے مقابلے میں مسکراتے ہوئے مرجانا بہتر ہے۔

تشریح:۔ زندگی بسر کرنے کا مزا تو تب ہے کہ ایسی وادی میسّر آئے جہاں پھول کھلتے ہوں اور شام کے سائے میں گلاب کی خوشبو پھیل رہی ہو — اور — پھر اس وادی میں ایسا خاموش گوشہ میسّر آجائے جہاں نہ تو دنیا کی شان وشوکت ہو اور نہ ہی دنیا کے اندیشے — اور — مرجانے کا لطف بھی تو تب ہے کہ ایسی جگہ میسّر آئے جہاں پھول کھل رہے ہوں اور یہ غلیظ اور بدمزاج دنیا مسکرا رہی ہو، ہَوا میں پیار کی حس سے ملتے جلتے نرم آہنگ سے ایک عجیب وغریب سی، ہلکی ہلکی روانی پیدا ہو رہی ہو، فرشتے شبو کے پھولوں کے منہ کھول رہے ہوں (یعنی گلِ شبو کھل رہے ہوں) اور بادلوں کو رنگوں سے دل فریب بنا رہے ہوں اور پھر موسم بہار کی ایک شام کا سہانا سماں ہو۔

(۲)

بے شک، اے میری جان سے زیادہ مجھے پیارے! ہر روح اس وادی میں صفائے روح محسوس کرتی ہے۔ مسجد سے سکون پرور آواز کے ساتھ مؤذن کی اذان، صومعہ سے ناقوس کی پُر عظمت صدا — اور کلیسا سے گھنٹے کی کانپتی ہوئی گونج اور شام کا وقت! کیا کیا خیالات پیدا ہوتے ہیں — اور بہار کی رات! پُر شوکت رات! انسان کو لذّتِ ابد عطا کرتی ہے۔ اس خاکدان کے ہر جگنو کے مقابلے میں آسمان پر ایک ستارہ نکلتا ہے۔ آسمان اور زمین ایک خاموش نغمہ گاتے ہیں۔

آسمان، روشن اور مرصع شامیانے کی طرح نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں سے لدی ہوئی اور ہریالی میں چھپی ہوئی دنیا ہنس ہنس کے، چمک چمک کے اگر میری ضعیف روح کو آسمان کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرے تو وہ قبول کرلے گا۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سجاد حیدر یلدرم کے مضمون "جہاں پھول کھلتے ہیں"، سے

لی گئی ہے۔

سیاق وسباق:۔ مصنف اس مضمون میں یہ تصور پیش کرتا ہے کہ پر فضا مقام پر جان دینا مایوسی کے مقام پر جینے سے بہتر ہے۔

تشریح:۔ اے میری جان سے زیادہ پیارے! ہر روح اس وادئ روح پرور میں روح کی پاکیزگی محسوس کرتی ہے۔ مسجد سے سکون بخشنے والی موذن کی اذان کی آواز، غیر مسلموں کی عبادت گاہوں سے سنکھ کی آواز اور عیسائیوں کے گرجے سے گھنٹے کی کانپتی ہوئی آواز آتی ہے۔ اور پھر وقت شام بھی ہو تو طرح طرح کے خیال پیدا ہونے لگتے ہیں۔ —— اور —— بہار کی شاندار رات بھی ہو تو انسان کو کیسی ہمیشہ ہمیشہ کی لذت بخشتی ہے —— اس حقیر دنیا کے ہر جگنو کے مقابلے میں آسمان پر ایک ستارہ نکل آتا ہے اور آسمان اور زمین خاموشی کی زبان سے ایک نغمہ گانے لگتے ہیں۔ —— ایسے میں آسمان ایک روشن اور آراستہ سائبان کی طرح دکھائی دیتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس عالم میں کہ دنیا پھولوں سے لدی ہوئی ہو، ہر طرف ہریالی ہو، اور زندگی مسکرا رہی ہو۔ میری روح آسمان کی طرف پرواز کر جائے —— یعنی مصنف ایسی فضا میں مرنا چاہتا ہے جب ہر طرف زندگی کی مسکراہٹیں اور رونقیں ہوں۔

(۳)

پیدا ہوتے وقت رونا بہت اچھا —— مانا، مگر ناامیدی کے ساتھ مرنا؛ اس کی ضرورت سمجھ میں نہ آئی۔ میں ایک پرنشۂ وداع کو غمگین وصال پر ترجیح دیتا ہوں اور یہی سبب ہے، آہ! یہی سبب ہے کہ چاہتا ہوں کہ دغدغۂ حیات کو بہار کے پرشوق زمانے میں، جب پھول کھل رہے ہوں اور دنیا میری طرف ہنس رہی ہو اور میں دنیا کی طرف —— ایسے وقت، میں دنیا کو الوداع کہوں ——

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سجاد حیدر یلدرم کے مضمون "جہاں پھول کھلتے ہیں" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق:۔ مصنف زندگی میں ہنسی کی اہمیت واضح کرنا چاہتا ہے۔

تشریح:۔ انسان پیدائش کے وقت روتا ہے، اس کی تو سمجھ آتی ہے مگر اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ انسان مرتے وقت مایوس ہو۔ آخری کیوں؟ میں تو سمجھتا ہوں پر سرور کیفیت میں رخصت

ہو جانا اداسی کی فضا میں ملاقات ہونے سے بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس عالم میں دنیا میں سفرِ آخرت کروں جب بہار کا موسم ہو، پھول کھل رہے ہوں اور دنیا مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہو اور میں دنیا کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں۔

یلدرم کی ادبی خدمات

سجاد حیدر یلدرم کو ابتدا ہی سے ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے ادب تخلیق کرنے میں مصروف تھے اور اپنی مخصوص نثر کی بنیاد پر داد حاصل کر چکے تھے۔ آپ نے نہ صرف نثر میں مضامین لکھے بلکہ شاعری بھی کی مگر بطور شاعر کے کوئی مقام اس لئے حاصل نہ کر سکے کہ انہوں نے پوری توجہ نثر ہی کی طرف مبذول رکھی اور اسی کو اپنے خیالات کے اظہار کے ذریعہ کے طور پر اپنایا۔

آپ نے اُردو زبان کے دامن کو تراجم سے بھی مالامال کر دیا۔ اس ضمن میں ترکی افسانوں اور ڈراموں کا ذکر بطورِ خاص ضروری ہے کہ ان سے نہ صرف اُردو ادب میں دوسری زبانوں کے افسانوں اور ڈراموں کا اضافہ ہوا بلکہ اردو زبان ایک نئے لہجے سے بھی آشنا ہوئی جو یلدرم کا تھا۔

اس زمانے میں رسالہ "مخزن" نے شمالی ہند میں اُردو میں اچھے اچھے لکھنے والے جمع کر لئے تھے۔ یہ رسالہ نئے لکھنے والوں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام کر رہا تھا۔ سجاد حیدر نے بھی مخزن میں مضامین لکھنا شروع کئے اور ان کے کئی طبع زاد مضامین اور ترجمے "مخزن" میں چھپے۔ "مخزن" کے ابتدائی دور میں نوجوان مصنفین پر ٹیگور کے رومانوی خیالات کا بڑا اثر تھا۔ سجاد حیدر نے بھی یہ اثر قبول کیا اور اس طرح اُردو میں سجاد حیدر کے ہاتھوں رومانی تحریک کا آغاز ہوا۔ رومانیت اور ترکی ادب کی لطافت نے مل کر ان کے اسلوب کو انفرادیت عطا کی۔ ان کی تحریروں میں لطافت، حسن رعنائی اور رنگینی کا لطیف امتزاج ہے۔ وہ اُردو میں انشائے لطیف کے علم بردار ہیں۔ ان کی تحریروں کی رومانی فضا میں ایک مسحور کن کیفیت ہے۔ وہ نہایت نفیس اور لطیف شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی نگارشات بھی ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ انہوں نے اپنے اسلوب میں کسی کی تقلید نہیں کی۔ ان کی نثر میں شاعرانہ حسن ہے۔ یہ شاعرانہ حسن صرف تشبیہوں کی ندرت اور لطافت سے پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ محمد حسین آزاد کے یہاں ہے۔ بلکہ یہ حسن لطیف احساسات کو لطیف انداز میں بیان کرنے سے پیدا

ہوا ہے۔ ان کی نگارشات میں شاعری، مصوری اور گہری فکر کے عناصر شامل ہیں۔ ان کی نثر نہ ساحری ہے نہ پیغمبری وہ تو تخیل کی موجِ خوش آب ہے۔

یلدرم کے یہاں خوش اخلاقی اور حسن دوستی کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ ان کی رومانیت افسردہ اور خلوت پسند قسم کی رومانیت نہیں ہے۔ بلکہ ان کی دنیا میں تازگی، شادابی اور روشنی پائی جاتی ہے۔ یلدرم کی فکر کا بنیادی آہنگ ماورائی ہے۔ ان کے افسانوں اور مضامین میں بھی ماورائی آہنگ ملتا ہے۔ وہ سوا بیت نغمہ و رنگ کے کسی اور مادی شئے سے آشنا نہیں۔ ان میں قوس و قزح کا حسن اور لطافت پائی جاتی ہے۔

یلدرم بیسویں صدی کے مغربی ذہن سے واقف بھی ہیں اور اس سے متاثر بھی۔ اس لئے ان کی تخیلی دنیا بھی جدید دور کے تخیل کی پیداوار ہے۔ لیکن مغرب کی تہذیب سے لائے ہوئے بہت سے مسائل یلدرم کے عہد تک محسوس نہیں ہوئے تھے۔ سرمایہ کی لعنت اور سرمایہ داری کے ہتھکنڈے ان کے مضامین اور ان کے ذہن میں کوئی جگہ نہیں پاتے۔ وہ تو مغرب کے تہذیبی شعور سے متاثر ہو رہے تھے۔ اسی لئے یلدرم کے سارے کردار خوش مذاق ہیں۔ لطافت کے پرستار ہیں۔ حسین آرزوؤں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں ملول چہرے، بھوکے انسان اور مشینوں کے بوجھ سے کچلے ہوئے انسان نہیں ملتے۔

یلدرم کی تخیل پرستی اور ماورائیت مغربی قسم کی ہے ان کے یہاں ڈرائینگ روم اور تھیٹر کے تذکرے ہیں۔ لیکن سجاد حیدر مغربی تمدن سے زیادہ مشرقی تمدن کے دلدادہ ہیں۔ ان کے افسانوں اور مضامین میں تمام تشبیہات اور تصورات ایشیائی ہیں۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں خوش سلیقگی، فارسی تراکیب کی نئی نئی صورتیں ایرانی اور ترکی تصورات کی افراط اور خاص طور سے انداز بیان پختگی اور رمزیت پر بہت زور دیتے ہیں ان کی تشبیہیں نہائت مرصع ہیں اور خاص طور سے ان کے محاکاتی خاکے لطافت سے معمور ہیں۔

یلدرم کے یہاں رومانوی تحریک کے حسن کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی صورتیں بھی ملتی ہیں جو رومانوی تحریک کے عیوب میں شامل ہیں۔ جذباتیت، حقیقت سے گریز، سماجی احساس اور ذمہ داری سے فرار اور زندگی کو صرف خواب کے انداز میں گزارنا یہ سب ایسی باتیں ہیں جو رومانوی تحریک کے معائب ہیں۔ اور سجاد حیدر یلدرم کے یہاں یہ معائب بھی پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا

(ہجرت)

خلاصہ

ہجرت

آسمان ہمارے سروں پر مچھر دانی کی طرح سایہ کیے ہوئے ہے اور زمین اور اس پر اگا ہوا سبزہ ایک بستر کی مانند ہے۔ اس سبز اور مچھر دانی کے درمیان میں ایک سیاہ نقطے کی طرح ہوں۔ میں خواہ کسی جگہ چلا جاؤں یہ دونوں چیزیں ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ گویا میں اپنے وجود کی قید میں ہوں۔ قید اور آزادی بھی اضافی چیزیں ہیں۔ بڑی سے بڑی آزادی کے گرد بھی حد کا ایک دائرہ موجود ہوتا ہے۔ گویا بڑی سے بڑی آزادی بھی آزادی نہیں۔ حالات کے مطابق ماحول میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ میرے اندر آزادی کا احساس اس لیے ہے کہ میں جسم کی قید میں ہوں۔ فطرت نے ہر کسی کو ایک دائرہ جو یقیناً فصیلِ زندگی ہے عطا کیا ہے لیکن کبھی کبھار انسان، حیوان، اور چرند پرند کے اندر ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا دل اپنے گھر اور گھونسلے کو خیر باد کہنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ یعنی ہجرت فطرت کی ایک ناقابلِ فہم ادا ہے۔

فطرت کی ادائیں بھی منفرد ہیں۔ کبھی وہ مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور کبھی پرے دھکیل دیتی ہے۔ جب میں فطرت کے دامن میں ہوتا ہوں تو زندگی ایک منظم ضابطے کے تحت گزرتی ہے اور ہر کام معمول کے مطابق کرتا ہوں۔ یہ میری زندگی کی سلامتی کی ضامن بھی ہوتی ہے۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح مظاہر کائنات میں ایک باقاعدگی ہے وہ اپنے قاعدے سے بال برابر بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ اسی طرح فطرت مجھے ضابطہ حیات سے ذرا بھی انحراف نہیں کرنے دیتی۔

اگر کبھی میں خلا بے کی قید سے نکل کر ہجرت کرنا چاہتا ہوں تو کیا یہ بغاوت فطرت کی طرف سے نہیں ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہجرت سے زندگی میں رنگا رنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ کسی بھی خطۂ زمین کی خاصیت اس کے باشندوں میں ہوتی ہے۔ انسان جب ہجرت کر کے کسی نئی جگہ پر جاتا ہے تو اپنے بدن اور روح کو نئے ماحول سے متعارف کراتا ہے خواہ یہ ہجرت جسمانی طور پر ہو یا محض تخیلاتی طور پر یعنی ہجرت کے لیے جسمانی طور پر ایک خطے سے دوسرے خطے میں جانا ضروری نہیں بلکہ انسان اپنے بستر پر لیٹ کر بھی رات کو صرف خیالوں ہی کے ذریعے نئی سے نئی سرزمین میں پہنچ کر وہاں کی خصوصیات یعنی اشیلائے نوردتی سے خود کو تر و تازہ کر سکتا ہے۔

اے دھرتی کے باسیو! آؤ ہجرت کر کے ایک دوسرے سے نئے سے نئے لوگوں سے ملاقات کریں اور پھر بچھڑ جائیں۔ ملاقات ہجرت کا شیریں ثمر اور تجدیدِ ذات ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۴۱: اُپج - جدت ؍ نیاپن ؍ موثر تر - زیادہ اثر کرنے والا، زیادہ تاثر چھوڑنے والا ؍ اصحابِ کبار - بڑے لوگ ؍ اسماء - اسم کی جمع، نام ؍ پیوست ہونا - ساتھ مل جانا ؍ نمودار ہونا - ظاہر ہونا ؍ پنچھی - پرندے ؍ لکۂ ابر - بادل کا ٹکڑا ؍ طلسمی دائرہ - جادو کا دائرہ ؍ ہست - ہستی - زندگی ؍ منسلک - ملا ہوا ؍

صفحہ نمبر ۱۴۲: بدستور - حسبِ سابق ؍ بے حس و حرکت - حرکت کیے بغیر، غیر متحرک ؍ اضافی اعتباری، نسبتی ؍ زائد، معاون، جو اصلی نہ ہو ؍ بے کنار - بہت وسیع، جس کی کوئی حد نہ ہو ؍ لامتناہی - جس کی کوئی حد نہ ہو ؍ لامحدود - جس کی کوئی حد نہ ہو ؍ بندی خانہ - قید خانہ ؍ تحویل - قبضہ ؍ ادراک - عقل، سمجھ، رسائی ؍ منقار - چونچ ؍ منقار زیرِ پر - پروں میں چونچ دبائے ؍ ناقابلِ تسخیر فصیل - ایسی شہر پناہ یا حفاظتی دیوار جسے تسخیر نہ کیا جا سکے ؍ سرشت - مزاج - طبیعت ؍ گاہے گاہے - کبھی کبھی ؍ کینچلی - سانپ کی کھال جو اُترتی رہتی ہے ؍ ناقابلِ فہم - جسے سمجھا نہ جا سکے ؍ کرب انگیز تجربہ - ایسا تجربہ جو گہرے دکھ کو جنم دے ؍

لبریز۔ بھرا ہوا، پُر ؛ نوعیت۔ قسم ؛

صفحہ نمبر ۳ ۴ ؛۔ ٹھہراؤ۔ ٹھہرنے یا رُکنے کی جگہ ؛ مرکزِ ہست۔ زندگی کا مرکز ؛ بلائے ناگہانی۔ اچانک وارد ہونے والی بلا یا مصیبت ؛ شِق۔ پہلو، شاخ ؛ روش۔ طرز۔ ڈھنگ ؛ سرِمُو۔ بال برابر یعنی ذرا سا، معمولی سا ؛ انحراف کرنا۔ پھر جانا، ہٹ جانا ؛ مخالفت ؛ ہم آہنگ ہونا۔ ساتھ دینا۔ ساتھ مل جانا ؛ پیٹرن۔ انداز۔ نمونہ ؛ زندان۔ قید ؛

صفحہ نمبر ۴ ۴ ؛۔ ارتقاد۔ بتدریج ترقی کرنا ؛ اجاگر ہونا۔ ظاہر ہونا ؛ نخلستان۔ کھجور کے درختوں کا جنگل ؛ چشمۂ شیریں۔ میٹھا چشمہ یعنی میٹھے پانی کا چشمہ ؛ صبح ومسا۔ صبح وشام ؛ کوندا۔ بجلی کی چمک ؛ کشید کرنا۔ کھینچنا، اخذ کرنا ؛ باسی۔ رہنے والے ؛ دیارِ غیر۔ اجنبی ملک ؛ کیف انگیز۔ نشہ آور، خمار آور، سرور انگیز ؛ خزائن۔ خزانے ؛

صفحہ نمبر ۵ ۴ ؛۔ منقطع ہو کر۔ کٹ کر ؛ معاون۔ مددگار ؛ دور افتادہ۔ جو دُور ہو ؛ ثمرِ شیریں۔ میٹھا پھل ؛ تجدید۔ نیا بنانا، تازگی ؛ پنہاں۔ پوشیدہ ؛ حفظ۔ زبانی ؛ حیرت زدا۔ حیرانی پیدا کرنے والا ؛ منہا۔ خارج، منفی ؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

مگر قید اور آزادی تو محض اضافی باتیں ہیں۔ بڑی سے بڑی آزادی کے گرد بھی ایک دائرہ سدا موجود رہتا ہے۔ ہر آزاد ملک اپنی سرحدوں میں قید ہے۔ بات شاید احساس کی ہے۔ میرے لئے کبھی تو میرا چھوٹا سا کمرہ بھی بے کنار اور لامتناہی ہے اور کبھی لامحدود کائنات بھی ایک بندی خانہ ہے۔ اور کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں خود اپنے بدن کی چاردیواری میں بند ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحہ ایک اور احساس نے مجھے گدگدایا ہے کہ اگر میری تحویل میں میرا بدن نہ ہوتا تو میں اپنے پانچوں حسّی آلات سے محروم ہونے کے باعث اپنے اردگرد کی دنیا تک کا ادراک نہ کر سکتا۔ تو کیا میرا یہ احساسِ آزادی محض اس لئے نہیں کہ میں اپنے جسم کی قید میں ہوں؟ سچ بات تو یہ ہے کہ ہر دائرہ

ایک گھونسلے کی طرح ہے جس میں اس کا مرکزی نقطہ ایک پرندے کی طرح منقار زیرِ پر ہے یا شاید فطرت نے ہر مرکزی نقطے کے لئے ایک دائرے کا اہتمام کیا ہے۔ پرندے کو گھونسلا، بچے کو ماں کی گود اور زندگی کو زمین کی کوکھ عطا کی ہے۔ فطرت کی نظروں میں دائرہ بیک وقت زندگی کے لئے ایک ناقابلِ تسخیر فصیل بھی ہے اور ایک آرام دہ جھولا بھی! فطرت نے "زندگی" کا کس قدر خیال رکھا ہے!

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت وزیر آغا کے مضمون "ہجرت" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ مصنف اپنے آپ کو اپنے وجود کا قیدی محسوس کرتا ہے اور قید او آزادی کے حوالے سے بات کرتا ہے۔

تشریح:۔ لیکن قید اور آزادی تو یکسر اعتباری یا نسبتی باتیں ہیں یعنی قید اور آزادی بذا مطلق قید یا آزاد نہیں۔ بڑی سے بڑی آزادی کے گرد بھی ہمیشہ ایک دائرہ سا موجود رہتا ہے۔ ہر آزاد ملک بھی اپنی سرحدوں کے اندر قید ہے۔ بات صرف احساس کی ہے، جس کی وجہ سے ہم خود یا کسی کو قید یا آزاد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات تو میرا چھوٹا سا کمرہ بھی مجھے غیر محدود نظر آنے لگتا ہے اور کبھی کائنات کی غیر محدود فضائیں بھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ میں خود اپنے ہی جسم کی قید میں ہوں۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور احساس میرے اندر گدگدی پیدا کر دیتا ہے کہ اگر میرا جسم میرے ماتحت نہ ہوتا تو میں اپنے پانچوں حواس سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھ نہ سکتا۔ تو کیا میرا سارا آزادی کا احساس محض اس وجہ سے تو نہیں کہ میں اپنے جسم کا قیدی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر دائرہ ایک آشیانے کی مانند ہے جس کا مرکزی نقطہ ایک پرندے کی چوزے کی طرح ہے جو اس کے پروں تلے ہو یا شاید قدرت نے ہر مرکزی نقطے کے لئے ایک دائرہ فراہم کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے پرندے کو آشیانہ، بچے کو ماں کی گود اور زندگی کو زمین کا پیٹ دیا ہے۔ قدرت کی نگاہ میں دائرہ ایک ہی وقت میں زندگی کے لئے نہ تسخیر ہو سکنے والی شہر پناہ بھی ہے اور ایک آرام دہ جھولا بھی —— دیکھیئے قدرت زندگی کا کتنا خیال رکھتی ہے!

(۲)

میں اپنے معمولات کی ایک ایک شق پر نظر رکھتا ہوں۔ اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، ورزش کرنا اور نہانا یہ سب کچھ ایک خاص ضابطے کے ماتحت ہو تو جان کی سلامتی ہے ورنہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی بھی وقت کیا نہ ہو جائے! اگر کبھی اس قاعدے اور روش میں ذرا سی تبدیلی آتی ہے تو دل کسی انجانے خطرے کو محسوس کر کے کانپ اٹھتا ہے۔ فطرت نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ میں اس بنائی ہوئی گھاٹیوں سے ہرگز باہر نہ آؤں۔ جس طرح سورج کے طلوع و غروب میں ایک باقاعدگی ہے اور موسم ایک خاص ترتیب میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں، بالکل اسی طرح فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ میں اس کے ضابطۂ حیات سے سرِ مو انحراف نہ کروں۔ خود مجھے فطرت کی نرم اور ملائم انگلی کو تھام کر چلنے میں ایک عجیب سا سکون ملتا ہے، جیسے میری نبض اُس کی نبض سے ہم آہنگ ہو گئی ہو۔

حوالہ متن:- یہ عبارت وزیر آغا کے مضمون "ہجرت" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- مضمون میں ہجرت کے فلسفے پر بحث ہے جس کے آغاز میں مصنف بتاتا ہے کہ ہر شے بیک وقت قید بھی ہے اور آزاد بھی — چنانچہ وہ خود بھی وجود کا ہے۔ یہاں وہ اپنے معمولات کے حوالے سے بات کرتا ہے۔

تشریح:- میں اپنے روزمرہ کے معمولات کے ایک ایک جزو پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ میرا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، ورزش کرنا، نہانا سب ایک قاعدے کے مطابق ہو رہے ہیں تو اس میں جان کی امان ہے ورنہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی بھی وقت کیا ہو جائے۔ اگر میرے کسی قاعدے یا طرزِ عمل میں ذرا سی بھی تبدیلی آتی ہے تو کسی نامعلوم خطرے کے تحت کانپنے لگتا ہے۔ قدرت نے خود اس امر کا بندوبست کر رکھا ہے کہ ان بنائی ہوئی حدوں سے باہر نہ نکلوں۔ جس طرح سورج ایک خاص باقاعدگی کے ساتھ نکلتا اور ڈوبتا ہے اور موسم ایک خاص ترتیب سے ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں بالکل ایسے ہی قدرت چاہتی ہے کہ میں بھی زندگی کے اصولوں کو ذرا سا نظر انداز نہ کروں — خود مجھے بھی قدرت کی اس پابندی کے زیرِ اثر زندگی گزارنے میں

ایک عجیب طرح کا اطمینان محسوس ہوتا ہے، جیسے میری اور قدرت کی نبضیں ہم آواز ہو گئی ہیں یعنی جیسے اصول و ضوابط کی پابندی کے اعتبار سے میرا طرزِ عمل قدرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو گیا ہے۔

(۳)

اسی لئے، ہاں اسی لئے، اے دھرتی کے سینے سے چمٹے ہوئے لوگو! آؤ ہجرت کریں۔ ایک دوسرے کی طرف! پل بھر کے لئے ملیں اور پھر جدا ہو جائیں۔ جدا ہوں تو اس عزم کے ساتھ کہ ایک بار پھر ملاقات ہوگی۔ ہر ملاقات ہجرت کا ثمرِ شیریں ہے۔ تجدیدِ ذات ہے مگر اس کے اختصار ہی میں اس کا سارا حسن پنہاں ہے، کیوں کہ اگر ملاقات طویل ہو جائے تو پھر کہنے سننے کو کچھ نہیں رہتا۔ سب لوگ ایک دوسرے کیلئے کھلی کتاب بن جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو حفظ ہو جاتے ہیں۔ کوئی اسرار، کوئی حیرت زا بات نہیں رہتی اور جب زندگی سے حیرت منہا ہو جائے تو باقی صرف ٹیلیفون ڈائریکٹری بچتی ہے۔ ہر شخص کا ایک ٹیلیفون نمبر مقرر ہے۔ اسرار صرف اُس وقت نمودار ہوتے ہیں جب کسی دلچسپ سے رانگ نمبر سے رابطہ قائم ہو جائے مگر رانگ نمبر ڈائریکٹری میں درج نہیں ہوتا۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت وزیر آغا کے مضمون "ہجرت" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ ہجرت کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے مصنف ہجرت کی ترغیب دے رہا ہے۔

تشریح:۔ انہی وجوہ کی بنا پر جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اے انسانو! آؤ ہجرت کریں —— ہجرت کریں، ایک دوسرے کی جانب —— ایک دوسرے سے لمحے بھر کو ملیں اور پھر الگ الگ ہو جائیں —— جب الگ الگ ہوں تو اس ارادے کے ساتھ کہ ایک بار پھر ملیں گے —— ہر ملاقات دراصل ہجرت ہی کا میٹھا پھل تو ہے، ذات کو پھر سے تازگی بخشنے کے برابر ہے —— مگر —— ملاقات کی ساری خوبصورتی اس کے مختصر ہونے پر منحصر ہے، اسی میں اس کا حسن پوشیدہ ہے کیونکہ اگر ملاقات لمبی ہو جائے تو پھر

ہمارے پاس کہنے سُننے کی ساری باتیں کہہ سُن چکنے کے بعد مزید کچھ رہتا ہی نہیں۔ سب لوگ ایک دوسرے کے سامنے سراسر کھلی کتاب کی صورت بے نقاب ہو جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے عادات واطوار کے حافظ بن جاتے ہیں —— اس کے بعد کوئی راز کی بات، کوئی حیران کن امر باقی ہی نہیں رہتا اور جب زندگی سے حیرانی کا عنصر خارج کر دیا جائے تو زندگی صرف ٹیلی فون ڈائریکٹری بن کر رہ جاتی ہے۔ ہر شخص کا ایک ٹیلی فون نمبر مقرر ہے۔ راز صرف اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کسی دلچسپ غلط نمبر سے اتفاقیہ سلسلہ قائم ہو جائے مگر غلط نمبر تو ڈائریکٹری میں لکھے ہی نہیں ہوتے۔

الطاف حسین حالی

(غالب کا اچھوتا پن)

سوانحی خاکہ

ملاحظہ کیجئے ——— صفحہ ۲۶

اندازِ تحریر کی اہم خصوصیات

ملاحظہ کیجئے ——— صفحہ ۲۷

خلاصہ

غالب کا اچھوتا پن

میر و سودا اور ان کے پیروکار شعراء کے ہاں فارسی اُردو غزل کے پرانے اور قدیم مضامین ہیں۔ ان کے ہاں صرف الفاظ اور اسالیب کا تغیر ہی ملتا ہے۔ اس کے برعکس کلامِ غالب میں نئے اور اچھوتے مضامین ملتے ہیں وہ معمولی سے معمولی مضامین کو بھی نئی اداؤں اور نزاکتوں سے پیش کرتے ہیں۔ قدیم شعراء کے برعکس ان کے کلام میں مضامین اور افکار کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ مثلاً ان کا یہ شعر اچھوتے پن کا بہترین نمونہ ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

یہ ایک منفرد خیال اور زندگی کی صحیح ترجمانی ہے۔ کیونکہ انسان کی زندگی مختصر اور قلیل ہے۔ اسی لیے اس میں حرکت اور سرگرمی موجود ہے۔ انسان مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ

کام سرانجام دینا چاہتا ہے۔ اگر اسے دنیا میں زیادہ دیر رہنے کی مل مہلت مل جاتی تو وہ کاہل اور سست بن جاتا۔ غالب کے ہر شعر میں ایک نیا اور اچھوتا خیال موجود ہے یعنی غالب کے کلام میں جو لفظ بھی آتا ہے وہ بہت سے معنوں کا حامل ہوتا ہے۔ غالب کا درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اس شعر میں بالکل اچھوتا، نیا اور باریک خیال موجود ہے کہ انسان کی ہمت جس قدر بلند ہوگی۔ اسی قدر اس کی غیب سے مدد کی جاتی ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس شعر میں بھی نئی اور اچھوتی شوخی موجود ہے۔ یعنی میں نے جب بھی کسی گناہ کا ارتکاب کیا کوئی نہ کوئی حسرت پھر بھی باقی رہ گئی۔ یعنی جتنے گناہ کیے اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔ اس لیے اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ۔

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی لاج

اس شعر میں جدت اور اچھوتا پن موجود ہے کہ وطن سے دور مرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے پردیس میں مار کر اس کی بے کسی کی شرم رکھ لی۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اگر وفاداری کا دعویٰ کرو تو اسے نبھاؤ کیونکہ یہی ایمان کی اصل ہے۔ لہٰذا برہمن جو بت پرست ہو کر بت خانے میں ہی جان دیتا ہے اس بات کا مستحق ہے کہ اسے کعبے میں دفن کیا جائے۔ اگر دوستی کی جائے تو پھر اسے نبھانا ضروری ہے۔ غالب نے وفاداری کا سارا فلسفہ ان دو مصرعوں میں ادا کر دیا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے بیان کی تعریف میں اور شعراء نے بھی بہت کچھ کہا ہوگا۔ لیکن جو تعریف غالب نے کر دی ہے۔ اس سے بہتر تعریف ہو ہی نہیں سکتی اور یہی چیز کلامِ غالب کو دوسروں سے منفرد کرتی ہے۔

رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے

اگر دنیا میں ایسے باہمت لوگ موجود ہوتے تو دنیا کو فضول چیز سمجھ کر اس کی طرف نظرِ التفات نہ ڈالتے تو دنیا ایک ویرانہ بن جاتی۔ جس طرح میخانے میں بہت سے جام بغیر چھوئے رہ گئے یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ میخانے میں لوگ نہیں آئے بلکہ میخانہ خالی ہی رہ گیا۔ اسی طرح دنیا کا بارونق اور آباد ہونا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ دنیا میں باہمت لوگوں کی تعداد قلیل ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے۔

جو گناہ ہم سے دانستہ یا نادانستہ سرزد ہو گئے اگر ان کی سزا ملنا لازمی ہے تو جو گناہ ہماری دسترس سے پرے ہونے کی بنا پر ہم سے سرزد نہ ہو سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی۔ ان کی داد بھی ضرور ملنی چاہیے۔

کلامِ غالب میں جدتِ بیان و مضامین اور خیالات کے تنوع کے علاوہ بھی بہت سی ایسی خصوصیات موجود ہیں۔ جو ان کے کلام کو دوسرے شعراء سے منفرد اور ممیز کرتی ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۰۶ **مقلدین**۔ تقلید یا پیروی کرنے والے، پیروکار، قرن۔ جگ، زمانہ، مدتِ دراز، اولاً۔ پہلے، بہ تبدل۔ تبدیلی سے، بہ تغیر۔ تبدیلی سے، اسالیب۔ اسلوب کی جمع، محدود۔ گھرا ہوا، تنگ، متعدد۔ کئی، بلیغ۔ خوش بیان، اعلیٰ درجے کا کلام، سبقت۔ بازی، فکر۔ سوچ، مس کرنا۔ چھونا، سرِ مو۔ بال برابر، معمولی سا، انحراف کرنا۔ پھر جانا، ہٹ جانا،

صفحہ نمبر ۴۷ ؛ لیک - لکیر ؛ عالم - کیفیت ؛ نشاط - امنگ ؛ نشاطِ کار - کام کرنے کی امنگ ؛ خصلت - عادت ؛ قلیل - تھوڑا ؛ نرا - صرف ؛ بدولت وجہ سے ؛ سہل نگاری - سستی ؛ باندازۂ ہمت - ہمت کے مطابق ؛ عالی - بلند ؛ اشک - آنسو ؛ قطرۂ اشک - آنسو کا قطرہ ؛ قانع - قناعت کرنے والا، جو مل جائے اُسی کو غنیمت جاننے والا ؛

صفحہ نمبر ۴۸ ؛ فسونِ نیاز - عجز کا جادو، عاجزی کا منتر ؛ مقتضی ہونا - تقاضا کرنا ؛ بعید - دُور ؛ مرتکب ہونا - کرنا، انجام دینا ؛ بہ سبب عدم استطاعت کے - توفیق نہ ہونے کی وجہ سے ؛ خاطر خواہ - تسلی بخش، طبیعت کے عین مطابق ؛ دیارِ غیر - اجنبی ملک، پردیس ؛

صفحہ نمبر ۴۹ ؛ محمول کرنا - سمجھنا - گردانना ؛ استواری - پائیداری، استقلال ؛ قائل - بات کرنے والا ؛ سامع - سُننے والا ؛

صفحہ نمبر ۵۰ ؛ تمثیل - مشابہ ہونا - مشابہت - ڈرامہ، مثالیہ ؛ اہلِ ہمت - ہمت والے لوگ ؛ التفات - توجہ ؛ معدوم ہونا - بالکل نہ ہونا ؛ ناکردہ - نہ کیا ہُوا ؛ کردہ - کیا ہُوا ؛ جدّت - نیا پن ؛ طرفگی - عجیب ہونا، خوبی، عجوبہ ؛ شاذ و نادر ہی - شاید ہی ؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پہ رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آئے ہیں، وہی مضامین بہ تبدل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ اہلِ زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں۔ چنانچہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو، مرزا غالب کے سوا اہلِ زبان میں گزرے ہیں، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں

گے، جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے۔ کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں، جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں، جو سب سے نرالا ہے! اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں، جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس حالی کے مضمون "غالب کا اچھوتا پن" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:۔ غالب دوسرے اساتذہ سے موازنہ کر کے غالب کی شاعری کو اچھوتا ثابت کر رہے ہیں۔

تشریح:۔ میر، سودا اور ان کے دوسرے پیروکاروں نے اپنی غزل کی بنیاد پر استوار کی کہ جو عشقیہ مضمون صدیوں بلکہ زمانوں (یعنی مدتِ دراز سے) سے پہلے فارسی اور پھر اردو غزل میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ انہی کو لفظوں کی تبدیلی اور اندازِ تحریر کے ردوبدل سے عام قارئین کی بول چال کے معیار کو ملحوظ رکھ کر پیش کر دیا جائے — چنانچہ میر سے ذوق تک سوائے غالب کے جتنے بھی غزل کے شاعر گزرے ہیں، ان کی غزلوں میں ایسے مضمون بہت کم پائے جاتے ہیں جو اس تنگ دائرے سے باہر ہوں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے بھی کئی بار شعری صورت میں پیش کیا جا چکا ہے، اسے ایسے اعلیٰ درجے کے کلام کے معیار کے مطابق پیش کر دیا جائے کہ پہلی تمام کاوشوں سے بازی لے جائے اور لوگ مان جائیں کہ ایسی بندش مضمون کی یکسانیت کے باوجود پہلے کسی نے پیش نہ کی۔ اس کے برعکس غالب نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر استوار کی۔ ان کی غزلوں میں زیادہ تر ایسے نئے نئے مضمون پائے جاتے ہیں جن کو اور شاعروں کی سوچ نے چھوا تک نہیں (یعنی انہیں وہ خیال سوجھے ہی نہیں) اور پھر معمولی خیالات کو بھی ایسے طریقے سے شعری صورت میں پیش کیا کہ سب شاعروں کے مقابلے میں نرالے نظر

آتے ہیں اور ایسی ایسی نازک خیالیاں شعر میں پیش کر دی ہیں کہ پہلے اساتذہ کی اکثریت ان سے خالی ہے۔

(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے تو اوّل سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سرِمُو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے اگلوں نے راہ طے کی تھی، اسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اوّل شاہراہ کا رُخ چھوڑ کر دوسرے رُخ چلنا اختیار کیا، اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا، تو ان کو بھی آخر اسی رُخ پر چلنا پڑا، مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اس کے متوازی اپنے لئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر اور سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت حالی کے مضمون "غالب کا اچھوتا پن" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ حالی دوسرے اساتذہ سے موازنہ کر کے ثابت کر رہے ہیں کہ غالب تمام شعراء سے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔

تشریح:۔ قصہ مختصر، اور لوگ تو معلوم و مانوس راستے سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوئے، وہ تو اسی حال سے چلتے رہے جس حال سے دوسرے چلا کرتے تھے۔ غالب نے پہلے راستے کو ترک کر کے دوسرے ہی راستے پر چلنا شروع کر دیا، لیکن جب راستے کی تکلیفوں نے مجبور کر دیا تو انہیں بھی اسی رُخ پر چلنا پڑ گیا — لیکن — جس لکیر پہ قافلہ جا رہا تھا اس کے علاوہ ایک اور لکیر اسی کے متوازی اپنے لئے پسند کر لی اور جس چال

سے دوسرے چل رہے تھے، اسے چھوڑ کر نئی چال اختیار کر لی — چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر، سودا اور ان کے پیروکاروں کے کلام میں ایک ہی طرح کے خیال اور مضمون دیکھ دیکھ کر ہم اُکتانے لگتے ہیں اور اس کے بعد غالب کے دیوان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں کچھ اور ہی کیفیت نظر آتی ہے —— اور —— جس طرح خشکی کا سفر کرنے والا سمندر کے سفر میں یا ایک میدانی علاقے کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر بالکل نئی اور نرالی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے، اسی طرح غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی ہمیں ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت ملتی ہے۔

(۳)

پردیس میں مرنا، جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اس پر خدا کا اس لئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے، تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رُتبے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خریدار و غم خوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی، سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

حوالۂ متن: دی ہوئی عبارت حالی کے مضمون "غالب کا اچھوتا پن" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق: حالی دوسرے اساتذۂ فن سے موازنہ کر کے ثابت کر رہے ہیں کہ غالب کی شاعری سب سے اعلیٰ اور مختلف ہے۔ وہ اس کے بعض اشعار کی تشریح بھی بطور مثال کرتے ہیں۔

تشریح: اے وطن سے دور، کسی دوسرے دیس میں مرنا ہر شخص کو ناپسند ہوتا ہے، لیکن غالب اس پر خداوند کریم کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ وہ پردیس میں مر رہا ہے۔ وہ یوں کہ پردیس میں تو بغیر کفن کے لاش بغیر قبر کے بھی پڑی رہے تو کوئی حرج کی بات نہیں کہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ یہ لاش کس کی ہے جو یوں بے سر و سامانی کے عالم میں پڑی ہوئی ہے۔

انہیں مرنے والے کے مقام و مرتبے کا علم ہی نہیں ہوتا لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک دنیا ہم جاننے والی ہو مگر ان میں سے حقیقتاً ہمدرد اور بہی خواہ کوئی بھی نہ ہو، سخت ذلت کا باعث بنتا ہے۔ ایسے میں بہت بے عزتی ہوتی ہے۔ پس خداوند کریم کا شکر ہے کہ اس نے پردیس مارا، اپنے وطن میں نہیں مارا، یوں اس نے میری بے سروسامانی کی شرم رکھ لی — اس میں اگرچہ ظاہری طور پر تو خداوند کریم کا شکر ادا کیا گیا ہے مگر اصل میں اہل وطن سے شکائیت کا اظہار ہے — مگر — یہ اظہار بہت عجیب انداز میں کیا گیا ہے۔

حالی کی سوانح نگاری

سوانح نگاری کی حیثیت سے حالی کا مقام متعین کرتے ہوئے یہ کہہ دینا شاید مبالغہ نہ ہو کہ سوانح نگاری کا حق حالی اور صرف حالی نے ادا کیا ہے۔ اس لئے کہ سوانح نگاری کے لئے جس خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت نے عطا کر رکھا تھا اور وہ سوانح نگاری اور تاریخ نگاری کے فرائض کو بھی کماحقہ سمجھتے تھے اور یہی دونوں خوبیاں سوانح نگاری کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

سوانح نگاری کا فن خاصا کٹھن بھی ہے۔ اور سائنس اور تاریخ نگاری کے مشابہ ہونے کے باوجود نہ سائنس ہے نہ تاریخ نگاری۔ سائنس اور سوانح نگاری کا فن دونوں کے لئے مخصوص مواد کی ضرورت پڑتی ہے لیکن سائنسدان جذبات سے بلند تر ہو کر ایک ایسے تماشائی کی حیثیت سے مواد کو سمجھتا اور الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے جسے پیش کئے جانے والے تماشے سے ذاتی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ محض غیر جانبداری سے اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے دیکھتا ہے اور اس پر بے لاگ تبصرہ کرتا ہے جس میں وہ ذاتی تبصرہ شامل نہیں کرتا جبکہ سوانح نگار اپنا مواد پیش کرتے ہوئے غیر جانبدار نہیں رہے گا بلکہ اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر اس مواد کو ذاتی دلچسپی کے مطابق پیش کرتا ہے اور جہاں جہاں مناسب سمجھتا ہے رنگ آمیزی بھی کر لیتا ہے۔ اس رنگ آمیزی کی کوشش میں بعض اوقات وہ کچھ زیادہ ہی بلند پرواز بھی ہو جاتا ہے جس سے مبالغہ کا رنگ جھلکنے لگتا ہے لیکن یہ بات عین فطری ہے۔ اس لئے کہ سائنس دان ٹھوس حقائق کو ایک منطقی تسلسل کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ

اشیاء اور نظریات کی بحث میں ان اشیاء اور نظریات میں دلچسپی نہیں لیتا جب کہ سوانح نگار انسان ہوتے ہوئے اشیاء اور نظریات کی بجائے انسان ہی کا تذکرہ کرتا ہے اور پھر اس انسان کا تذکرہ کرتا ہے جس سے وہ پہلے متاثر ہوا ہے، بعد میں اس پر قلم اٹھاتا ہے۔ قریب قریب یہی امتیاز سوانح نگار اور تاریخ نگار میں مل جاتا ہے۔

تاریخ نگار ایک طویل داستان رقم کرتا ہے۔ اس لئے کوشش کرتا ہے کہ غیر جانبدار رہے اس کا کینوس ہی اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اسے غیر جانبدار رہنا ہی پڑتا ہے سوائے کسی کسی مقام کے جہاں بسا اوقات وہ کسی ایک یا زیادہ وجوہ کے پیش نظر غیر جانبداری کی روش سے کسی حد تک انحراف کر جاتا ہے۔ اس کے برعکس سوانح نگار کا کینوس محدود ہوتا ہے۔ وہ بہت سی شخصیتوں میں سے کسی کو منتخب کرتا ہے اور بہت سوں کو چھوڑ کر کسی کو منتخب کرتا ہے اور اس کے سوانح رقم کرنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے، تو ظاہر ہے بہت سوں میں سے جس کا انتخاب کرتا ہے اس سے اسے ذاتی طور پر دلچسپی اور اس سے ذاتی وابستگی ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی سبب سے اس شخصیت سے متاثر ہوتا ہے بلکہ اسی تاثر کی کمی بیشی کے مطابق بعض اوقات اس ہستی کی شخصیت سے مرعوب بھی ہوتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایسی شخصیت پر قلم اُٹھائے گا جسے وہ پسند کرتا ہے اور ذہنی طور پر اس کی عظمت کا قائل ہے تو اسے پیش بھی اسی انداز میں کرے گا کہ قاری بھی اس مخصوص شخصیت سے متاثر ہو بلکہ اس کی عظمت کا دل ہی دل میں قائل بھی ہو جائے۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ تاریخ نگار لکھتے ہوئے پیشِ نظر شخصیت کے ہر پہلو پر لکھتا ہے۔ کسی شخص کی زندگی کا کوئی خاص پہلو کسی مخصوص مقصد کے پیشِ نظر نظر انداز کر جانا تاریخ نگار کی حیثیت سے بددیانتی تصور ہو گا جبکہ سوانح نگار جس کا مقصد ہی اس شخصیت کو جسے وہ خود عظیم سمجھتا ہے قارئین سے یوں متعارف کرانا ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کے ہم خیال ہو کر اسے پسند کرنے لگیں تو وہ ارادی طور پر اس کی اچھائیوں کو ایسی رنگ آمیزی اور مبالغہ کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ کوئی بھی خوشگوار پہلو قاری کے ذہن میں جاگزیں ہونے سے رہ نہ جائے۔ وہ اکثر اوقات غیر ارادی اور بعض اوقات ارادی کوشش سے اس کے کمزور پہلو نظر انداز کر جاتا ہے یا ایسے دھیمے انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری کو وہ اہم پہلو معلوم

نہ ہوں بلکہ قاری اس کی اچھائیوں کو پڑھ چکنے اور ان سے متاثر ہو چکنے کے بعد ان کمزوریوں سے درگزر کر جائے اور انہیں کوئی اہمیت ہی نہ دے اور اس شخصیت کے بارے میں جو اس کی مجموعی رائے قائم ہو وہ بہر حال اس رائے کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جو خود سوانح نگار کی ہوتی ہے مگر وہ کھل کر اس کا اعتراف کرنے سے گریز کرتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس شخصیت پر قلم اٹھائے اس سے ذاتی طور پر متاثر ہو اور اس کی عظمت کا خود قائل ہو۔ دوسرے اس کی طبیعت میں انسان دوستی اور درگذر کا مادہ بہت ہو کہ وہ نہائیت ہمدردی سے اس شخصیت کے اچھے پہلو نمایاں کرے اور کمزور پہلو (اگر ان کا ذکر اشد ضروری نہ ہو) نظر انداز بھی کر سکے یا یوں پیش کرے کہ اس کی کمزوری اس کے اوصاف کے مقابلہ میں کم اہمیت کی حامل معلوم دے۔ تیسرے وہ اس شخصیت کے بارے میں پیش کرنے کے لئے اپنے پاس خاصا مواد رکھتا ہو۔ سوانح نگاری میں جتنی رکاوٹ کسی خاص شخصیت سے کم علمی اور حد سے زیادہ جذباتی وابستگی سے پیدا ہوتی ہے۔ شاید ہی کسی اور سبب سے پیدا ہوتی ہو۔ حد سے زیادہ جذباتی وابستگی کا شکار سوانح نگار سوانح نگاری کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا۔ وہ جانتے بوجھتے بعض ایسے کمزور پہلو بالکل نظر انداز کر جاتا ہے جو عوام کو پہلے سے معلوم ہوتے ہیں یا وہ اس کی کمزوری کا جواز پیش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ بات قاری کو کھٹکتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ سوانح نگار نے یہ روش اختیار کر کے بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ اس روشنی میں سوانح نگار کی حیثیت سے حالی ہمیں کیسے نظر آتے ہیں اور وہ کس حد تک سوانح نگاری کے اہل تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں ـــــــ "سوانح نگار کا دل صرف حالی کے حصے میں آیا تھا"۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے بہت صحیح اور حالی کی شخصیت کی آئینہ دار ہے حالی طبعاً شریف اور اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔ وہ فطری طور پر انسان دوست، مہربان، درگذر کے عادی انسان اور انسانیت کی عظمت کے علمبردار، ہمدرد اور ٹھنڈی طبیعت کے مالک تھے۔ پھر انہوں نے صرف ان ہی شخصیتوں پر قلم اٹھایا جن سے وہ متاثر تھے اور جن کی عظمت کے وہ قائل تھے اسی لئے انہوں نے سوانح نگاری کا حق بھی ادا کر دیا اور ان

لوگوں کی واضح اور قابل ذکر اچھائیوں کے ساتھ محض زیبِ داستان کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیوب کی تلاش نہیں کی بلکہ حتی الامکان ان کی کمزوریوں کو نظر انداز کیا ہے یا ایسے دھیمے لہجے میں ان کا ذکر کیا ہے کہ قاری بھی درگزر کر جاتا ہے اور اس کے ذہن پر اس کا ناگوار نقش نہیں اُبھرتا البتہ بعض جگہ حالی نے زیادہ کھل کے محاسن کا ذکر کر کے اور ممدوح کی کمزوریوں کو یکسر پسِ پردہ ڈال کر یا ان کے جواز پیش کر کے ٹھوکر بھی کھائی ہے۔

حالی نے سرسید کی عظمت کا قائل ہو جانے کے بعد دوسروں کو اس عظمت کا قائل کرنے کے نظریہ سے "حیاتِ جاوید" لکھی اور جس انداز میں لکھی اس کی ایک جھلکی انہیں کے لفظوں میں یوں نظر آتی ہے :-

"اگرچہ ہندوستان میں ہیرو کے عیب وخطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضلوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بایوگرافی کرانیکل طریقہ سے لکھی جائے۔ اس کی تمام خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں"۔ دیباچہ کے یہ الفاظ پڑھ لینے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ حالی سرسید کے بارے میں حد سے زیادہ ہی جانبداری کا دامن پکڑ چکے ہیں اور ان کی کسی بھی کمزوری کو محض اس لئے نظر انداز کر جائیں گے یا اس کمزوری کا جواز پیش کر جائیں گے کہ سرسید کی شخصیت کا تاثر ناگوار نہ ہو جائے۔ اس قدر جانبداری کو ہم حالی کی کمزوری ہی کہیں گے کہ پیشِ نظر شخصیت کی کمزوریوں کا خواہ مخواہ جواز پیش کرنا سوانح نگار کے فرائض میں شامل نہیں اور یہاں ہم محسوس کرتے ہیں کہ حالی زیادتی کر گئے ہیں کہ تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرتے ہیں۔ اور تاریک پہلو میں بھی تاریکی کو روشنی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ خود ہی لکھتے ہیں :-

"اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا"۔ یہاں ہم بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ حالی نے کمزور طبیعت کا مظاہرہ کیا ہے اور سوانح نگار کی حیثیت سے زیادتی کر گئے ہیں۔ ہر شخصیت میں بعض کمزوریاں ہوتی ہیں اور انسان ہوتے ہوئے کسی کمزوری کا موجود ہونا یا خلوصِ قلب سے کئے گئے کسی کام میں اتفاق سے سچائی کا نہ ہونا بھی عین ممکن ہے سوانح

نگار کے فرائض میں یہ قطعاً شامل نہیں کہ کسی مخصوص شخصیت کے بارے میں پہلے ہی سے فرض کرلے کہ اس کا کوئی کام سچائی سے خالی نہیں اور پھر اسی مفروضہ کے پیشِ نظر بقول مولانا شبلیؒ مدلل مداحی شروع کر دے اور قارئین کے سامنے ایک نامکمل اور یک رُخی تصویر رکھ کر ان سے زبردستی منوانے کی کوشش کرے کہ ہم جس شخصیت کا تذکرہ کرتے ہیں اس میں عیب نہیں۔ اس امر کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ سکتے اور ایسا کہنے میں حق بجانب بھی ہیں کہ حالی عظیم سوانح نگار ہوتے ہوئے سوانح نگاری کے فن کو اس غیر ضروری جذباتی وابستگی کے سبب مجروح کر گئے ہیں۔

"یادگارِ غالب" کو لیجئے۔ اس میں غالب کی ایسی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو سراسر معائب سے پاک اور سرتاپا محاسن ہے۔

انہوں نے غالب کی ذاتی زندگی کے اکثر ایسے پہلو بالکل ہی نظر انداز کر دیئے ہیں جو زباں زدِ عام تھے۔ اور ان کو یکسر نظر انداز کر کے حالی نے سوانح نگار کی حیثیت سے ایک فن کار کے صحیح فرائض انجام نہیں دیئے۔ انہوں نے غالب کی ذاتی زندگی کے کئی پہلوؤں، مذہبی نظریات اور ان کی بعض اخلاقی کمزوریوں پر یکسر پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ ان کی کمزوری ہی کہلائے گی۔

"حیاتِ سعدی" میں حالی نے سعدی کی زندگی کے حالات رقم کئے مگر اپنی طبیعت کے ہاتھوں ٹھوکر کھا گئے۔ وہ شیخ سعدی کے متعلق اسی کتاب سے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ اسلام کے قدیم مصنفوں میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی عظمت اور جلالت کے سامنے شیخ کو کچھ رُتبہ نہیں مگر ہم نے سب سے اوّل شیخ کا حال اس لئے لکھا ہے کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان مصنف مقبول اور مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعراء میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے رُتبے کو نہیں پہنچا" یہ پڑھ چکنے کے بعد کتاب کو شروع کرنے سے قبل ہی قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ حالی شیخ سعدی مرحوم کی سوانح لکھتے ہوئے ان کی تحریروں کے محاسن واضح کرنے پر اپنا زورِ قلم صرف کر جائیں گے اور ذاتی زندگی کے بارے میں سب کچھ نہیں بتائیں گے بلکہ محاسن کو زیادہ نمایاں کر کے انہیں عظیم شاعر اور مصنف تو ثابت کر جائیں گے مگر انہیں عظیم انسان کی حیثیت سے پیش

کرتے ہوئے ان کے بعض پہلو عمداً نظر انداز کر جائیں گے۔ شیخ سعدی سے وہ اس حد تک غیر ضروری جذباتی وابستگی رکھتے ہیں کہ جہاں کہیں شیخ صاحب سے سہواً غلطی بھی ہوئی ہے، بلکہ اگر کسی جگہ انہوں نے حقائق بیان کرتے ہوئے انحراف بھی کیا ہے تو اس کے لئے بھی جواز پیش کر دیئے ہیں۔ مثلاً بعض جگہ سعدی نے واقعات صحیح بیان نہیں کئے۔ حالی انہیں پیش نظر رکھ کے یوں ان کا جواز پیش کرتے ہیں۔ کہ اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت کے تحت کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیال کی رو میں بہہ کر دور جا پڑتا ہے۔ ان کمزوریوں کے باوصف جن کا تذکرہ ہم نے ابھی کیا ہے، حالی کے عظیم سوانح نگار ہونے میں کوئی شبہہ نہیں اور ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اس فن میں ان کا اور کوئی حریف پیدا نہ ہو سکا اور ان فنی خرابیوں کے باوجود انہوں نے جن شخصیتوں پر قلم اٹھایا ان کو قارئین سے بہت حد تک کامیابی سے روشناس کرایا بلکہ انداز کی خامی کو بعض لوگوں نے برا محسوس نہیں بھی کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ حالی نے کہیں کہیں ہیرو کی لغزشوں کا بھی ذکر کیا ہے اور جس قدر کیا ہے اس سے زیادہ کی کسی سوانح نگار سے توقع کرنی بے فائدہ ہے کہ اس کا قلم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ سوانح نگار بنیادی طور پر اس شخصیت سے متاثر ہوتا اور اس کی عظمت کا قائل ہوتا ہے۔ بہر حال ماننا پڑتا ہے کہ حالی بہت بڑے سوانح نگار تھے اور اس مخصوص فن میں کوئی ان سا نہ ہوگا۔

مولانا شبلی نعمانی

(سرسید اور اُردو لٹریچر)

سوانحی خاکہ

مولانا شبلی نعمانی کی ولادت مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں نبدول میں ہوئی۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ میں وکیل تھے۔ اعظم گڑھ میں مولوی شکراللہ سے ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد شبلی مولانا فاروق چڑیاکوٹی سے عربی، فارسی ادبیات اور منطق و فلسفہ پڑھا یہ تعلیم غازی آباد میں حاصل کی۔ اس کے بعد آپ رام پور چلے گئے۔ جہاں آپ نے مولانا ارشاد حسین سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے "حماسہ" اور سہارنپور کے مولانا محمد علی سے علم حدیث پڑھا۔ انیس برس کی عمر میں حرمین شریف کا سفر کیا۔ مدینہ منورہ گئے۔ مختلف کتب خانوں کی سیر کی اور پھر واپس آکر شاعری اور ادب کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

آپ کے والد مولانا فاروقی وکالت کرتے تھے اور خاصے صاحبِ حیثیت آدمی تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ شبلی تجارت کا پیشہ اختیار کریں مگر انہیں یہ پیشہ اپنی طبیعت کے مطابق نہ لگا اور چھوڑ دیا۔ پھر والد ہی کے اصرار پر وکالت کا امتحان پاس کیا اور انہی کی خواہش پر وکالت شروع کی مگر جلد ہی بددل ہو گئے اور وکالت بھی ترک کر دی اور "امین دیوانی" کی ملازمت اختیار کر لی مگر انہیں یہ ملازمت بھی راس نہ آئی اور آپ گھر بیٹھ گئے۔ آپ کے چھوٹے بھائی علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔

۱۸۸۱ء میں اپنے والد کی معیت میں ان کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی۔ اس ملاقات میں سرسید نے شبلی کا لکھا ہوا عربی مدحیہ قصیدہ پڑھا تو بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں عربی اور فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی ایک خالی آسامی پر شبلی کا تقرر ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اب شبلی کو سرسید کی صحبت اور لائبریری سے بھرپور استفادہ کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ہی آپ پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور اسے فارسی زبان سکھائی۔

۱۸۹۲ء میں شبلی نے آرنلڈ ہی کے ہمراہ قسطنطنیہ کا سفر کیا اور ۶ ماہ تک بلادِ اسلامیہ کی سیاحت بھی کی۔ واپسی پر سفر نامۂ روم و شام لکھا۔ اور اپنی تصنیف "الفاروق" کے لئے مواد بھی فراہم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں اعظم گڑھ میں مقیم ہوگئے اور ندوۃ العلماء میں دلچسپی لینے لگے۔ مگر اس تعلق کو زیادہ عرصہ قائم نہ رکھ سکے اور ادارہ "دار المصنفین" قائم کیا اور اپنا مکان، باغ اور لائبریری سب کچھ اس کے لئے وقف کر دیا۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔

شبلی کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) سیرۃ النبی (۲) شعر العجم (۳) الفاروق (۴) سیرۃ النعمان (۵) المامون (۶) الکلام (۷) علم الکلام (۸) موازنۂ انیس و دبیر (۹) الغزالی (۱۰) سوانح مولانا روم (۱۱) سفرنامہ روم و شام (۱۲) تاریخِ اسلام (۱۳) مضامینِ عالمگیر (۱۴) مکاتیبِ شبلی۔

شبلی کے اسلوبِ تحریر کی خصوصیات

شبلی اُردو کے عناصرِ خمسہ میں سے ہیں چنانچہ ان کے اسلوبِ تحریر میں بھی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو سر سید کے دبستانِ نثر سے مخصوص ہیں مثلاً سادگی، بے ساختگی اور استدلال وغیرہ — تاہم ان کی تحریر کی کچھ نمایاں خصوصیات ایسی ہیں جو ان کی نثر کو ان کے دوسرے ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شبلی کے اسلوب میں مندرجہ ذیل نمایاں خصوصیات ہیں:۔

۱۔ عبارت کی خوبصورتی

شبلی کی شاعرانہ طبع جگہ جگہ اپنا رنگ دکھاتی ہے جس سے ان کی نثر میں شاعرانہ عناصر داخل ہوگئے ہیں نیز اُردو نثر میں فارسی اشعار اور شعری تراکیب کا استعمال بھی ان کے ہاں عام ملتا ہے مگر یہ اشعار اور شعری تراکیب ان کی نثر میں اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ ہم آہنگی کی بڑی خوبصورت فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر کی یہ خوبصورتی محمد حسین آزاد اور سر سید کے اسالیب کا دلپذیر امتزاج لگتی ہے۔

۲۔ الفاظ کی تکرار

بعض مقامات پر وہ الفاظ کی تکرار سے بھی لہجے اور آہنگ میں خوبصورتی پیدا کرتے ہیں جن میں الفاظ و تشبیہات کے محتاط انتخاب اور ان کے موزوں استعمال نے اور بھی رنگ آمیزی کی ہے۔

۳۔ جوش

شبلی ایک عظیم ادبی شخصیت ہیں۔ اُنہیں خود بھی اپنی عظمت اور کمال کا پورا پورا احساس ہے۔ اسی احساس نے ان میں وہ جوش پیدا کیا ہے جو ان کے اسلوبِ بیان کی نمایاں صفت بن گیا ہے۔ ان کی تحریر پڑھ کر قاری کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور تخیّل میں ہلچل مچ جاتی ہے وہ انتہا پسند طبیعت کے مالک ہیں اور شوخی، طراری اور ہیجان کو پسند کرتے ہیں انہیں جوش انگیز اور ہنگامہ آفرین مضامین ادا کرنے میں بے حد مسرت محسوس ہوتی ہے خود راجپوت خاندان سے تعلق نے بھی ان کے اندر فخر و برتری کا شدید احساس پیدا کر دیا۔ جس کا اظہار عموماً ان کے طریقِ تخاطب سے ہوتا ہے۔ وہ قاری سے یوں مخاطب ہوتے ہیں جیسے کوئی اُستاد اپنے شاگردوں سے یا ایک خطیب کسی عام مجمع کے لوگوں سے خطاب کرتا ہے مثلاً "جیسے تم بھی جانتے ہو" "تم غور کرو" وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ ایجاز و اختصار

اس جوش اور قوت کا وسیلہ ایجاز و اختصار ہے ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بھی وہ معانی پوشیدہ ہوتے ہیں جو بسا اوقات پورے پورے صفحات میں بھی نہیں سماتے۔ اس ایجازِ بیان کا ایک ذریعہ استعارہ ہے جو شبلی کی تحریروں کی جان ہے۔ وہ مولانا محمد حسین آزاد کی طرح تشبیہوں یا مراۃ النظیر کے سلسلوں میں نہیں اُلجھتے۔ حالی کی طرح ان کی تحریروں میں تمثیلوں کی بھرمار بھی نہیں۔ ان کا پسندیدہ حربہ جوش انگیز استعارہ یا پُرلطف کنایہ ہے۔ ان کی نثر میں ایجاز کی تکمیل کا ایک ذریعہ روزمرہ و محاورہ ہے جو ان کی عبارت میں چستی پیدا کرتا ہے ان کے محاورے بھی مولانا نذیر احمد کے محاوروں کی طرح ذوقِ سماعت پر گراں نہیں گزرتے اور نہ ہی ان سے طبیعت میں کوئی اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ شعریت

شبلی بہت بلند شعری ذوق کے مالک تھے۔ چنانچہ شبلی کی نثر کی ایک خاص خوبی اس کی شعریت بھی ہے۔ وہ عبارت میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے شاعرانہ وسائل سے کام لیتے ہیں۔ انہوں نے استعارے، کنائے، ترکیبیں اور جذبات انگیز الفاظ بڑی خوبصورتی اور سلیقہ مندی سے استعمال کئے ہیں۔ شاعرانہ فضا قائم کرنے کے لئے انہوں نے اشعار کے استعمال سے بھی بڑا کام لیا ہے چنانچہ وہ جا بجا برمحل اشعار کے استعمال سے وسیع معانی اور علمی مطالب کو رنگین، مختصر اور

دلکش پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔ شبلی کا شعری مذاق بھی بہت بلند تھا۔

خلاصہ
سرسیّد اور اردو لٹریچر

اردو لٹریچر کو سرسید نے ذرّے سے آفتاب بنادیا۔ انہوں نے اردو زبان کو عشق و عاشقی کے دائرے سے نکال کر سیاسی، اخلاقی، سائنسی، تاریخی اور مذہبی مضامین سے متعارف کروایا۔ ملک کے بہت سے انشاء پردازوں نے سرسید سے فیض اٹھایا سرسید خود مفتی صدر الدین خان آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائیؒ سے متاثر تھے۔ اسی لیے انہوں نے تصنیف و تالیف کے مشغلے کو اپنایا۔ انہوں نے ۱۸۴۷ء میں دلی کی عمارتوں کے متعلق ایک کتاب آثار الصنادید لکھی۔ اس میں بیدل اور ظہوری کا رنگ غالب ہے۔ جب غالب نے مکتوب نگاری شروع کر کے مکاتیب کو مکالمہ بنادیا۔ تو سرسید ان کی طرزِ تحریر سے بھی متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں ملک میں اردو اخبار کا اجراء ہوا تو اردو انشار پردازی کو فروغ ملنے لگا۔ اسی دوران ۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو میں جتنے موضوعات پر لکھا ہے۔ فارسی اور اردو کے کسی شاعر اور ادیب نے اتنے موضوعات پر نہیں لکھا۔ ایڈیسن اور اسٹیل کے متعدد مضامین کو سرسید نے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ انہیں علمی مسائل پر بحث کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ انہوں نے مشکل ترین مسائل کو بھی بڑی فصاحت، صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا۔ مذہبی مسائل کو بھی انہوں نے اردو زبان میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی تحریروں میں ظرافت اور شوخی بڑے مہذب اور لطیف انداز میں ملتی ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۵۱ :- بارياب ہونا - حاضری دینا ؛ محویت - مصروفیت ؛ گام فرسا ہو: چلنا ؛
صفحہ نمبر ۵۲ :- سررشتہ - محکمہ ؛ ریفارمیشن - اصلاح ؛ بارِ احسان - احسان کا بوجھ ؛
صفحہ نمبر ۵۳ :- میلان - رجحان ؛ مبسوط - جامع ؛ اقتضا - تقاضا ؛ مکاتبات - مکتوبات ، مکاتیب ، خط (جمع) ؛
صفحہ نمبر ۵۴ :- نثار - نثر نگار ؛ بزم - مجلس ؛ رزم - میدان جنگ ؛
صفحہ نمبر ۵۵ :- مساعدت کرنا - ساتھ دینا ؛ دلآویزی - خوبصورتی ؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اُٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل اُن کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دُور سے فیض اُٹھایا ہے۔ بعض نے مدّعیانہ اپنا الگ رستہ نکالا، تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے۔

حوالۂ متن :- یہ عبارت شبلی کے مضمون "سرسید اور اردو لٹریچر" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق :- سرسید کی ادبی خدمات کے حوالے سے سرسید اور اس کے ہم عصروں کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔

تشریح :- آج ملک میں جتنے بھی بڑے بڑے مضمون نگار ہیں اور اپنے اپنے میدان میں اپنا سکّہ جما چکے ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس کا سرسید کے احسان کے بوجھ سے خم نہ ہو یعنی کوئی نہیں جس نے سرسید سے استفادہ نہ کیا بلکہ بعض تو ان سے براہ

راست تربیت حاصل کی۔ بعض نے تو دور ہی سے دور فائدہ اٹھایا جبکہ بعض نے مخالف رنگ میں اپنے لئے نئی ہی طرز منتخب کر لی، پھر بھی ہر صورت میں سارے ہی مضمون نگار سرسید کے اثر سے انکار نہیں کر سکتے۔

(۲)

"آثار الصنادید" جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لئے انہوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، حسرت و خوشی، حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشاپردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔

حوالہ متن:- یہ عبارت شبلی کے مضمون "سرسید اور اردو لٹریچر" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- سرسید کی ادبی خدمات کے حوالے سے شبلی سرسید اور ان کے ہم عصروں کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ وہ ثابت کر سکیں کہ سرسید کا اثر ان کے تمام ہم عصروں کی تحریروں میں موجود ہے۔

تشریح:- جس زمانے میں "آثار الصنادید" شائع ہوئی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد (تقریباً ۱۸۵۰ء میں) دہلی کے مشہور شاعر غالب نے بھی اردو کی طرف اپنی توجہ مبذول کی یعنی اردو میں خط لکھنے شروع کئے ـــ چونکہ وہ جس طرف بھی توجہ دیتے تھے اپنے لئے رستہ الگ ہی بناتے تھے (یعنی وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے، انداز تحریر منفرد ہی رکھتے تھے) اس لئے انہوں نے اپنے عہد کے تمام لکھنے والوں کے برعکس خط کو گفتگو کا پیرایہ عطا کر دیا۔ خطوں میں

وہ اس طرح اپنا مافی الضمیر بیان کرتے تھے جیسے دو شخص آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بہت سے خطوں میں انسانی جذبوں مثلاً دکھ، تکلیف، حسرت، خوشی، بے چارگی وغیرہ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔ انہوں نے اکثر واقعات اس بے ساختگی کے ساتھ بیان کئے کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اردو مضمون نگاری کا آج جو انداز ہے اور جس کے بانی سرسید ہیں، اس کی اصل بنیاد دراصل غالب ہی نے رکھی تھی۔

(۳)

سرسید کی انشا پردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی، اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لئے اگر کسی علمی مسئلے کو اردو میں لکھنا چاہا تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

<u>حوالۂ متن</u>:۔ یہ عبارت شبلی کے مضمون "سرسید اور اردو لٹریچر" سے لی گئی ہے۔

<u>سیاق و سباق</u>:۔ سرسید کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے شبلی سرسید کے اندازِ تحریر کی خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں اور ہم عصروں کے ساتھ موازنہ کر کے یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ ہم عصروں نے سرسید سے اثر قبول کیا۔

<u>تشریح</u>:۔ سرسید کی مضمون نگاری کی خوبیاں اس وقت اعلیٰ پائے کی معلوم ہوتی ہیں جب وہ کسی علمی مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ چونکہ اس سے پہلے اردو زبان کو کبھی علمی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا گیا تھا، اس لئے اس میں علمی اصطلاحوں، لفظوں اور تلمیحوں کی کمی ہے — اس لئے علمی مسائل پر اردو میں لکھتے ہوئے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ لیکن — سرسید نے مشکل سے مشکل مسئلے کو اس قدر تشریح، سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا ایک دلچسپ قصے کی طرح لطف اٹھاتا ہے۔

(۴)

سرسید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعراء اور نثار گزرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔ فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے، سعدی رزم کے مرد میدان نہیں، نظامی رزم بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں، ظہوری صرف مزاحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے —— تم دیکھ سکتے ہو کہ اس میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور اس میں کس قدر درد و اثر پیدا کیا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت شبلی کے مضمون "سرسید اور اردو لٹریچر" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ سرسید کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے شبلی سرسید کے ہم عصروں کے انداز تحریر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اور پچھلے اساتذۂ فن کا بھی —— تاکہ وہ ثابت کر سکیں کہ سرسید کا انداز تحریر سب سے اچھا تھا۔

تشریح:۔ سرسید کی مضمون نویسی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سرسید نے قریب قریب ہر موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور جس موضوع پر بھی لکھا ہے اسے اس مرتبے پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے آگے بڑھنا ممکن ہی نظر نہیں آتا۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شاعر اور نثر نگار گزرے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے لکھتے ہوئے ہر مضمون کا حق ادا کر دیا ہو۔ فردوسی مجلسی زندگی کے حوالے سے نہیں لکھ سکتا، صرف جنگ کے حوالے سے لکھ سکتا ہے۔ سعدی مجلسی زندگی کے حوالے سے بہت اچھا لکھتے ہیں مگر جنگ کے حوالے سے نہیں لکھ سکتے۔ نظامی مجلسی زندگی اور حربی زندگی دونوں ہی کے استاد ہیں لیکن وہ اخلاقیات کے موضوع پر نہیں لکھ سکتے۔ ظہوری صرف مزاح تخلیق کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس سرسید نے اخلاق، مجلسی زندگی سیاست، قدرتی مناظر وغیرہ ہر موضوع پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، اسے آپ خود مشاہدہ کر کے دیکھ سکتے ہیں کہ کس قدر

درد انگیز اور اثر آفرین ہے۔

(۵)

سرسید کو مرزا غالب سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے اردو اخبار جاری ہو گئے اور اردو انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا۔ اسی لئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ تاہم انشاء پردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے "تہذیب الاخلاق" کا پرچہ نکالا اور اردو انشا پردازی کو اس رتبہ پر پہنچا دیا جس کے آگے اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہیں۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت شبلی کے مضمون "سرسید اور اردو لٹریچر" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ شبلی سرسید کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ سرسید کی تحریر کی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ان کے ہم عصروں اور سابقہ اساتذۂ فن کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ تاکہ ان کا سرسید کے ساتھ موازنہ کیا جا سکے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ ثابت کر سکیں کہ سرسید طرزِ تحریر کے اعتبار سے سب سے اہم ہیں۔

تشریح:۔ سرسید کے مرزا غالب کے ساتھ جو تعلقات تھے وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے ضرور مرزا کے طرزِ تحریر سے فائدہ اٹھایا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے سے اردو اخبار نکلتے تھے اور ان کی تعداد بھی خاصی تھی۔ اس سے اردو مضمون نویسی کو ترقی مل رہی تھی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، معاشرتی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے ہر قسم کے مضامین لکھے جاتے تھے —— پھر بھی مضمون نگاری کا کوئی خاص اسلوب مقرر نہیں ہوا یعنی مضامین لکھے تو کثرت سے جا رہے تھے مگر اردو مضمون نگاری ابھی کسی خاص اسلوب سے عاری تھی —— اس کے علاوہ جو کچھ بھی تھا، ابھی ابتدائی حالت ہی میں تھا۔ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں سرسید نے قوم کی حالت کو سنوارنے کے لئے اصلاحِ قوم کی ٹھانی تو

"تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا —— اور —— پھر اُردو مضمون نگاری کو اس مقام بلند تک پہنچا دیا جس سے بہتر لکھنا ممکن ہی نہ رہا۔

شبلی کی ادبی خدمات

انیسویں صدی کے وسط میں اُردو کو جو علمی و ادبی سرپرستی حاصل ہوئی اس میں مولانا شبلی کا نام اہمیّت کا حامل ہے —— سر سیّد کے رفقاء نے اُردو نثر کو قصے کہانیوں کی زبان سے نکال کر علمی و ادبی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان ہی کی مساعی سے اُردو نثر توانا ہوئی اور اس مقام تک پہنچ گئی کہ کسی بھی ترقی یافتہ زبان کی ہمسری کر سکے۔ اسی توانائی کی بدولت وہ سر سیّد کے اصلاحی پروگرام کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی اس دَور کی نثر کی خصوصیّات میں سب سے زیادہ مقصدیّت اور عقلیّت غالب ہے۔ نثر میں منطقی استدلال اور سائنٹیفک طریقہ اظہار پر زور دیا جاتا ہے۔ تخیّلی اظہار کے مقابلے میں منطقی انداز بیان کو فوقیّت حاصل ہے مولانا محمد حسین آزاد کے علاوہ باقی تمام بزرگ سیدھی سادی نثر پر زور دیتے تھے۔ سر سید نے تو مقصدیت کے سامنے اپنی نثر کی ظاہری خوبیوں کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ حالی نے سر سیّد کے اتباع میں سیدھی سادی عبارت پر اس قدر زور دیا کہ ان کی نثر بھی بعض اوقات سپاٹ ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد نے عمومی زبان اختیار کی اور اگرچہ اس زبان میں عربی الفاظ و فقرات کی ملاوٹ بھی ہے تاہم ان کا لہجہ عمومی ہے لیکن شبلی کے براہِ راست طریقہ اظہار میں ادبی حسن اور لطافت بیان کے ساتھ ساتھ انتہائی جوش پایا جاتا ہے۔ ان کی نثر میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔

شبلی نے اپنے مخصوص اسلوب میں تاریخ، سوانح، تنقید، عملی تنقید، علم الکلام اور فقہ و حدیث کو اپنا موضوع بنایا وہ اپنی تصانیف میں تحقیق، فراہمی مواد اور تدوین پر بڑا زور دیتے ہیں۔ اُردو میں مغربی انداز کا تحقیقی ذوق سب سے پہلے مولانا شبلی ہی کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ مولانا شبلی کا خاص میدان تاریخ ہے۔ سر سیّد کے زیر اثر انھوں نے تاریخ اسلام لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں ناموران اسلام کی سوانح عمریاں لکھنا شروع کیں "الفاروق"، حضرت عمر فاروقؓ اعظم کی سوانح حیات ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس عہد کی تاریخ بھی ہے۔ اسی طرح "المامون"، خلیفہ مامون الرشید کی سوانح اور اس کے عہد کی

تاریخ ہے۔ شبلی کی سب سے اہم تصنیف "سیرت النبیؐ"، جس میں اُسوہ رسولؐ پہ بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور قبل بعثت رسولِ پاکؐ سے لے کر آپؐ کے زمانے کی تاریخ کی تدوین پوری تحقیق سے کی گئی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ "سیرت النعمانؒ، الغزالیؒ، الکلام، علم الکلام، سوانح مولانا روم، شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر"، سفرنامہ روم، و مصر و شام"، اورنگ زیب عالمگیر پہ ایک نظر"، اور مختلف علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی مضامین و مقالات شامل ہیں۔ ان تصانیف میں "شعر العجم"، اور "موازنہ انیس و دبیر"، تنقیدی تصانیف ہیں۔ بحیثیت نقاد شبلی کا مقام اُردو ادب میں منفرد ہے۔ حالی بھی شبلی کے عہد کے نقاد ہیں لیکن حالی اپنی تنقید میں مغرب کے تنقیدی اصولوں سے متاثر ہیں اور اس طرح کہیں کہیں وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شبلی کی تنقید خاص مشرقی انداز کی ہے۔ مشرقی شاعر میر انیس کو سمجھنے میں شبلی کے مشرقی مذاق تنقید کا بڑا اثر ہے۔ "شعر العجم"، اور موازنہ انیس و دبیر ان کے خالص مشرقی مذاق تنقید کے نمونے ہیں :-

حافظ محمود شیرانی

تنقید بر آب حیات

میر امن کی "باغ و بہار" اور محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" اردو نثر کی دو ایسی کتابیں ہیں جو اردو نثر میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گی۔ آزاد ایک صاحب طرز ادیب ہیں ان کی زبان سادہ و رنگین ہے۔ آب حیات ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اردو فارسی میں اس انداز اور مرتبہ کی کوئی کتاب نہیں۔ اس کتاب میں بہت سی خصوصیات ہیں جو آزاد کے منفرد اسلوب کی بنا پر ہیں۔ مثلاً نثر سادہ فقرے چھوٹے رنگ آمیزی، عبارت کا بانکپن، بیان کی شوخی، لطیفوں اور چٹکلوں کی بہتات، تاریخ میں افسانے کا ڈھنگ اور نثر میں نظم کا لطف وغیرہ

آب حیات کا مواد حاصل کرنے کے لیے آزاد کو بڑی کوشش کرنی پڑی۔ ملک بھر کے شعراء و ادباء وغیرہ نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی۔ انہوں نے بذریعہ خط ان حضرات سے امداد چاہی۔ اس طرح سات سال کی محنت و ریاضت سے یہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچی۔ آزاد نے بہت سی جگہ پر ملکا ان کے تحریری شواہد پیش نہیں کیے۔ اس کے لیے بعد میں بدنامی اٹھانا پڑی۔ بعض جگہوں پر انہوں نے ذاتی رقابت اور مقابلے کے پہلو کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ سودا کو میر کا، مصحفی کو انشا کا، ناسخ کو آتش کا، ذوق کو غالب کا دبیر کو انیس کا مدِ مقابل ٹھہرایا ہے۔

آزاد نے آب حیات میں شعراء کے جو تین ادوار قائم کیے ہیں۔ ان شعراء کی ترتیب اعتراض سے خالی نہیں۔ ہمارے ہم عصر شعراء نے ان پر کافی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض نے قصے کہانیوں کو آب حیات کی بنیاد قرار دیا۔ حالانکہ انہیں پتہ نہیں کہ جب آب حیات تالیف ہوئی۔ اس وقت ذرائع معلومات نہایت محدود تھے۔ بہر حال جو اطلاعات ہم آب حیات سے حاصل کرتے ہیں وہ دیگر تصانیف میں کہیں بھی نہیں ملتیں۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۵۶ :- ارزاں - سستا، کم قدر و قیمت والا؛ سہل الحصول - جسے پا لینا آسان ہو؛
خامہ فرسائی کرنا - لکھنا؛ حیاتِ جاوید - ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی؛

صفحہ نمبر ۵۷ :- سلاست - سادگی؛ مقلّد - تقلید یا پیروی کرنے والے؛ خاتم - ختم کرنے والے؛
سحر و طلسم - جادو؛ حشو - زاید کلام، بھرتی کی چیز؛ زوائد - زوائد کی جمع - فالتو امور؛
گرویدہ - چاہنے والا؛ کاوش - جستجو؛ تفحص - تلاش، جستجو؛ فضلائے وقت - اپنے
عہد کے عالم فاضل لوگ؛ اصحابِ فن - فن پر عبور رکھنے والے لوگ؛

صفحہ نمبر ۵۸ :- التجا نامے - عاجزانہ تحریریں یا خط؛ پرکانا - شوق دلانا؛ التزام - خاص
اہتمام؛ سراغ رسانی - پتہ چلانا، کھوج لگانا؛ عزا پرسی - تعزیت؛ یاوہ گوئی -
بکواس؛ سیاہ رُو - گنہگار؛ ہجو - کسی کے خلاف لکھی ہوئی نظم جس میں اس کی خامیاں
ہی خامیاں بیان ہوں؛ بمقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی - بلند حوصلہ اور
نیک طبیعت کے تقاضوں کے مطابق؛

صفحہ نمبر ۵۹ :- گلزارِ عالم سے رحلت کر چکنا - مر چکنا، اس دنیا سے رخصت ہو چکنا؛
رقابت - مخالفت؛ تقدیم و تاخیر - پہلے اور بعد کا مسئلہ؛ لفظی معنی (آگے بڑھانا
اور پیچھے چھوڑنا) احتمال - امکان؛ ابتداً - ابتدا میں، شروع میں؛ مشاہیر -
مشہور لوگ؛ ادخال - داخل کرنا، شامل کرنا؛ متشکّکین - متشکِک کی جمع، شک
کرنے والے؛

صفحہ نمبر ۶۰ :- عنقا کا حکم رکھتی تھیں - بالکل نایاب تھیں؛ متنوع - طرح طرح کی؛
یک جائی اطلاع - معلومات جو ایک ہی جگہ جمع شدہ مل جائیں؛ عُشرِ عشیر - معمولی
سا حصہ بھی، لفظی مطلب ہے دسواں کا دسواں۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

مولانا آزاد صاحب طرز ہیں۔ فارسی میں ابوالفضل اور ظہوری کے مقلد پیدا ہو گئے مگر آزاد کا ابھی تک کوئی مقلد پیدا نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد اپنے انداز کے آپ ہی موجد تھے اور آپ ہی خاتم۔ اُن کی سادہ زبان ہلکی رنگینی کے ساتھ ترکیب پا کر اس بلا کی دلکش اور دلربا بن گئی ہے کہ اس کے فقرے فقرے پر سحر و طلسم کا دھوکا ہوتا ہے۔ توصیفی اور تشبیہی ترکیبوں سے جو حشو کے طور پر جملوں میں اضافہ کر دی جاتی ہیں ادنیٰ سا فقرہ حسن و لطافت کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے کا ابتدائی فقرہ ہے:
"آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔"
اس فقرے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نہاد ترکیب صفتی ہے۔ زبان کو تیغ کے ساتھ تشبیہ دے کر تیغ کا لازمہ جوہر لایا گیا ہے۔ ان زوائد کو نکال دینے سے اصل جملہ یہ رہ جاتا ہے: "آزاد کے بزرگ فارسی کو اپنی زبان جانتے تھے۔" اس حالت میں یہ جملہ بالکل روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ مگر صرف چند زوائد لانے سے جنہیں نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ، سارا جملہ چمک اُٹھا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت حافظ محمود شیرانی کے مضمون "تنقید بر آبِ حیات" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ حافظ محمود شیرانی اس مضمون میں آبِ حیات پر تنقید کرتے ہیں مگر یہ تنقید دراصل "آبِ حیات" کے دفاع میں ہے۔

تشریح:۔ مولانا آزاد اپنا ایک مخصوص طرزِ تحریر رکھتے ہیں۔ فارسی ابوالفضل اور ظہوری کے پیروکار تو پیدا ہو گئے مگر ابھی تک آزاد کی پیروی کوئی نہیں کر سکا۔ یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ مولانا آزاد نے ایک نیا ہی طرزِ تحریر ایجاد کیا اور آپ نے ہی اس طرزِ تحریر کا خاتمہ کر دیا یعنی یہ طرزِ تحریر مولانا آزاد ہی تک رہا، اس کے بعد یہ چل نہیں سکا —— آبِ حیات

کی سادہ زبان ہلکی ہلکی رنگینی یا رنگ آمیزی کے باعث اتنی خوبصورت اور پُرکشش ہو گئی کہ اس کے ایک ایک جملے پر جادو کا دھوکا ہوتا ہے یعنی آدمی اس تحریر کے طلسم میں کھو جاتا ہے۔
جہاں جہاں انہوں نے جملوں کی تعریف کے لئے یا مشابہت کے لئے ایسی ترکیبیں استعمال کی ہیں جو بظاہر غیر ضروری اور بھرتی کی ترکیبیں ہیں، وہاں معمولی معمولی سا فقرہ حسن اور نزاکت کی تصویر پیش کرنے لگتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ کے شروع میں ایک جُملہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے آزاد کے بزرگ فارسی کو اپنی زبان کی تلوار کا جوہر سمجھتے تھے یعنی ان کی زبان فارسی تھی یا فارسی میں اظہار خیال کرنا پسند کرتے تھے۔ اس جملے کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے کے لئے "ہندی نہاد" کی ترکیب حقیقی ہے، پھر زبان کو تلوار سے تشبیہ دی ہے تو جوہر کو تلوار کا ضروری حصہ قرار دیا ہے۔ ان زاید باتوں کو نکال دیں تو اصل جملہ یہ رہ جاتا ہے کہ آزاد کے بزرگ فارسی کو اپنی زبان سمجھتے تھے —— اس شکل میں تو جملہ بالکل خشک معلوم ہوتا ہے مگر صرف چند ترکیبیں ملا دینے سے جملہ بہت خوبصورت ہو گیا ہے۔

(۲)

"آبِ حیات" کے واسطے ذخیرہ فراہم کرنے کے لئے (مولانا آزاد کو) بڑی تلاش و کاوش اور تحقیق و تفحص کرنی پڑی ہے۔ کتب تاریخ و تذکرۂ شعراء اور دیگر تالیفات سے قطع نظر اطراف ہند میں اُنہیں فضلائے وقت واصحاب فن اور باکمال ذوق سخن رکھنے والوں کی خدمت میں التجا نامے لکھنے پڑے۔ شعراء کے حالات کی بابت سوالات کئے، خوشامدیں کیں، یاد دہانیاں کرائیں، برسوں خون جگر کھایا اور محنت کا پسینہ بہایا تب کہیں "آبِ حیات" کی ہفت خواں طے ہوئی ہے۔ یہ تالیف کم از کم سات سال کی کمائی ہے۔ جن لوگوں نے امداد کا ہاتھ دراز کیا ہے اُن میں سے یہ لوگ قابلِ ذکر ہیں:... نواب مصطفٰی خاں شیفتہ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب علاء الدین خاں والی لوہارو۔ ان میں سے اکثر کا ذکر خود مولانا نے "آبِ حیات" میں کر دیا ہے۔ "آبِ حیات" شعر و شعراء پر ایک نہایت قیمتی خزانۂ معلومات ہے۔ بعد کے مصنفین پر اس کا بے حد اثر ہے۔

حوالۂ متن: یہ اقتباس محمد حسین آزاد کے مضمون "تنقید بر آبِ حیات" سے لیا گیا ہے۔
سیاق و سباق: حافظ محمود شیرانی نے اس مضمون میں آبِ حیات پر تنقید کی ہے جو دراصل آبِ حیات کا دفاع ہے۔ انہوں نے ان مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے جن سے آزاد دوچار ہوئے اور ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو "آبِ حیات" پر ہوئے۔
تشریح: "آبِ حیات" کی تصنیف کے دوران مولانا آزاد کو ذخیرۂ معلومات جمع کرنے کے لئے بڑی تلاش، جستجو اور چھان پھٹک کرنی پڑی۔ تاریخ کی کتابوں اور شاعروں کے تذکروں کے اور دوسری کتابوں کے علاوہ انہیں ہندوستان بھر میں دور دراز تک مقیم وقت کے فاضلین، فن کے ماہرین اور اہلِ کمال اور شعری ذوق رکھنے والے لوگوں سے درخواست کرنا پڑی کہ وہ ان کی معاونت کریں۔ ان سے شاعروں کے بارے میں سوال کئے کہ وہ ان کے جواب فراہم کریں، انہیں صرف یاددہانیاں ہی نہیں کرائیں بلکہ ان کی خوشامدیں بھی کیں کہ کسی نہ کسی طرح انہیں مطلوبہ مواد میسّر آیا ہے۔ یوں کئی برس تک جان ہلکان کرنے اور خون پسینہ ایک کرنے کے بعد کہیں "آبِ حیات" کے کٹھن مراحل طے ہوئے۔ یہ کتاب کم از کم سات سال میں مکمل ہوئی۔ جن لوگوں سے معاونت کی درخواست کی گئی تھی ان میں سے لائق ذکر لوگ یہ ہیں —— نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین خاں اور نواب علاؤ الدین خاں والیِ لوہارو —— ان میں سے بیشتر کا ذکر خود مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں کر دیا ہے —— "آبِ حیات" شاعری اور شاعروں کے حوالے سے ایک گراں قدر ذخیرۂ معلومات ہے، اور بعد کے لکھنے والوں پر اس کے بہت سے اثرات مرتب ہوئے۔

(۳)

"آبِ حیات" میں حوالے دینے کا دستور التزام کے ساتھ عمل میں نہیں آیا۔ کہیں سند اتفاقیہ دے دی ہے اور اکثر جگہ نہیں دی۔ اگرچہ اس کے اکثر بیانات کی سراغ رسانی کی جا سکتی ہے ایک حصّہ پھر بھی ایسا ہے جس کے لئے مولانا کے پاس تحریری دستاویز موجود نہیں۔ اسی کی بنا پر مولانا زمانۂ ما بعد میں بدنام بھی ہوئے۔ یہ غالباً وہ روایات ہیں جو قیام لکھنؤ کے زمانے میں اُنہیں حاصل ہوئیں۔ جدید کتابوں کی اشاعت اور جدید معلومات نے ان اطلاعات کو غلط ثابت کر دیا ہے یا اُن کی صحت میں شبہ پیدا کر دیا ہے۔

(ایک مثال) ——— مولانا آزاد فرماتے ہیں :-

"میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے (مرحوم کے صاحبزادے میر حسن کے ہاں) گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر ماجو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی، بہت سے عذر کئے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا، تم فرزند ہو، جو کچھ اس سیاہ رو سے گستاخی ہوئی معاف کرد۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں اُن کی کہی تھیں، سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بمقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔"

حوالۂ متن :- یہ اقتباس محمد حسین آزاد کے مضمون "تنقید بر آب حیات" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق :- حافظ محمود شیرانی نے یہ مضمون آب حیات اور مولانا آزاد کے دفاع میں لکھا ہے۔ انہوں نے آزاد کی مشکلات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو "آب حیات" پر ہوئے مگر کہیں کہیں کسی خامی کا اعتراف بھی کیا ہے۔

تشریح :- "آب حیات" میں حوالے بالعموم نہیں دیئے گئے۔ اگر اتفاق سے کوئی سند مل گئی تو وہ انہوں نے درج کر دی۔ اکثر جگہ کوئی سند فراہم نہیں کی۔ اگرچہ اس کے اکثر بیان ایسے ہیں جن کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، تاہم ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کے لئے مولانا کے پاس کوئی تحریری ثبوت یا جواز نہیں۔ اسی وجہ سے مولانا بعد کے زمانے میں بدنام بھی ہوئے۔ شاید یہ وہ روایات ہیں جو لکھنؤ کے قیام کے دوران ان تک پہنچیں۔ بعد میں آنے والی جدید کتابوں اور معلومات نے ان روایات کو غلط ثابت کر دیا یا ان کے درست ہونے میں شک کا عنصر شامل کر دیا ——— ایک مثال ملاحظہ کیجئے ——— مولانا آزاد لکھتے ہیں ———

"میر ضاحک فوت ہو گئے تو سودا فاتحہ کے لئے میر ضاحک کے بیٹے میر حسن کے گھر گئے اور اپنا دیوان ساتھ لے گئے۔ جب فاتحہ خوانی اور اظہار افسوس سے فارغ ہوئے تو اپنی اس بیہودہ شاعری کے بارے میں جو مرحوم کے حوالے سے کی گئی تھی، اس کے لئے بہت سے عذر پیش کئے اور کہا کہ سید مرحوم تو دنیا سے رخصت ہو چکے، تم ان کے بیٹے ہو، جو بھی بدتمیزی مجھ سے ہوئی ہے تم معاف کر دو۔ بعد میں نوکر سے دیوان منگوایا اور اس میں جو جو

نظمیں میر ضاحک کے خلاف لکھی گئی تھیں، پھاڑ ڈالیں —— میر حسن نے جو بڑے عالی حوصلہ اور سعادت مند تھے۔ اپنی عالی حوصلگی اور سعادت مندی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسی وقت اپنے باپ کا دیوان گھر سے منگوایا اور اس میں جو نظمیں کے خلاف تھیں پھاڑ ڈالیں۔"

(۴)

ہمارے عہد کے متشککین نے نہایت سختی سے حضرت مولانا پر نکتہ چینی کی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صرف قصہ کہانیوں پر بنیاد ہے۔ اس سے بھی تیز نشتر یہ کہ "قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں۔۔۔" مگر یہ بزرگ بھول گئے کہ آج سے ساٹھ سال قبل جب "آب حیات" تالیف ہوئی ہے ذرائع معلومات نہایت محدود تھے۔ اس عرصے میں بیسیوں کتابیں روشنی میں آئیں اور انجمن ترقی اُردو نے چھاپ دیں جو آزاد کے زمانے میں عنقا کا حکم رکھتی تھیں اور اُن تک حضرت مولانا کی رسائی نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے جو متنوع اور یک جائی اطلاع "آب حیات" سے حاصل ہو سکتی ہے دیگر تصانیف میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا اور آج بھی اس کے بغیر چارہ نہیں۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت حافظ محمود شیرانی کے مضمون "تنقید بر آب حیات" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ شیرانی اس مضمون میں "آب حیات" پر تنقید کرتے ہیں اور اس پر ہونے والے اعتراضات کے جواب فراہم کرتے ہیں۔

تشریح:۔ ہمارے زمانے کے شک کرنے والے لوگوں نے مولانا آزاد پر بہت سخت تنقید کی ہے۔ کسی نے اسے (یعنی آب حیات کو) قصہ کہانی قرار دیا ہے۔ اس سے تیز نشتر بھی لوگوں نے یہ کہہ کر چبھوئے ہیں کہ آزاد نے محض قیاس کی بلند پروازی سے طوطے مینا بنا بنا کر اڑا دیئے ہیں یعنی محض قیاس آرائی پر مبنی بے معنی باتیں رقم کر دی ہیں مگر ان بزرگوں نے یہ بات یاد نہ رکھی کہ آج سے ساٹھ سال پہلے جب "آب حیات" لکھی گئی معلومات کے ذریعے بہت تھوڑے سے تھے۔ اس عرصے میں بیسیوں کتابیں لکھی گئیں اور انجمن ترقی اُردو نے

شائع کیں جو آزاد کے زمانے میں بالکل نایاب نہیں اور مولانا کی پہنچ سے باہر تھیں۔ اس کے باوجود جو طرح طرح کی معلومات آبِ حیات کی صورت میں ایک جگہ جمع شدہ مل جاتی ہیں دوسری کتابوں میں اس کا تھوڑا سا حصّہ بھی نہیں ملتا اور آج بھی "آبِ حیات" کے بغیر کام نہیں چلتا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

خلاصہ

میں اور میرؔ

ہر قاری کسی نہ کسی مصنف کو اپنا آئیڈیل بنا لیتا ہے۔ کیونکہ اس کی تحریروں میں اسے کہیں نہ کہیں اپنی تصویریں دکھائی دیتی ہیں اور پھر وہ اس کے آئینے میں اپنی تصویر دیکھتا ہے۔ ایسے ہی مجھے میرؔ سے محبت ہو گئی۔ ابتداء میں مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ۱۹۴۱ء کے قریب میں نے اُردو شاعری کا مطالعہ شروع کیا۔ مگر میں مسلسل اور دل لگا کر دیوانِ میر کا مطالعہ کر سکا۔ میں ان سے متاثر نہ ہوا۔ یہ تحریک خلافت کا دور تھا۔ مجھے قومی اور سیاسی شاعری سے محبت تھی اس دور میں اقبال، شبلی اور ظفر علی خاں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ پھر میں حسرت موہانی اور حافظ کی طرف مائل ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں خونیں واقعات کو دیکھ کر میرا دل لرز اُٹھا گویا دنیا کا غم میرا ذاتی غم بن گیا تو میں نے ایک بار پھر سے کلام میر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ اس نے مجھے بہت متاثر کیا گویا میرؔ کا غم سے لبریز کلام میرے ہی لیے تھا۔ چنانچہ اب میرؔ میرا ساتھی اور کلام میرؔ میرا دوست بن گیا۔ تقریباً دس سال سے بعض خاص حالتوں میں میرؔ کا مطالعہ میرا معمول بن گیا ہے۔ بعض نازک اور پیچیدہ مرحلوں میں اللہ کے بعد حافظ، اقبال، غالبؔ، میرؔ کے ارشادات میری رہبری کرتے رہے۔ لیکن پیچیدہ اعصابی آزمائشوں میں میرؔ نے میری سب سے زیادہ معاونت کی۔ انسانی تعلقات، خوئے تسلیم، برداشت تحمل، جور و جفا کے باوجود نفرت اور انتقام سے بے نیازی یہ تمام راستے مجھے میرؔ نے دکھائے اور ان راستوں سے ثابت قدمی سے گزرنے کے انداز بھی سکھائے۔ میں نے بارہا غالب کو میرؔ پر ترجیح دینے کی کوشش کی۔ لیکن بعض ایسے سخت مقامات آئے جب غالبؔ کی نسبت میرؔ نے میری زیادہ معاونت کی تو پھر میں میرؔ کو غالب پر ترجیح دینے پر مجبور ہو گیا میں نے کلام میرؔ کی مدد سے زندگی کے بہت سے طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ بامردی اور

شرافت انہیں سے سیکھی۔ اس سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نازک لمحات اور بحث احساسات میں کلام میر سے بہتر کوئی رہنما نہیں۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۶۱ :۔ ثمر آور۔ پھلدار ، خامہ فرسائی کرنا۔ لکھنا ، خود احتسابی۔ اپنا حساب خود لینا ،

صفحہ نمبر ۱۶۲ :۔ مذہبی۔ دوستی ، نفس۔ ذات ، خلوت۔ تنہائی ، جلوت۔ ظاہر۔ جلوہ ، ہمدم۔ ساتھی ، دوست ، روابط۔ رابطے ، تعلقات ، نامانوس۔ اجنبی ، توحش۔ وحشت ، بالاستیعاب۔ مسلسل اور بہت اچھی طرح پڑھنا ،

صفحہ نمبر ۱۶۳ :۔ افسردہ۔ اداس ، اوائلِ عمر ہی میں۔ ابتدائی عمر ہی میں ، عمر کے پہلے حصے ہی میں ،

صفحہ نمبر ۱۶۴ :۔ تطہیر کرنا۔ صفائی کرنا ، مراحل۔ مرحلے ، متزلزل کرنا۔ ڈگمگا دینا ،

صفحہ نمبر ۱۶۵ :۔ الم۔ دکھ۔ رنج ، پامردی۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

ہر مطالعہ کرنے والے کو اپنے خاص مصنف میں کہیں کہیں اپنی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس میں اپنے آپ کو دیکھ کر اس کی طرف بے اختیار کھنچ جاتا ہے اور اس طرح اس کو اپنے سے باہر بھی اپنا ایک نفس مل جاتا ہے جو اس سے ہم کلام ہوتا ہے ، اس کا دکھ بانٹتا ہے ، اس کی غم گساری کرتا ہے ، اس کی خلوت کا ہمدم اور مونس بن جاتا ہے ...... اور کبھی کبھی جلوتوں میں بھی اس کا شریک حال ہو جاتا ہے ! یہ گویا خود کی تصویر ہوتی ہے غیر کے آئینے میں !

حوالۂ متن :۔ یہ اقتباس سیّد عبداللہ کے مضمون "میں اور میر" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق :- اس مضمون میں مصنّف نے میر کی پسندیدگی کے ساتھ ابتداء کی ناپسندیدگی کا ذکر بھی کیا ہے اور اس امر کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ کوئی شاعر کسی شخص کو پسند کیوں ہوتا ہے اور وہ شاعر زندگی میں اس کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے۔

تشریح :- ہر پڑھنے والے کو اپنے پسندیدہ مصنّف میں کہیں کہیں اپنی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جب وہ اپنے آپ کو اس مصنف کے اندر پاتا ہے تو غیر ارادی طور پر اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ یوں اسے اپنی ذات سے باہر بھی ایک ہمزاد مل جاتا ہے، جو اس سے باتیں کرتا ہے، اس کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، اس کی دل جوئی کرتا ہے، اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جاتا ہے — اور کبھی کبھی جلوت کی زندگی میں بھی اس کا ساتھی بن جاتا ہے — گویا یہ اپنی ہی تصویر ہوتی ہے جو دوسرے کے آئینے میں دکھائی دیتی ہے۔

(۲)

غرض یہ کہ میر ذہنی زندگی کے بعض خاص مرحلوں میں میرا رفیق و ہمدرد نکلا، میں نے اس کی مدد سے بہت سے طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ میں نے میر سے پامردی بھی سیکھی ہے اور شرافت بھی۔ میر نے مجھے رلایا بھی ہے اور میرے آنسو بھی پونچھے ہیں، مگر یہ ضرور ہے کہ چوبیس گھنٹے کی رفاقت سے ایک خاص قسم کی "ذہنی بے چارگی" کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے — میر ہر وقت اور ہر گھڑی کا شاعر نہیں، مگر نازک لمحات اور سخت احساسات میں میر سے بہتر رہنما اور دوست بہت کم کسی کو ملے گا۔

حوالۂ متن :- یہ اقتباس سیّد عبداللہ کے مضمون "میں اور میر" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق :- اس مضمون میں مصنّف نے میر کی پسندیدگی کے ساتھ ابتداء میں اپنی ناپسندیدگی کا ذکر بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح زندگی میں ان کے ساتھی بنے رہے۔

تشریح :- المختصر میر میری ذہنی زندگی کے کئی خاص مراحل میں میرا ساتھی ہی نہیں، میرا ہمدرد بھی نکلا۔ میں نے میر ہی کی مدد سے کئی کٹھن مراحل طے کئے۔ میں نے میر سے بہادری اور شرافت کے سبق سیکھے۔ میر نے زندگی کے کئی مقامات پر مجھے رلایا بھی ہے

اور کئی مقامات پر مجھے مایوسی کی کیفیت سے نکالا اور مجھے حوصلہ بھی عطا کیا ہے ــــــ مگر یہ ضرور ہے کہ میر کی مسلسل رفاقت سے ایک خاص طرح کی ذہنی بے سروسامانی یا اداسی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ میر ہر وقت پڑھے جانے والا شاعر نہیں مگر نازک لمحوں اور سخت وقت میں جب احساسات مجروح ہوں میر سے بہتر دوست اور رہنما میسر نہیں آسکتا۔

(۴)

میر سے میرے روابط کا قصہ عجیب سا ہے۔ ایک زمانے تک میں ان لوگوں میں سے تھا جن کو میر بلکہ ہر غزل گو شاعر کے خلاف کچھ تعصب سا تھا ..... اور میر کے معاملے میں تو خاص وقت یہ تھی کہ بعض اوقات اس کی زبان میں ایک ایسا نامانوس لہجہ نظر آتا تھا جس سے سخت توحش ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے قریب قریب جب میں نے اردو شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا تو میں میر کے دیوان اوّل سے آگے نہ بڑھ سکا..... اور رازدارانہ انداز میں خود سے یہ کہہ کر میر کا مطالعہ ترک کر دیا کہ:

"معلوم نہیں لوگ میر کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں؟"

یہ دراصل نتیجہ تھا میری اس مقصدیت کا جو تحریک آزادی کی عملی فضا نے مجھ میں اوائل عمر ہی میں پیدا کر دی تھی یا میری اقبال پسندی کا جس کی گرفت شروع ہی سے مضبوط ہو گئی تھی۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سیّد عبداللہ کے مضمون "میں اور میر" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں سیّد عبداللہ نے میر کی پسندیدگی سے قبل اپنی ناپسندیدگی کا ذکر بھی کیا ہے۔

تشریح:۔ میر سے میرے مراسم کا سلسلہ بھی عجیب ہے۔ عرصے تک میں ان لوگوں میں سے رہا جو میر تو کیا، ہر غزل کہنے والے شاعر کے بارے میں تعصب کا شکار تھے ـــ اور میر کے معاملے میں تو خاص مشکل یہ بھی تھی کہ بسا اوقات اس کی زبان میں ایک اجنبی سا انداز ملتا ہے جس سے بہت وحشت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ۱۹۳۰ء کے قریب میں نے اردو شاعری کا تفصیل سے ترتیب وار مطالعہ کرنا شروع کیا تو میں میر کا پہلا دیوان بھی پورا نہ پڑھ

سکا اور رازداری سے اپنے آپ سے کہا کہ "جانے لوگ میر کی تعریف کیوں کرتے ہیں؟" اور میر کا مطالعہ بند کر دیا۔ دراصل یہ تاثر اس مقصدیت کا پیدا کردہ تھا جو آزادی کی تحریک کی عملی فضا نے میرے اندر ابتدائی عمر ہی سے پیدا کر دی تھی یا پھر میری اقبال پسندی کا پیدا کردہ تھا جس نے شروع ہی میں مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

(۴)

اس اثناء میں، میں نے تجربتاً پھر میر کا مطالعہ شروع کیا..... میر سے میری سابقہ ملاقات جبر و اکراہ کی فضا میں ہوئی تھی، مگر اس بار میں نے اس کو کچھ بدلا ہوا شخص پایا۔ یوں لگتا تھا میر کے الم پارے شاید میرے ہی لیے وضع ہوئے ہیں (جس طرح کوئی تصویر کسی چوکھٹے میں فٹ آ جائے)۔ اس طرح رفتہ رفتہ میر میری رگ و پے میں سرایت کرتا گیا۔ تدریسی ضرورتوں کے لئے بھی اسی زمانے میں کلام میر کے تجزیے کی ضرورت پڑی۔ اس لئے ذوقی ضرورتوں کے علاوہ مجھے طالبعلمانہ انداز میں بھی تجزیہ کرنے کا موقع ملا۔ اب میر میرا رفیق بنتا گیا..... کئی اشعار ایسے تھے جو روزانہ وردِ زبان رہنے لگے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سید عبداللہ کے مضمون "میں اور میرؔ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ سید عبداللہ میر کی پسندیدگی اور ابتداء کی ناپسندیدگی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

تشریح:۔ اسی عرصے میں میں نے ایک بار پھر میرؔ کے مطالعہ کا تجربہ کیا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ میرؔ سے میری پہلی ملاقات تو مجبوری کی کیفیت میں ہوئی تھی مگر اب کے میں نے اسے کچھ بدلا بدلا پایا۔ اب کے تو یوں لگا جیسے میرؔ نے جو غم کی داستانیں رقم کی ہیں وہ سب میرے ہی لئے ہیں (بالکل ایسے ہی جیسے کوئی تصویر چوکھٹے میں یوں پوری آجائے جیسے وہ بنا ہی اسی کے لئے تھا)۔ یوں آہستہ آہستہ میری نس نس میں رچ بس گیا۔ مجھے بطور استاد کے بھی میرؔ کے کلام کے تجزیاتی مطالعے کی ضرورت پڑی۔ اس لئے اپنے ذوق کی تسکین کے علاوہ مجھے طالب علموں کی طرح بھی میر کے کلام کا تجزیہ کرنا پڑا۔۔۔ اب میرؔ میرا ساتھی بنتا گیا ۔۔۔ کئی شعر ایسے تھے جو روزانہ میری زبان پر رہتے تھے۔

(۵)

میرے تجربات زندگی چنداں اہم نہیں مگر عام انسانی گزرگاہ کا میں بھی ایک معمولی سا مسافر ہوں۔ اس راستے میں مجھے بھی اکثر بڑے بڑے نازک اور پیچیدہ مرحلوں سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ مرحلے ذہنی، روحانی اور اعصابی توانائی کے بغیر طے نہ ہو سکتے تھے — ان مراحل میں سب سے زیادہ مجھے رحمتِ خداوندی کا بھروسہ رہا جس کا دائمی معتقد ہوں، اور اس اعتقاد کو آج تک کوئی فکری گمراہی متزلزل نہیں کر سکی۔ اس کے بعد حافظ، اقبال، غالب اور میر کے ارشادات میری رہبری کرتے رہے۔ مگر نہایت پیچیدہ اعصابی آزمائشوں میں مجھے میر نے جو مدد دی ہے وہ کسی اور ذریعے سے نہیں ملی۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سید عبداللہ کے مضمون "میں اور میر" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ سید عبداللہ میر کی پسندیدگی کا حال بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح میر قدم قدم پر ایک ہمدرد ساتھی ثابت ہوتا ہے۔

تشریح:۔ میری زندگی کے تجربات اتنے اہم تو نہیں لیکن میں بھی انسانی زندگی کی راہ کا ایک عام سا مسافر تو بہر حال ہوں۔ مجھے اس راہ میں بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ مراحل طے کرنے کے لئے مجھے ذہنی، روحانی اور اعصابی طاقت کی سخت ضرورت تھی بلکہ ان کے بغیر تو میں یہ راہ عافیت سے طے کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کٹھن مراحل کے دوران مجھے سب سے زیادہ سہارا تو خداوند کریم کی رحمت کا رہا جس کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں بلکہ میرا عقیدہ رہا ہے کہ کٹھن مراحل میں رحمتِ خداوندی ہی انسان کے کام آ سکتی ہے۔ آج تک کسی بھی فکری گمراہی سے میرا یہ عقیدہ ڈگمگایا نہیں — اس کے بعد حافظ، اقبال، غالب اور میر کے فرمودات نے میری رہنمائی کی۔ مگر کٹھن اعصابی مراحل میں مجھے جو میر نے دی ہے وہ کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکی۔

(۶)

انسانی روابط اور تعلقات میں بھی میر کی شاعری سے میں نے بہت فائدے حاصل کئے۔ میر کی شاعری نے مجھے تعلقات میں حوصلہ مند اور متحمل بنایا ہے۔ یہ مسکراہٹ الم کے سرچشموں سے اٹھتی ہے مگر اس

میں طنز اور احتجاج نہیں، خوئے تسلیم کے رنگ ہیں۔ آہستگی، برداشت، تحمل، مظالم اور جور و جفا کے باوجود ایک ایسا توازن رکھنا جس میں نفرت اور انتقام کا شائبہ تک بھی پیدا نہ ہو، یہ راستہ مجھے میر نے دکھایا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سید عبداللہ کے مضمون "میں اور میر" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ سید عبداللہ میر کی پسندیدگی کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بھی بتاتے ہیں کہ میر نے کس طرح زندگی کے کئی مراحل پر ان کی رہنمائی بھی کی۔

تشریح:۔ میں نے انسانی تعلقات کے سلسلے میں بھی میر کی شاعری سے بہت کچھ سیکھا۔ میر کی شاعری نے مجھے انسانی تعلقات میں حوصلے اور تحمل کا درس دیا۔ میر کی مسکراہٹ غم کے سرچشموں سے پھوٹنے کے باوجود طنز اور احتجاج سے تہی ہے، بلکہ اس میں تسلیم کی عادت کا عکس ہے۔ زندگی کے سفر کے دوران یہ راستہ بڑا کٹھن ہے کہ انسان آہستگی اور تحمل کے ساتھ زمانے کے ظلم و ستم برداشت کرتے ہوئے بھی اپنی شخصیت میں ایسا توازن قائم رکھے کہ اس کے کسی بھی انداز میں ذرا سا بھی نفرت اور انتقام کا امکان نہ ہو — یعنی وہ سختیاں سہہ کر بھی نفرت کرنے والا اور انتقام کی آگ میں جلنے والا نہ بنے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

شبلی کی شخصیت اور کارنامے

ہر فن کار کی شخصیت اس کے فن میں جھلکتی ہے۔ بعض اوقات فن کار معراجِ کمال حاصل کرنے کے لیے اپنی شخصیت کی قربانی بھی دے دیتا ہے۔ شبلی کا فن ان کی شخصیت سے بلند تھا۔ ان کی نظر علم وفن کی تکمیل اور قومی و دینی خدمت پر مرکوز تھی۔ شبلی ایک جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر عمر اور کمزور صحت کے باوجود بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ ان کے عظیم کارناموں کا دوسرا راز ان کی ترقی پذیری ہے۔

شبلی کی ذہانت کی جھلک ان کی تصانیف میں نظر آتی ہے جس کی بدولت وہ معمولی موضوع میں بھی حکیمانہ گہرائی اور عظمت پیدا کر دیتے ہیں۔ بقول سلیمان ندوی شبلی کی ساری عمر مولویانہ مناظرے میں گزر گئی۔ ان کی پہلی کتاب سیرۃ النعمان کا موضوع حنفی اور اہلحدیث کا مناظرہ ہے اور دوسری کتاب الفاروق سنی اور شیعہ مباحث پر فیصلہ ہے۔ سیرۃ النعمان کی تحریر میں ان کے شدید حنفی میلانات کو دخل تھا۔ دراصل یہ کتاب احناف (حنفی) ہی نہیں بلکہ پوری قوم کے لیے اُفقِ ذہنی بلند کرنے کا ایک ذریعہ اور پیغام ہے۔ الفاروق مثالی اسلامی ریاست کی ایک دلفریب، ولولہ انگیز اور ہوشمند داستان ہے۔ مولانا شبلی کی آخری تصنیف سیرۃ النبی ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں ان کی وفات کے کئی سال بعد شائع ہوئیں سیرۃ النبی ہمارے سب سے بڑے عالم ادیب کی پختگی عمر و فکر و طبیعت کا شاہکار ہے یہ ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ ان دو جلدوں میں سارے سوانحی حالات اور اسوۂ حسنہ کا ذکر مکمل طور پر آ جاتا ہے۔ ذہنی صلاحیتوں اور قوم کے لیے بڑی قربانی کے علاوہ شبلی کی ہمت، استقلال اور مسلسل جدوجہد داد کے قابل ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ مرتے مرتے دارالمصنفین جیسے بار آور ادارے کی بنیاد بھی رکھ گئے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۶۷ : معراجِ کمال ۔ عروج ؛ تہذیبِ نفس ۔ ذاتی اصلاح ؛ استغنا ۔ بے نیازی ؛ عصبیت ۔ بے جا طرفداری ؛ نشیب و فراز ۔ اونچ نیچ ؛ قلیل ۔ تھوڑی ؛ اکل کھرا ۔ جو دوسرے کو دیکھ نہ سکے ، بدمزاج ، مردم بیزار ؛ مروّت ۔ لحاظ ؛ چیکنا ، محبت ؛ مژگاں ، پلکیں ؛ خوں خشاں ۔ خون ٹپکانے والی ؛ مژۂ یار ۔ محبوب کی پلک ؛ تشنگی ۔ پیاس ؛ گوارا ۔ پسند ، برداشت ؛ بے بہا ۔ بہت قیمتی ، جس کی کوئی قیمت ہی نہ دے سکے ، ان مول ، بیش قیمت ؛

صفحہ نمبر ۶۸ : مہماتِ امور ۔ بڑے بڑے کارنامے ؛ تزئین ۔ آرائش ؛ جامع الحیثیات ہستی ۔ ایسی شخصیت جس کی کئی حیثیتیں ہوں ؛ عدیم النظیر ۔ بے مثال ۔ لاثانی ؛ مناظرہ ۔ بحث ۔ مباحث ۔ تکرار ؛

صفحہ نمبر ۶۹ : مسلک ۔ طریقہ ؛ راستہ ، دستور ، قاعدہ ؛ مترادف ۔ ہم معنی ؛ احناف ۔ حنفی کی جمع ؛ مرقع ۔ البم ۔ تصویر خانہ ؛ اقتضا ۔ تقاضا ؛ تدقیق ۔ باریک بینی ؛ صائب ۔ درست ؛ سبک ۔ ہلکا ؛

صفحہ نمبر ۷۰ : بالغ نظری ۔ ذہانت ، گہری نظر ؛ بلند نگہی ۔ عالی حوصلگی ، عالی ہمت ہونا ؛ ہمت آموزی ۔ جرأت مندی کا سبق سیکھنا ۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

فن اور فن کار کی شخصیت کا عجیب رشتہ ہوتا ہے ۔ بنیادی طور پر تو

فن میں فن کار کی شخصیّت جھلکتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فن میں معراج کمال حاصل کرنے کی خاطر ایک فن کار اپنی شخصیت ہی کی عظیم قربانی دے دیتا ہے اور جو توجہ وہ تہذیب نفس پر صرف کر سکتا تھا، فن کی نوک پلک سنوارنے کے کام آتی ہے۔ یہ نفسیاتی عمل شبلی کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں "اخلاق و عادات" کے تحت علامہ شبلی کی دولت کی بے قدری، استغنا اور بے نیازی، خودداری، سفارشوں میں احتیاط، نفاست پسندی، عصبیت دینی اور پابندیٔ اوقات کی جو تعریف کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی شخصیّت بے عیب تھی یا اس میں معمول سے زیادہ خم و پیچ اور نشیب و فراز نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کا فن اُن کی شخصیت سے ارفع تھا اور وہ نظری طور پر بھی اسے زیادہ اہمیّت دیتے تھے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت شیخ اکرام کے مضمون "شبلی کی شخصیّت" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں شیخ اکرام نے علامہ شبلی کی شخصیت کے مضبوط پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی بعض شخصی کمزوریوں کا ذکر بھی کیا ہے تاکہ قاری کے سامنے متوازن خاکہ پیش کیا جائے۔

تشریح:۔ کسی بھی فن اور فن کار کی شخصیّت کے درمیان بڑا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بنیادی حقیقت یہی ہے کہ کسی بھی فن میں فن کار کی شخصیّت کی عکاسی ضرور ہوتی ہے مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی فن کار فن پارہ تخلیق کرتے ہوئے ساری توجہ صرف فن کی تخلیق پر صرف کر دیتا ہے اور اپنی شخصیّت کو فن کی قربان گاہ پر چڑھا دیتا ہے۔ یوں وہ فنکار جو توجہ اپنی ذات کی اصلاح کے لئے صرف کر سکتا تھا وہ بھی فن ہی کو بہتر سے بہتر بنانے پر صرف کر دیتا ہے —— یہی نفسیاتی عمل شبلی کی زندگی میں بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں "اخلاق و عادات" کے عنوان سے علامہ شبلی کی دولت کے حوالے سے قدر نہ کرنے کا رویہ، ان کی بے نیازی، خودداری سفارشوں کے معاملے میں پوری احتیاط، نفاست پسندی، دین کے حوالے سے اپنے مسلک کی ہر ممکن طرف داری اور وقت کی پابندی کی بہت تعریف کی ہے اس میں بھی ذرا سی

بات بھی حقائق کے خلاف نہیں — لیکن — ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے ان کی شخصیت میں کوئی کمزوری تھی ہی نہیں اور وہ یکسر عیب سے تہی تھے یا ان کے ہاں معمولی درجے کی اخلاقی اونچ نیچ کی کیفیت ہی نہیں تھی — حقیقت یہ ہے کہ شبلی کا فن ان کی شخصیت کے مقابلے بہت زیادہ بلند پائے کا تھا اور وہ نظریاتی اعتبار سے خود بھی اسی کو زیادہ اہم تصور کرتے تھے۔

(۲)

شبلی نے اپنے وقت کا بہترین استعمال کیا۔ اُن کے عظیم کارناموں کا دوسرا رازاُن کی ترقی پذیری ہے۔ "اسکات المعتدی" سے "سیرۃ النبی" تک علمی، ادبی اور ذہنی ارتقا کی جو منزلیں ہیں، اُنہیں وہی شخص طے کر سکتا تھا جسے مسلسل یہی جستجو ہو کہ "خوب سے ہے خوب تر کہاں!" — یہ مسلسل ترقی اُن کی زندگی کے ہر میدان میں نظر آتی ہے۔ ان دونوں خوبیوں کے پس پشت، اُن کی عدیم النظیر ذہانت تھی جس کی کارفرمائی ان کی زندگی کے ہر میدان میں نظر آتی ہے لیکن اُن کے خاص دائرہ عمل یعنی علم و ادب میں معراج پر ہے۔

حوالۂ متن:- یہ اقتباس شیخ اکرام کے مضمون "شبلی کی شخصیت" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:- اس مضمون میں شیخ صاحب نے علامہ شبلی کی شخصیت کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے وقت کا پورا پورا استعمال کیا۔

تشریح:- شبلی نے اپنے وقت کو بہتر سے بہتر طریقے سے صرف کیا۔ انہوں نے جو بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ان کا دوسرا راز ان کا مسلسل ترقی کی جانب رواں رہنا ہے۔ "اسکات المعتدی" سے "سیرۃ النبیؐ" تک جو بھی علمی، ادبی اور ذہنی ترقی کی منازل ہیں، انہیں صرف وہی آدمی سر کر سکتا ہے جو مسلسل اس تلاش میں رہتا ہو کہ "بہتر سے بہتر کہاں ہے"۔ یعنی جو ہمہ وقت بہتر سے بہتر انداز میں امور کی انجام دہی پر یقین رکھتا اور اس کے لئے کوشش کرتا ہو — یہ مسلسل روش ان کی ساری زندگی میں ہر میدان میں دکھائی دیتی ہے — ان دونوں ہی اوصاف کے پیچھے ان کی بے مثال ذہانت بھی تھی — ان کی بے مثال ذہانت کے کرشمے ان کی زندگی کے ہر

میدان میں کارفرما نظر آتے ہیں مگر ان کا خاص میدانِ عمل علم وادب بھی ہے اور اسی میدان میں ان کی ذہانت کا استعمال عروج پر ہے۔

(۳)

سید سلیمان ندوی کے بیان میں حقیقت کا عنصر موجود ہے۔ مولانا شبلی کی کئی تحریریں بے لاگ نہ تھیں۔ اُن کا مقصد بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک نقطۂ نظر کو تقویت پہنچانا تھا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اپنی ذہانت کی بدولت ان مقصدی تحریروں کو وہ کس بلند مقام پر لے گئے۔ "سیرۃ النعمان" کی تحریر میں اُن کے شدید حنفی میلانات کو دخل تھا لیکن (حقیقت سے کوئی اُصولی انحراف کئے بغیر) اُنہوں نے حنفیت کی جو تصویر پیش کی ہے اور اُس مسلک کو جسے "تقلید و جمود" کے مترادف سمجھا جاتا تھا، اسلامی حدود کے اندر جس طرح ترقی پسندی اور تمدنی ارتقاء کی سب سے قابل عمل صورت ظاہر کیا ہے، وہ قوم کے جزو غالب یعنی احناف ہی نہیں بلکہ تمام قوم کے لئے اُفق ذہنی بلند کرنے کا ایک ذریعہ اور پیغام ہے۔ اسی طرح "الفاروق" سے ایک نقطۂ نظر کو تقویت پہنچتی ہے اور مرقع میں کہیں کہیں "چشم مجنوں" کی حسن آفرینی بھی ہے لیکن کیا یہ کتاب فی الحقیقت مثال اسلامی ریاست کی ایک دل فریب، ولولہ انگیز، ہوشمندانہ داستان نہیں؟۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت شیخ اکرام کے مضمون "شبلی کی شخصیت" سے لیا گیا ہے۔

سیاق وسباق:۔ شیخ صاحب نے علامہ کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ سید سلیمان ندوی کے ایک بیان پر تبصرہ کر رہے ہیں جو علامہ شبلی کے حوالے سے ہے۔

تشریح:۔ سید سلیمان ندوی کا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ واقعی مولانا شبلی کی کئی تحریریں ایسی ہیں جن میں وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکے۔ ان کا مقصد بالواسطہ یا براہِ راست کسی خاص نظریہ کی کامل حمایت کر کے اسے مضبوطی سے پیش کرنا تھا مگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وہ اپنی ان مقصدی تحریروں کو کس قدر بلند پایۂ بنانے میں کامیاب رہے ہے۔ "سیرت النعمان" کی تحریریں ان کے کٹر حنفی عقائد کا عمل دخل تو تھا

مگر انہوں نے حقیقت سے کسی بھی طرح کا اصولی انحراف کئے بغیر حنفیت کی جو منظر کشی ہے اور اس مذہبی طریقے کو جسے تقلید اور جمود کا رستہ سمجھا جاتا تھا، اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے کس قدر ترقی پسند مسلک ظاہر کیا ہے اور اسے کس طرح معاشرتی ترقی کے لئے سب سے زیادہ قابلِ عمل راستہ ثابت کیا ہے۔ وہ قوم کے سب سے بڑے طبقے یا فرقے (یعنی حنفی فرقے کے لوگ) ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے ذہنی اُفق کو بلند کرنا چاہتے تھے اور ان کے پیغامات سبھی مسلمانوں کے لئے تھے —— اسی طرح "الفاروق" میں بھی ان کے اپنے مخصوص مسلک کی جھلک نظر آتی ہے اور کہیں کہیں اپنے ہی مسلک کو زیادہ حسن و خوبی سے پیش بھی کیا گیا ہے مگر اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ یہ کتاب مثالی اسلامی ریاست کی ایک خوبصورت، جوش دلانے والی اور ہوش مندی سے رقم کی ہوئی داستان ہے۔

(۴)

علامہ شبلی کی آخری تالیف جس کی تیاری کے لئے موضوع کی عظمت و اہمیت کے اقتضا سے اُنہیں سب سے زیادہ اہتمام مطلوب تھا لیکن جسے وہ بے وقت وفات کی وجہ سے ختم نہ کر سکے 'سیرۃ النبی' تھی۔ وہ اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے بلکہ پہلی دو جلدوں کے متعلق بھی جو اُن کے قلم سے ہیں، مگر اُن کی وفات کے کئی سال بعد شائع ہوئیں، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ من و عن اُسی صورت میں ہیں جس میں وہ بشرطِ حیات اُنہیں خود پیش کرتے لیکن اس حالت میں بھی یہ دو جلدیں اُردو ادب کا بیش بہا زیور ہیں۔ واقعات کی تحقیق و تدقیق کے نقطۂ نظر سے کٹھن اور مشکل معاملات میں صحیح اور صائب نقطۂ نظر کے اعتبار سے اور عبارت کی پختگی و دلآویزی کے لحاظ سے جس نے موٹی موٹی کتابوں کی بھاری سلوں میں آبِ شیریں و سبک کے چشمے جاری کئے ہیں۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت "شبلی کی شخصیت" سے لی گئی ہے جو شیخ اکرام کی تحریر ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس تحریر میں شبلی کی شخصیت کا تذکرہ ہے۔ وہ ان کی کتابوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی آخری کتاب "سیرۃ النبی" کے حوالے سے کچھ باتیں بتا رہے ہیں۔

تشریح ۹۔ علامہ شبلی کی آخری کتاب ایسی تھی کہ اس کی تیاری کے لئے انہیں سب سے زیادہ اہتمام کرنا پڑا کیونکہ یہ سب کچھ اس عظیم و اہم موضوع کا تقاضا تھا —— یہ آخری کتاب "سیرۃ النبیؐ" ہے جسے وہ ختم کئے بغیر وفات پا گئے۔ وہ اپنے ارادوں کو کامل طور پر عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ ہم تو ان کی کتاب کی پہلی جلدوں کے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ انہوں نے بالکل اسی شکل میں لکھی تھیں جس شکل میں وہ ہمارے سامنے ہیں کیونکہ یہ بھی ان کی وفات کے کئی سال بعد شائع ہوئیں۔ ہو سکتا ہے وہ زندہ ہوتے تو انہیں کسی اور صورت میں پیش کرتے لیکن جس شکل میں بھی ہیں، یہ دونوں جلدیں اُردو ادب کا گراں قدر زیور ہیں —— یہ وہ کتاب ہے جس میں چھان پھٹک اور باریک بینی سے کام لیا گیا ہے، مشکل مسائل کے بارے میں صحیح اور درست رائے دی ہے اور عبارت میں پختگی اور دلفریبی ملحوظ رکھی ہے —— ان سب امور کا جائزہ لیا جائے تو یہ دوسری بے شمار ضخیم کتابوں پر بھاری ہیں جو ان کے سامنے معمولی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

(۵)

"سیرۃ النبی" کی اہمیت فقط موضوع کی عظمت اور مصنف کی علمیت، محنت، کمال انشاپردازی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ کتاب ہمارے سب سے بڑے عالم ادیب کی پختگی عمر و فکر و طبیعت کا شاہکار ہے۔ اس میں "الفاروق" کی طرح خون گرما دینے والی فتوحات کا تذکرہ نہیں اور نہ ہی نظم و نسق اور ملکی انتظامات کا وہ دل فریب اور تفصیلی نقشہ ہے۔ جس کی چکا چوند سے شبلی عہد حاضر کی روشنی پھیکی کرنی چاہتے تھے۔ "سیرۃ النبی" میں "الفاروق" کی عام پسند چیزیں تھوڑی ہیں۔ یہ خاصے کی چیز ہے اور اہلِ نظر کے نزدیک ناتمام حالت میں بھی (آخر ان دو جلدوں میں سارے سوانحی حالات اور اسوۂ حسنہ کا ذکر مکمل طور پر آ گیا ہے) شبلی کا سب سے اہم تصنیفی کارنامہ ہے۔ دوسری علمی اور ادبی خوبیوں کے علاوہ اس کتاب کی قابلِ ذکر خصوصیت ایک نیا نقطۂ نظر ہے —— جس میں نئی بالغ نظری، ایک نئی رواداری اور نئی بلند نگہی

جھلکتی ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ اقتباس شبلی کی شخصیت (مصنف ۔ شیخ اکرام) سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق:۔ شیخ اکرام علامہ کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے "سیرۃ النبیؐ" کا خصوصاً ذکر کرتے ہیں۔

تشریح:۔ "سیرۃ النبیؐ" صرف اس لئے ہی اہم نہیں کہ اس کا موضوع بہت عظیم ہے اور مصنف نے اس میں، علم، محنت اور مضمون نگاری کے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ کتاب ہمارے سب سے بڑے عالم ادیب کی ہے جو اس کی پختہ فکر اور طبیعت کے ساتھ ان کی پختہ عمری کا بھی کارنامۂ عظیم ہے۔ اس میں "الفاروق" کی طرح ایسی فتوحات کا ذکر تو نہیں ملتا جو قاری کو جوش دلا دے اور نہ ملکی انتظامات اور نظم و ضبط کا ایسا دلآویز منظر پیش کیا ہے جس کی روشنی کے سامنے موجودہ زمانے کی ساری روشنیاں ماند پڑ جائیں ۔ "سیرۃ النبیؐ" میں "الفاروق" کی طرح عام پسند کا مواد نہیں ۔ یہ تو خاص الخاص شے ہے اور صاحبِ نظر لوگوں کی رائے میں نامکمل حالت میں بھی ان دو جلدوں میں سارے حالاتِ زندگی اور اخلاق و عادات کا ذکر آ گیا ہے، شبلی کا نہایت اہم کارنامہ ہے ۔ دوسرے علمی و ادبی اوصاف کے علاوہ اس کا لائقِ ذکر وصف اس میں موجود نیا نقطۂ نظر ہے جس میں ذہانت، رواداری اور بلند حوصلگی کے عناصر کارفرما ہیں۔

سیّد وقار عظیم

خلاصہ

اقبال شاعر اور فلسفی

علامہ اقبال نے ایک مکمل اور عملی فلسفہ دیا اور خودی کے مفہوم سے متعارف کروایا ان کے نزدیک خودی کے استحکام اور نشوونما کا ذریعہ عمل پیہم ہے اور عشق کے ذریعے خودی اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ فلسفۂ اقبال کی رو سے انسان کا تعلق ایک طرف اجتماعی زندگی اور دوسری طرف حقیقتِ مطلق سے ہے۔ یہ فلسفۂ اقبال کے جذبات اور ذہنی تجربے کی پیداوار ہے۔

اقبال کے فلسفہ حیات کی بنیاد اور اس کا مرکز و محور تصور خودی ہی ہے۔ فکرِ اقبال اور تخیل کی ہم آہنگی سے بر حیات گیر فلسفہ پیدا ہوا وہ شاعرانہ حسن کے تقاضوں سے مزین ہے۔ ساقی نامہ اس کی بہترین مثال ہے۔ مثنوی ہر دور میں مقبول عام رہی ہے۔ سادگی اور ترنم کے سبب یہ دل پر اثر کرتی ہے۔ اقبال نے ساقی نامہ کے لیے اس صنف کو منتخب کیا۔ ان کی فکرانگیز تشبیہوں کے ذریعے پوری نظم میں ایک نغماتی وحدت پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں اقبال کی شاعرانہ اور حکیمانہ فطرت مکمل طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔

اقبال کے فن کے حسن کمال اور چابک دستی کا بہترین نمونہ ان کی منظم "حقیقتِ حسن" ہے۔ چودہ مصرعوں پر مشتمل اس نظم کی رگوں میں زندگی کا جیتا جاگتا خون گردش کرتا نظر آتا ہے۔ ایک مصرعے میں حسن اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے کہ دنیا میں تو نے مجھے لازوال کیوں کیوں نہ کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختصر جواب ملتا ہے کہ دنیا ایک طرح کا تصویر خانہ ہے اور یہ عدم کی طویل رات کا فسانہ بھی ہے۔ اس سے اگلے شعر میں اس راز کو اور زیادہ واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اس طرز پر نظم آگے بڑھتی جاتی ہے۔ شاعر کا رنگین تصور اس خوبصورتی سے ایک تصویر بناتا ہے کہ اس کا نقش قاری کے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔

اور پھر اسے مٹا دیتا ہے اور اس کی جگہ نئی تصویر بن جاتی ہے۔ یہ تصویریں ڈرامے میں تموج پیدا کرتے کرتے اسے نقطۂ عروج تک پہنچا دیتی ہیں اور پھر نظم ایک غم انگیز تاثر پر ختم ہو جاتی ہے۔

کلامِ اقبال میں ہمیشہ ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب حکیمانہ اور جمالیاتی حسن ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ جہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ حکیمانہ سنجیدگی سے یہ مقصد حل نہیں ہو سکتا وہاں جمالیاتی رعنائی سے کام لے کر ایسے انداز میں بات کہتے ہیں کہ ان کا کہا ہوا ایک ایک حرف قاری کے دل پر اثر پذیر ہوتی ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۷۱:۔ سبکدوش۔ فارغ ؛ نوخیز۔ نوجوان ؛ متعلمین۔ شاگرد ؛ تازہ واردانِ بساطِ ادب و تخلیق۔ ادب اور تخلیق کے میدان میں نئے آنے والے لوگ ؛

صفحہ نمبر ۷۲:۔ مربوط۔ ربط کیا گیا، وابستہ ؛ عملِ پیہم۔ مسلسل عمل ؛ استحکام۔ مضبوطی ؛ تصادم۔ ٹکراؤ ؛ مستحکم۔ مضبوط ؛ منصبِ اعلیٰ۔ بلند مقام ؛ اساس۔ بنیاد ؛ مصلح۔ اصلاح کرنے والا ؛ مبلغ۔ تبلیغ کرنے والا، بڑی اہم ذمہ داری ؛

صفحہ نمبر ۷۳:۔ ہم آہنگی۔ ہم آواز ہونا ؛ رازِ درونِ حیات۔ زندگی کا اندرونی راز، زندگی کا اصل راز ؛ حیات گیر فلسفہ۔ ایسا فلسفۂ حیات جو ساری زندگی پر حاوی ہو ؛

صفحہ نمبر ۷۴:۔ خلوت۔ تنہائی ؛ تابناک۔ روشن ؛ تجسس۔ ٹوہ، دریافت کی شدید خواہش ؛ دمادم۔ مسلسل۔ ہر آن ؛ سبک۔ ہلکا ؛ سنگِ گراں۔ بھاری پتھر ؛ ضرب۔ چوٹ ؛ ریگِ رواں۔ بہنے والی ریت ؛ تقویم۔ جنتری ؛ شرر۔ چنگاری ؛ اسیر۔ قید ؛ سمائی۔ گنجائش ؛ دروبست۔ بندش۔ کٹائی۔ بندھائی ؛ زیر و بم۔ اونچ نیچ ؛

صفحہ نمبر ۷۵:۔ چابک دستی۔ مہارت ؛ بصری۔ جس کا تعلق نظر سے ہو ؛ سمعی۔ جس کا تعلق سننے سے ہو ؛

صفحہ نمبر ۱۷۶:- نمود- دکھاوا؛ ظاہر ہونا؛ مدلل- دلائل پر مبنی؛ دل شکن- دل توڑنے والا؛ مسکت- چپ کرا دینے والا؛ دل دوز- دل ہلا دینے والا؛ بامِ فلک- آسمان کی چھت؛

صفحہ نمبر ۱۷۷:- تموّج- لہریں اٹھنا، جوش؛ اخترِ سحر- صبح کا ستارہ؛ محرم- واقفِ راز؛ سوگوار- اداس؛ حکیمانہ- فلسفیانہ؛ رعنائی- خوبصورتی؛

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

اقبال، فلسفی اس معنی میں ہیں کہ انہوں نے اپنے مخاطب یا قاری کو زندگی کا ایک مربوط، منظم اور بعض حیثیتوں سے ایک مکمل اور عملی فلسفہ دیا ہے۔ اس فلسفے نے ہمیں "خودی" یا "انا" کے معنی بتائے ہیں اور مثالوں اور دلیلوں کے ذریعے اس حقیقت کے رُخ سے پردہ اُٹھایا ہے کہ "عمل پیہم" خودی کی نشوونما اور اس کے استحکام کا ذریعہ ہے۔ یہ فلسفہ انسان اور اس کے خارجی ماحول کی ٹھوس مادی قدروں کے درمیان تصادم کا فلسفہ ہے۔ خارجی ماحول انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کے لئے ایک طرح کے چیلنج اور للکار کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی للکار اُس کی صلاحیتوں کو اُبھرنے اور نمایاں اور مستحکم ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ اس فلسفے کے نزدیک انسان کا ایک رشتہ اس اجتماعی زندگی کے ساتھ ہے جس نے اُسے جنم دیا، پالا پوسا اور پروان چڑھایا ہے اور دوسرا رشتہ اُس حقیقت مطلق کے ساتھ جو کائنات کی اور اس طرح انسان کی حیات کا سرچشمہ ہے۔ اقبال کے اس فلسفے کے نزدیک انسانی خودی یا انا کو ارتقا کے مختلف مرحلے طے کرنے کے لئے جو پیچ در پیچ اور دشوار راہیں طے کرنی پڑتی ہیں ان میں کبھی عقل اُس کی رہنما بنتی ہے اور جہاں عقل عاجز آجائے وہاں عشق یہ منصب اعلیٰ ادا کر کے خودی کو اُس کی منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت سید وقار عظیم کے مضمون "اقبال — شاعر اور فلسفی" سے

سانچے میں ڈھلتا ہے تو کبھی وعظ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور کبھی شاعری، اور دونوں صورتوں میں دل نشین بھی ہوتا ہے اور مؤثر بھی۔ اقبال کے خلوص نے ان کے وعظ میں قوت پیدا کر دی ہے اور شاعری کو حسن و جمال عطا کیا ہے اور یہ بات اُن کی اردو شاعری میں بھی اسی طرح ہے جس طرح فارسی شاعری میں۔ اس وعظ میں یا وعظ نما شاعری میں مصلح یا مبلغ کا لہجہ اور انداز صرف کبھی کبھی پیدا ہوا ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت سید وقار عظیم کے مضمون "اقبال — شاعر اور فلسفی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ سید صاحب اقبال کو شاعر کے علاوہ فلسفی ثابت کرتے ہیں اور ان کے فلسفۂ خودی پر بحث کرتے ہیں۔

تشریح:۔ اقبال کے اس جامع اور منظم فلسفہ (فلسفۂ خودی) ایک نہائیت جذباتی اور ذہنی تجربے یا واردات سے جنم لیا ہے — جب یہ نہائیت درجے کا جذباتی اور ذہنی تجربہ، جس نے اقبال کے مزاج اور اس کی شخصیّت کی نس نس کو نہ صرف متاثر کیا اور اس کی نس نس میں سما گیا، جب باہر آنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور الفاظ کی صورت اختیار کرتا ہے تو کبھی وعظ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور کبھی شاعری — تاہم — دونوں ہی صورتوں میں وہ ہوتا دلچسپ، دل میں بیٹھ جانے والا اور اثر کرنے والا ہی ہے۔ اقبال مخلص انسان تھے۔ انسان کے جذبۂ خلوص نے ان کے وعظ میں طاقت پیدا کر دی اور ان کی شاعری کو دلآویز بنایا ہے — یہ بات ان کی اردو شاعری میں بھی ہے۔ اور فارسی شاعری میں بھی — اس وعظ یا وعظ سے ملتی جلتی شاعری میں صرف کہیں کہیں اقبال کا لہجہ ایک مصلح یا مبلغ کا ہوتا ہے یعنی اکثر مقامات پر پتہ نہیں چلتا کہ وہ وعظ یا تبلیغ کر رہے ہیں۔

(۳)

اقبال کے فلسفۂ حیات کی اساس اور محور و مرکز خودی کا تصور ہے۔ ان کے فکری نظام کے باقی تمام عناصر اور اجزا اس محور کے گرد گھومتے ہیں اقبال کے اس بنیادی تصوّر کی فاضلانہ وضاحت ان کے لیکچروں میں

سیاق و سباق:- سید صاحب کا اپنے فاضلانہ مضمون میں اقبال کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ اقبال صرف شاعر ہی نہ تھے، بڑے اہم فلسفی بھی تھے۔

تشریح:- اقبال کو ان معنوں میں فلسفی کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنے پڑھنے اور سننے والوں کے سامنے زندگی کا ایک جامع، منظم اور کئی پہلوؤں سے مکمل ایسا فلسفہ پیش کیا ہے جو سراسر قابلِ عمل بھی ہے۔ اس فلسفے نے ہمیں "خودی" یا "میں" کے معانی بتائے ہیں اور مثالوں اور دلیلوں کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ خودی صرف مسلسل عمل ہی سے پھیلتی پھولتی اور مضبوط ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ انسان اور اس کے بیرونی ماحول کی ٹھوس مادی اقدار کے ساتھ ٹکراؤ کا فلسفہ ہے۔ انسان کا بیرونی ماحول اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے، ایک للکار کا درجہ رکھتا ہے —— اور یہی للکار (یا نعرۂ مستانہ) اسے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے، نمایاں کرنے اور مضبوط بنانے پر اکساتا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق انسان کا ایک رشتہ تو اس اجتماعی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جس نے اسے پیدا کیا، پرورش کی اور جوان کیا —— اور —— دوسرا رشتہ اس حقیقتِ مطلق یعنی خداوند کریم کے ساتھ ہے جس نے کائنات اور انسانی زندگی کو پیدا کیا —— اقبال کے اس فلسفے کے مطابق انسانی خودی یا انا کو تدریجاً ترقی کرنے کے لئے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ بہت پیچدار اور مشکل ہیں ان مراحل میں کبھی تو عقل انسان کی رہبری کرتی ہے اور کبھی ایسا مقام آجاتا ہے جہاں عقل کام نہیں کرتی — ایسے مقام پر جہاں عقل بالکل عاجز آجائے وہاں یہ ذمہ داری جو بہت بڑی ذمہ داری ہے، عشق انجام دیتا ہے اور اسے اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچاتا ہے۔

(۲)

اقبال کا یہ مربوط اور منظم فلسفہ ایک گہرے اور شدید جذباتی اور ذہنی تجربے یا واردات کی پیداوار ہے۔ یہ شدید جذباتی اور ذہنی تجربہ جو اقبال کے مزاج، اس کی شخصیت اور اس شخصیت کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے، جب ابھرنے کے لئے بے تاب ہوتا اور لفظوں کے پیکر یا

ہوئی ہے اور اسے شاعرانہ زبان اُن کی معروف مثنوی 'اسرار خودی' میں اور اس کے علاوہ ان کے فارسی اور اُردو کلام کے مختلف حصّوں میں ملی ہے۔ اقبال نے جب کبھی شعر کو اس فلسفیانہ خیال کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے تو ایسا بہت کم ہوُا ہے کہ بیان کا شاعرانہ حسن اس نازک اور لطیف فلسفیانہ تصور کا پورا ساتھ نہ دے سکا ہو یا پوری طرح اپنے آپ کو اس کے اندر جذب کر لینے میں کامیاب نہ ہوُا ہو۔ اقبال کے فکر اور تخیّل کی مکمل ہم آہنگی سے جو جاندار اور حیات گیر فلسفہ پیدا ہوُا ہے اُسے شاعر نے جب کبھی لفظوں کے سانچے میں ڈھالا ہے تو شاعرانہ حسن کے تقاضوں نے اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت سیّد وقار عظیم کے مضمون "اقبال ۔ شاعر اور فلسفی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- سید وقار عظیم اقبال کو فلسفی شاعر ثابت کرتے ہوئے ان کے فلسفۂ حیات پر بحث کرتے ہیں۔

تشریح:- اقبال نے زندگی کا جو فلسفہ پیش کیا، اس کی تمام تر بنیاد خودی کا تصور ہے اور اسی مرکز (خودی) کے گرد ان کا تمام تر فلسفۂ زندگی گردش کرتا ہے ۔ اقبال کے اس تصور کی جو بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، عالمانہ وضاحت ان کے لیکچروں میں ہوتی ہے۔ اور شاعرانہ توضیح ان کی جانی پہچانی مثنوی "اسرارِ خودی" اور اُردو و فارسی کلام کے بعض حصّوں میں ہوتی ہے ۔ جب بھی اقبال نے شاعر کو اس فلسفۂ حیات کی پیش کش کے لئے استعمال کیا تو شاید ہی کبھی ایسا ہوُا ہو کہ بیان کے شاعرانہ حُسن نے اس نازک اور نہایت پاکیزہ فلسفے کے تصوّر کا پورا ساتھ نہ دیا ہو یا پوری طرح اپنے آپ کو اس کے اندر سمو نہ دیا ہو ۔ اس اعتبار سے اقبال کامیاب ہیں ۔ اقبال کی سوچ اور خیال آفرینی جب آپس میں پوری طرح یکجا ہو جاتے ہیں تو جو توانا اور زندگی بخشنے والا فلسفہ پیدا ہوتا ہے اسے جب بھی اقبال نے لفظوں کا پیراہن عطا کیا ہے تو شاعرانہ حسن کو ضرور ملحوظ رکھا ہے۔

(۴)

مثنوی ہماری شاعری کی ایسی صنف ہے جو شاعری کے ہر دور میں اس لئے پسندیدہ اور مقبول رہی ہے کہ اس کی پاکیزہ سادگی اور سلاست میں ترنم کی ایسی جھنکار شامل ہے جو سیدھی دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کی مختصر سیدھی سادی اور رواں بحریں اپنے بہت سے امکانات کے باوجود گہرے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ اس صنف کا نرم و نازک پیمانہ کہانی جیسی ہلکی پھلکی چیز کے سوا کسی اور وزنی چیز کا بار نہیں اُٹھا سکتا۔ مثنوی کی مختصر بحر میں بارہ تیرہ لفظوں سے زیادہ کی سمائی نہیں ہوتی، اس کے ہر شعر پر مطلع ہونے کی جو پابندی ہے اُس کی بنا پر بات کہنے کی گنجائش میں اور بھی کمی آجاتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کی سادہ روزمرہ کہانی کی زبان تو آسانی سے بن سکتی ہے لیکن یہ فلسفہ و حکمت کے بیان کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اقبال نے ’ساقی نامہ‘ کے لئے اس دشوار اور بعض صورتوں میں ناممکن صنف شعر کو اختیار کر کے اس کے جملہ فنی تقاضے بہ حسن و خوبی پورے کئے ہیں۔ مثنوی کی زبان شروع سے آخر تک سادہ اور سلیس ہے۔ اس سادہ و سلیس زبان میں ہر جگہ الفاظ کے انتخاب میں مؤثر موزونیت ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور در و بست میں موسیقی کی جھنکار کے ساتھ ساتھ موجوں کی سی روانی اور زیر و بم ہے۔ شاعر نے خیال کی ادائیگی میں سیدھی سادی لیکن خیال افروز اور فکر انگیز تشبیہوں سے جو مدد لی ہے اُس کی بنا پر پوری نظم نے نغماتی وحدت کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس کا مطالعہ پڑھنے والے کے لئے ایک ایسا مؤثر، دل نشین، روح پرور اور نشاط انگیز تجربہ بن جاتا ہے جس میں ہر جگہ تازگی بھی ہے شگفتگی بھی۔ اقبال کی شاعرانہ فطرت نے ایک ایسے ذہنی تجربے کو جو بنیادی طور پر فلسفیانہ ہے، بڑی خوبصورتی سے ایک ایسے جذباتی تجربے کی صورت دی ہے جو ہر سُننے والے کا جذباتی احساس بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں اقبال کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ فطرت پوری طرح ایک دوسرے

سے ہم آہنگ ہیں اور یہ بات صرف "ساقی نامے" تک محدود نہیں،
اقبال ہمیشہ حکمت کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

حوالۂ متن :۔ یہ عبارت "اقبال ۔ شاعر اور فلسفی" (سید وقار عظیم) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق :۔ سید وقار عظیم اقبال کو فلسفی شاعر ثابت کرتے ہوئے ان کی مثنوی کے محاسن بیان کرتے ہیں۔

تشریح :۔ مثنوی ہماری شاعری کی ہر دور میں پسند کی جانے والی مقبول صنفِ سخن ہے۔ اس میں لطیف سادگی اور سلاست میں ایسا مخصوص ترنم پایا جاتا ہے جو سیدھا دل پر اثر کرتا ہے۔ اس کی بحریں سیدھی سادی اور رواں ہوتی ہیں اور ان میں مضامین کی پیشکش کے اعتبار سے بڑے امکانات ہیں۔ اس کے باوجود یہ صنف زیادہ سنجیدہ فلسفیانہ خیالات کی پیشکش کے لئے مناسب نہیں۔ یہ نرم و نازک صنفِ سخن ہلکی پھلکی کہانی یا ایسی سی کسی اور شے کے سوا کسی بھاری شے کا بوجھ نہیں سہار سکتی۔ مثنوی کی مختصر بحر میں بارہ تیرہ الفاظ سے زیادہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس کے ہر شعر پر مطلع ہونے (یعنی ہر شعر کے دو مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف یا صرف ہم قافیہ ہوں) کی جو پابندی لاحق ہے، اس نے مضامین کی پیشکش کی گنجائش اور بھی کم کر دی ہے ۔۔ اسی لئے مثنوی کہانی کے لئے تو موزوں ہے مگر اس میں فلسفہ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ اقبال نے اس کے باوجود۔۔ "ساقی نامہ" کے لئے اسی مشکل اور اکثر صورتوں میں ناممکن صنفِ سخن کا انتخاب کیا تو اس کے تمام ترفنی تقاضے بھی پورے کئے اور شاعرانہ حسن بھی قائم رکھا۔۔ مثنوی کی زبان شروع سے آخر تک سادہ و سلیس ہے اور ہر جگہ الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ ان سے اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب اور بندشوں نے موسیقی کی ایسی دل پسند کیفیت پیدا کر دی ہے جسے موجوں کی روانی یا اتار چڑھاؤ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔۔ شاعر نے خیالات کی پیشکش کے دوران سیدھی سادہ مگر خیال اور فکر کو بیدار کر دینے والی تشبیہیں استعمال کی ہیں جن کی وجہ سے پوری نظم میں موسیقی کے اعتبار سے ایک وحدت قائم ہو گئی ہے اور جب قاری اسے پڑھتا ہے تو اس کا مطالعہ اس کے لئے ایک اثر آفرین، دل میں گھر کر جانے والا، روح میں بیداری پیدا کرنے والا اور اُمنگ پیدا کرنے والا تجربہ بن جاتا ہے جس میں ہر جگہ تازگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ اقبال کی شاعرانہ

طبیعت نے ایسے ذہنی و روحانی تجربے کو جو اصلاً تو فلسفیانہ ہے، بڑے کمال کے ساتھ ایک ایسے جذباتی تجربے کی شکل دے دی ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنا جذباتی احساس معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اقبال کی شاعرانہ طبیعت اور فلسفیانہ فطرت پوری طرح ایک دوسرے کا ساتھ دے رہی ہیں — اور — یہ خوبی صرف "ساقی نامہ" ہی میں نہیں ملتی بلکہ اقبال ہر جگہ فلسفے کو شاعرانہ پیرائے میں بیان کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

جدید اردو نثر کا مسئلہ

کسی نئے خیال اور نئی بات کو اپنی زبان کا حصہ بنانا ایک تخلیقی عمل ہے جس کے لیے مصنف کو کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ پیٹ مور کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی ہر کتاب برسوں کے غور و غوص کے بعد لکھی ہے۔ نثر کو اظہار خیال کا آسان ترین سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کے اسلوب کی طرف نثر نگاروں نے بڑی کم توجہ دی ہے۔ حالانکہ اچھی اور صاف نثر لکھنا اچھے شعر سے زیادہ مشکل ہے۔ شعر میں ابہام سے کام چل جاتا ہے جب کہ نثر میں ہر بات واضح الفاظ میں دوسروں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ ایک اچھے نثر نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس زبان پر عبور، ادبیات سے واقفیت، الفاظ کے معانی کے باریک اور لطیف فرق سے واقفیت ہو۔

آزاد نے آب حیات کے لکھنے کے لیے بہت محنت کی۔ مسودہ کی کئی دفعہ تصحیح کرنے کے بعد اسے اپنی مطلوبہ شکل میں ڈھالا یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخی غلطیوں کے باوجود آج بھی زندہ ہے نثر میں ڈھیلا پن ہو تو آورد ہی کہلائے گا۔ خواہ اسے کتنی ہی تیزی سے لکھا گیا ہو لیکن اس کے برعکس کم از کم الفاظ پوری طرح کھپنے کے لیے خواہ کتنا ہی وقت لگا ہو آمد ہی کہلائے گا۔

موقع محل کے مطابق مناسب الفاظ کا استعمال زبان کو خوبصورت بنا دیتا ہے یہ بات درست نہیں کہ شعوری کوشش سے تصنع پیدا ہوتا ہے۔ ابوالکلام آزاد نے جیل سے حبیب الرحمان شروانی کے نام جو خط لکھے ان کی نثر مصنوعی اور خطیبانہ عبارت آرائی کی بہترین مثال ہے۔ آرنلڈ کے نزدیک اچھے اسلوب سے مراد یہ ہے کہ مصنف کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہو اور وہ اسے زیادہ سے زیادہ واضح طور پر ظاہر کر سکے نیاز فتحپوری بغیر کسی پلاٹ کے افسانہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے کھوکھلی عبارت اور مصنوعی

جذبات کے مظہر ہیں۔ اچھی نثر خیال اور جذبے کے اتحاد سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے بیشتر ادباء نثر کو شعرانہ رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ نثر کے تقاضے اور حدود بنیادی حد تک شاعری سے مختلف ہوتے ہیں۔ جدید نثر عام بول چال کی زبان سے قریب اور شاعری کے اثر سے پاک ہونی چاہیے۔ خیالات کے اظہار پر توجہ دینے سے اچھی نثر وجود میں آتی ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۷۸:- منصب۔ عہدہ، ذمہ داری ٭ غیر مبہم۔ بالکل واضح ٭ سربرآوردہ۔ مشہور، قدآور ٭

صفحہ نمبر ۷۹:- بدیسی۔ غیر ملک کی ٭ ریاضت۔ سخت محنت ٭ ابہام۔ عدم وضاحت ٭ لحن۔ سریلی آواز ٭ آواز، خوش خوابی، خوش آوازی ٭

صفحہ نمبر ۸۰:- آمد۔ وہ کلام جو قدرتی طور پر ازخود قلم سے نکل جائے ٭ آورد۔ وہ کلام سوچ بچار کے بعد کسی قدر بناوٹ سے لکھا جائے ٭

صفحہ نمبر ۸۱:- تصنع۔ بناوٹ ٭ بے محل۔ بے موقع ٭ صرف۔ خرچ، استعمال ٭

صفحہ نمبر ۸۲:- اتحاد۔ میل، اتفاق ٭ جبلت۔ فطرت ٭ شعور۔ سمجھ، عقل ٭ ایہام۔ وہم میں ڈالنا، اصطلاحِ شعر میں وہ صنعت ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں ایسے لفظ لائے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب کے، دوسرے بعید کے لیکن شاعر بعید کے معنی مراد لے ٭ رعایتِ لفظی۔ ایک قسم کی تحریر جس میں الفاظ دوسرے الفاظ کی مناسبت سے لاتے ہیں۔

صفحہ نمبر ۸۳:- مجروح۔ زخمی ٭ پیوست۔ ملا ہوا، جڑا ہوا ٭

متن کے حوالے اقتباسات کی تشریح

(۱)

نثر میں اسلوب کی طرف ہمارے نئے نثر نگاروں نے بہت کم توجہ دی ہے اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ نثر خیال کے اظہار کا سب سے آسان

ذریعہ ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اچھی اور صاف نثر لکھنا، اچھے شعر لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ نثر میں شعر سے زیادہ الفاظ استعمال میں آتے ہیں اور ان الفاظ کے ذریعے اپنی بات کو دوسروں تک اس طور پر پہنچانا ہوتا ہے کہ وہ اسے بغیر کسی دشواری کے سمجھ جائے۔ شعر میں ابہام لطف دیتا ہے لیکن نثر میں یہ عیب بن جاتا ہے۔ ایک فرانسیسی نقاد کا خیال ہے کہ نثر میں ہر بندش اور ترکیب کے لئے ایک نیا ضابطہ بنانا پڑتا ہے اور قدم قدم پر ایک نئی لحن کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب نثر نگار اپنی بات کو جامعیت کے ساتھ کہنے کی کوشش کرے۔ یہ عمل کوشش، تلاش اور محنت و توجہ ہی سے ممکن ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت "جدید اُردو نثر نگار کا مسئلہ" (ڈاکٹر جمیل جالبی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس مضمون میں جدید اُردو نثر کے تقاضوں کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

تشریح:۔ ہمارے نئے نثر لکھنے والوں نے نثر میں کسی خاص اندازِ تحریر کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ نثر اظہارِ خیال کا آسان ترین ذریعہ ہے مگر یہ بات غلط ہے ــــ اچھے شعر کے مقابلے میں اچھی اور ستھری نثر لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ نثر کے اندر شعر کے مقابلے میں زیادہ لفظ استعمال کر کے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے ــــ اور ــــ یہ خیال رکھنا ہوتا ہے کہ مخاطب بات کو کسی دقت کے بغیر سمجھ بھی جائے ــــ اگر کوئی غیر واضح بات شعر میں بیان کی جائے تو مزا دیتی ہے لیکن نثر میں غیر واضح بات کرنا بہت بڑی خامی ہے۔ ایک فرانسیسی نقاد کے خیال کے مطابق تو نثر میں ہر بندش اور ترکیب کے لئے نیا اصُول وضع کرنا پڑتا ہے اور ایک ایک قدم پر ایک نئی آواز کی ضرورت پیش آتی ہے اور جسے خود ڈھونڈنا پڑتا ہے ــــ یہ ضرورت اس وقت بالخصوص پیش آتی ہے جب لکھنے والا چاہتا ہو کہ اپنی بات مکمل طور پر کہہ لے یا دوسرے کو پوری طرح سمجھا لے ــــ اور ــــ کوشش، جستجو، محنت اور توجہ کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

(۲)

نثر نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ زبان، جس میں وہ لکھ رہا ہے، اُسے خوب آتی ہو اور اسے حاصل کرنے میں اُس نے محنت کی ہو۔ وہ نہ صرف اس کے ادبیات سے گہری واقفیت رکھتا ہو بلکہ اس زبان کی چھوٹی بڑی (کم و بیش) سب تحریروں کو پڑھ بھی چکا ہو۔ اُسے لفظوں کے معنی کے باریک و لطیف فرق سے بھی اچھی طرح باخبر ہونا چاہیئے۔ لہجوں سے پیدا ہونے والے معانی اُس کے لئے پردہ نہ بن جائیں۔ وہ لکھ کر کاٹنا بھی جانتا ہو اور کاٹ کر لکھنا بھی جانتا ہو۔ اس میں اتنا صبر بھی ہو کہ وہ اس وقت تک اپنی تحریر پر محنت کرتا رہے جب تک وہ خود نہ کہنے لگے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، اب اس سے بہتر طریقے سے نہیں کہہ سکتا۔ اُسے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ایک بات صرف ایک ہی انداز سے بہترین طریقے پر ادا ہو سکتی ہے اور نثر نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرز کو تلاش کرے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت ڈاکٹر جمیل جالبی کے مضمون "جدید اردو نثر کا مسئلہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مصنف جدید اُردو نثر کے تقاضوں کے حوالے سے بات کرتا ہے۔

تشریح:۔ نثر لکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس زبان میں لکھ رہا ہو، اس زبان پر اُسے عبور بھی حاصل ہو اور اس نے اس پر عبور حاصل کرنے میں محنت کی بھی ہو۔ وہ اس کے ادبی سرمائے سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اس کا بیشتر حصّہ اس کے زیر مطالعہ رہ چکا ہو۔ اسے لفظوں کے معنوں کا لطیف اور باریک فرق معلوم ہو۔ وہ مختلف لہجوں سے پیدا ہونے والے مختلف مطالب سے بے خبر نہ ہو۔۔۔ اسے علم ہو کہ لکھ کر کاٹنا اور کاٹ کر لکھنا کیا ہوتا ہے لیکن اس کے اندر حوصلہ اپنے لکھے ہوئے کو کاٹنے کا حوصلہ بھی ہو اور بار بار کاٹ کاٹ کر لکھنے کی محنت سے خوفزدہ نہ ہو۔ اس کے اندر صبر کا مادہ بھی ہو تاکہ وہ اسوقت تک اپنی تحریر پر محنت صرف کرتا رہے جب تک کہ وہ خود اس کے اطمینان کے مطابق نہ ہو جائے اور وہ یہ کہہ سکے کہ میں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا۔۔۔ اسے یہ بھی علم

ہونا چاہیئے کہ ہر بات کسی ایک ہی اندازِ تحریر میں پیش کی جا سکتی ہے اور اسے اس اندازِ تحریر کی جستجو بھی ہونی چاہیئے۔

(۳)

اچھی نثر کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا اس میں لفظوں کے نئے رشتے پیدا ہو گئے ہیں اور اس میں ایک ایسا لحن موجود ہے کہ وہ اثر، جو لکھنے والے کے اندر موجود تھا، اب دوسروں تک بھی پہنچ گیا ہے۔ ایسی نثر میں الفاظ وہ ہوں گے جن کی ضرورت ہوگی اور وہاں ہوں گے جہاں انہیں ہونا چاہیئے اور اسی وجہ سے عبارت اس ترشے ترشائے ہیرے کی طرح ہوگی جس سے روشنی کی کرنیں نکل رہی ہوں۔ یہ خیال کہ شعوری کوشش سے نثر میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے صحیح نہیں ہے لیکن اس کے برعکس یہ ہو سکتا ہے کہ بغیر شعوری کوشش کے لفظوں کے بے محل استعمال اور بے جا صرف سے عبارت میں بھونڈا پن اور تصنع پیدا ہو جائے۔ وہ نثر جس میں لکھنے والے کے پاس کہنے کے لئے کچھ یا بہت کچھ ہوگا، عام طور پر سادہ ہو گی اور جہاں کہنے والے کے پاس کچھ نہیں ہوگا یا بہت کم ہوگا وہاں وہ عبارت آرائی کے خوان میں سجا کر بلند آہنگ خطیبانہ الفاظ کے زرق برق خوان پوش سے ڈھک کر اسے پیش کرے گا تاکہ اُس کے خیال کی بے مائگی پڑھنے والوں سے چھپی رہے اور وہ صرف عبارت آرائی سے لطف اندوز ہوتا رہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت ڈاکٹر جمیل جالبی کے مضمون "جدید اُردو نثر کا مسئلہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مصنّف جدید اُردو نثر کے تقاضوں کے حوالے سے بحث کر رہے ہیں۔

تشریح:۔ اگر اچھی نثر کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اس میں الفاظ کے نئے رشتے پیدا ہو گئے ہیں اور اس میں ایسی خوش آوازی موجود ہے کہ بالکل وہی اثر جو لکھنے والے کے اندر، دوسرے کے دل تک پہنچ گیا — ایسی نثر کی خوبی یہ ہے کہ الفاظ

وہی ہوں گے جو درکار ہیں اور وہیں استعمال ہوں گے جہاں ان کا استعمال مناسب ترین اور حسبِ حال ہے۔ اسی لئے ایسی عبارت اس ترشے ہوئے ہیرے کی مانند ہو گی جس سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ارادی کوشش سے نثر میں بناوٹ آجاتی ہے۔ بلکہ اس کے اُلٹ، ہوتا یہ ہے کہ ارادی کوشش نہ کی جائے تو لفظ بے موقعہ استعمال ہو جاتے ہیں اور بلاضرورت استعمال میں آجاتے ہیں جس سے عبارت بناوٹی اور پھوہڑ سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ نثر جس میں لکھنے والے کے پاس واقعی کہنے کو کچھ ہو گا، عموماً سادہ ہو گی۔ اسی طرح جہاں لکھنے والے کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں یا بہت تھوڑا ہے، تو اس کی تحریر میں بناوٹ آجائے گی، عبارت کو ظاہری طور پر خوبصورت بنانے کا رجحان پیدا ہو جائے گا اور خوبصورت و دلپسند پیرائے میں خطیبانہ کے لہجے میں بات کرنے لگے گا تاکہ لوگوں سے اس کی خیالات سے بے بہرہ ہونے کی کیفیت چھُپی رہے اور خوبصورت عبارت کا لطف لینے ہی میں اُلجھ کر رہ جائیں۔

(۴)

ہمارے اکثر لکھنے والے جن میں خصوصیت کے ساتھ وہ ادیب شامل ہیں جو عام دلچسپی کی تحریریں اور مضامین، مثلاً سفرنامے، خودنوشتیں یا مختلف موضوعات پر ادبی مضامین لکھتے ہیں، عبارت میں نہ صرف فارسی تراکیب کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں بلکہ استعارہ و تشبیہہ، ایہام و رعایتِ لفظی سے نثر کو شاعرانہ رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے شاعرانہ انداز اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے اس روائتی ذوقِ شاعری سے فائدہ اُٹھائیں جو ہمارے تہذیبی مزاج کی گھٹی میں پڑا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں بار بار اشعار اور مصرعوں کا استعمال کرتے ہیں یا مصرعوں کے اجزاء کو اپنی عبارت میں کھپاتے ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ نثر کے تقاضے اور حدود بنیادی طور پر شاعری سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہمیں نثر کو اس طور پر استعمال کرنا چاہیئے کہ عام بول چال کی زبان سے اس کا رشتہ پورے طور پر قائم رہے۔ اس وقت جدید نثر کو شاعری کے اثر سے نکالنے کی ضرورت ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت ڈاکٹر جمیل جالبی کے مضمون "جدید اردو نثر کا مسئلہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ مصنف جدید اردو نثر کے تقاضے بیان کرتا ہے اور نئے لکھنے والوں کی کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

تشریح:۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے جن میں خاص طور سے وہ لکھنے والے شامل ہیں جو عام دلچسپی کے مضمون مثلاً سفرنامے، ذاتی یادداشتیں، یا مختلف دوسرے موضوعات پر لکھتے ہیں، وہ اپنی تحریریں نہ صرف فارسی کی ترکیبیں زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں بلکہ تشبیہات، استعارات، ابہام اور رعائیتِ لفظی سے نثر کو شاعرانہ رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھائیں کہ وہ شعر پڑھنا پسند کرتا ہے کہ یہ بات ہمارے تہذیبی مزاج کا حصہ ہے۔ وہ اپنے مضمون میں جگہ جگہ شعر اور مصرعے استعمال کرتے ہیں یا مصرعوں کے کچھ حصے اپنی تحریر میں جذب کر لیتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے نثر اور شاعری کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ہمیں نثر ایسی لکھنی چاہیئے جو اصلاً شاعری سے مختلف ہو اور اس کا تعلق عام بول چال کی زبان سے ہو۔ چنانچہ آج ضرورت ہے جدید نثر کو شاعری کے اثرات سے محفوظ کرنے کی۔

(۵)

خیال اور جذبے کے اتحاد سے مراد یہ ہے کہ خیال، جذبے کو ساتھ لے کر ویسے ہی پیدا ہوتا ہے جیسے بچہ اپنی جبلتیں ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جذبہ، خیال کی جبلت کی حیثیت رکھتا ہے۔ خیال کی یہ تصویریں پہلے پرچھائیں کی طرح ہوتی ہیں لیکن جب لفظ ان پرچھائیوں میں شامل ہونے لگتے ہیں تو یہ پرچھائیاں اُجاگر ہو کر صاف و شفاف تصویریں بننے لگتی ہیں۔ اب لکھنے والا شعور کی سطح پر انہیں واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے اور یہی وہ منزل ہوتی ہے جب اظہار کا کرب لکھنے والے کو بے چین کر دیتا ہے۔ ان لوگوں کی نثر جو صرف پرچھائیاں دیکھ کر لکھنے لگتے ہیں، بے اثر اور وقت سے پہلے توڑے ہوئے پھل کی طرح بے مزہ، کچی اور پھیکی ہوگی۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت "جدید اُردو نثر کا مسئلہ" (جمیل جالبی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- مصنف جدید نثر اُردو کے تقاضے زیرِ بحث لاتا ہے اور جدید نثر پیدا کرنے کے لئے راہیں بھی سمجھاتا ہے۔

تشریح:- جب میں خیال اور جذبے میں باہمی اتفاق کا ذکر کرتا ہوں تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ جیسے بچہ اپنی فطرت ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اسی طرح جذبہ خیال کی فطرت کی حیثیت رکھتا ہے۔ خیال کی تصاویر پہلے پرچھائیں کی طرح ہوتی ہیں، پھر وہ لفظوں کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں، گویا یہ تصاویر اب واضح ہونے لگتی ہیں۔ اب لکھنے والا شعوری سطح پر انہیں وضاحت کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں لکھنے والا لکھنے کے لئے بے چین ہوتا ہے اور اس کے اندر اظہار کے لئے ایک کرب جنم لینے لگتا ہے۔ جو لوگ صرف پرچھائیاں دیکھ کر ہی لکھ ڈالتے ہیں، ایسی تحریریں پیش کرتے ہیں جو یکسر غیر مؤثر ہوتی ہیں۔ اور ان کی مثال اس پھل کی سی ہوتی ہے جسے وقت سے پہلے ہی جبکہ ابھی وہ کچا، پھیکا اور بدمزہ ہوتا ہے، توڑ لیا جائے۔

(۶)

اظہار کے مسئلے کو سامنے رکھ کر اگر جدید اُردو نثر کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ ہمارے ہاں عام طور پر لکھنے والوں کے ہاں بیان کا مسلسل اظہار نہیں ملتا۔ ایک پیراگراف کے مختلف جملوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خیال کا تسلسل ہر نئے جملے پر مجروح ہو رہا ہے۔ ایک حصہ دوسرے حصے سے پوری طرح پیوست نہیں ہے۔ بات کو سامنے کے ایسے لفظوں سے جو بغیر کسی کوشش کے ذہن میں آ گئے ہیں، ادا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جا رہا ہے اور لفظوں کو لٹایا جا رہا ہے۔ چند لکھنے والوں نے جہاں اپنے خیالات کے اظہار پر توجہ دی ہے، وہاں (ضرور) اچھی نثر وجود میں آ گئی ہے۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت "جدید اُردو نثر" (ڈاکٹر جمیل جالبی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- ڈاکٹر جمیل جالبی جدید اُردو نثر کے تقاضے، اس کے لوازمات اور لکھنے والوں کی کمزوریاں بیان کرتے ہوئے اظہار کے مسئلے کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔

تشریح:۔ اگر ہم اظہار کے مسئلے کو لیں اور اسی کے معیار کی روشنی میں جدید اُردو نثر پڑھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہمارے لکھنے والوں کے ہاں بیان کا مسلسل اظہار ہے ہی نہیں — ایک ہی پیرے کے مختلف جملوں کو دیکھیں تو ہر جملے میں خیال کا تسلسل ٹوٹ رہا ہوتا ہے اور جملے کا ایک حصّہ دوسرے حصّے سے ملا ہوا نہیں ہوتا — کوشش کی گئی ہوتی ہے کہ جو لفظ فوراً مل جائیں انہیں کو استعمال میں لا کر کام چلا لیا جائے — پھر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جاتا ہے اور لفظ ضائع کئے جاتے ہیں — چند لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اظہارِ خیال کے مسئلے کی اہمیت کو سمجھا ہے اور انہوں نے اچھی نثر پیش بھی کی ہے۔

مولوی عبدالحق

(حالی کی سیرت)

سوانحی خاکہ

ملاحظہ کیجئے === صفحہ ۳۵

اندازِ تحریر کی خصوصیات

ملاحظہ کیجئے === صفحہ ۳۶

حالی کی سیرت

زندگی کے تجربات ہمیں عقل اور محنت ہمیں علم سکھاتا ہے۔ انسانی زندگی کا دارومدار علم و عقل کے تعاون پر ہے۔ لیکن انسانی سیرت کے بغیر علم اور عقل دونوں بے کار ہیں۔

صالح ماحول، صاحبِ اخلاق اساتذہ اور صاحب ذوق اصحاب کی محبت نے حالی کی سیرت کو نکھارا۔ وہ سادہ اور منکسر المزاج، سلیقہ مند اور مہمان نواز تھے۔ ان کے اندر خلوص، بڑوں کے لیے احترام اور بچوں کے لیے شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ دوسروں کی حوصلہ افزائی اور ان کے اچھے کاموں کی ستائش کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں احتیاط سے کام لینے کی تلقین بھی کرتے اور کسی سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا جس سے قومی یا ذاتی نقصان کا احتمال ہوتا تو بڑی نرمی اور خوش اسلوبی اور لطیف انداز میں اس کا احساس دلا دیتے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک مضمون "عالم اسلامی" پر لکھنا شروع کیا۔ جس میں برطانوی حکومت کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ اس پر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ قلم کے گھوڑے کو روک لیں۔ کیونکہ حکومت برطانیہ اسے برداشت نہیں کر پائے گی لہٰذا احتیاط لازم ہے۔

ان کی تحریر سے کبھی کسی فرقے کی دلآزاری نہیں ہوئی۔ وہ بڑے روادار اور غیر متعصب شخصیت تھے۔ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ نے محبت و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

۱۹۱۱ء میں وہ ناسازئ طبع کے باعث تبدیلی ہوا کے لیے فرید آباد آ گئے۔ اس محلے میں ایک عورت وزیرن نامی رہتی تھی۔ اس کا بچہ چیچک نکلنے کی وجہ سے ساری رات روتا رہا۔ تو آپ بے چین ہو گئے۔ صبح اٹھ کر جب تک ڈاکٹر سے اس بچے کو دوا لا کر نہ دی چین سے نہ بیٹھے۔

ان کے مزاج میں اعتدال اور ضبط موجود تھا۔ وہ دوسروں کے جذبات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک دفعہ دلی کے ایک مشاعرے میں داغ نے غزل سنائی لیکن حالی کے سامنے ان کی غزل رنگ نہ جما سکی تو حالی نے ان کو غیر طرحی غزل سنانے کو کہا جس پر ان کو خوب داد ملی۔ حالی کو اپنے ہم عصر شعراء سے کوئی رقابت نہ تھی۔ انہوں نے آزاد اور شبلی کی کتابوں پر بہت اچھے تبصرے کیے۔ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہونے کی بجائے اسے ٹال دیتے تھے۔ انہوں نے غریبوں اور مظلوموں کی ہمیشہ حمایت کی۔ عورتوں کی مظلومی کی حمایت کی۔ عورتوں کی مظلومی کی حمایت میں "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" نظمیں لکھیں۔

حالی کی شخصیت بہت سے اوصاف کی مالک تھی انہیں جامع الحیثیات شخصیت کہا جاتا ہے۔ شرافت، نیک نفسی اور اخلاق کے اوصاف ان کے اندر موجود تھے۔ ان کی شخصیت دوسروں کے لیے مثالی اور سبق آموز ہے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۸۴:- ابلاغ۔ بات کا دوسرے تک اسی انداز اور انہی معانی میں پہنچانا جو بولنے والے کا مقصود ہو، تبلیغ ؍ اشاعت ؍

صفحہ نمبر ۸۵:- صالح۔ نیک ؍ برگزیدہ۔ بزرگ انسان ؍ نامور۔ مشہور ؍ فروتنی، عاجزی ؍ خلقی۔ پیدائشی ؍ انکسار۔ عاجزی ؍

صفحہ نمبر ۸۶:- مدح سرائی۔ تعریف ؍ زود رنج۔ جلد ناراض ہو جانے والے ؍ عمال۔ افسر ؍ کارندے ؍ رنج۔ ذات ؍ رنج کی۔ بجی ؍ ذاتی ؍ دشنام۔

گالی ، اجہل ۔ بہت جاہل ، دستور ۔ قاعدہ ، طریقہ ، تامل ۔ سوچ بچار ، ہچکچاہٹ ،
صفحہ نمبر ۸۷ :۔ آسائش ۔ آرام ، اعتدال ۔ توازن ، دل دہی کرنا ۔ دل جوئی کرنا ، تسلی دینا ،
صفحہ نمبر ۸۸ :۔ ہم عصر ۔ ایک ہی عہد کے لوگ ، ہم چشم ۔ ہم مرتبہ ، رقابت ۔ مخالفت ، دشمنی ، بَری ۔ پاک ، بادلِ ناخواستہ ۔ بددلی سے ، کمیرا ۔ کام کرنے والا ، نوکر ،
صفحہ نمبر ۸۹ :۔ مناجات ۔ دعا ، التجا ، عرض ، نظیر ۔ مثال ، حذر ۔ خوف ، خطرہ ، پرہیز ، پند و نصائح ۔ نصیحتیں ، شغف ۔ لگاؤ ، دلچسپی ، انہماک ۔ توجہ ، محویت ،

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

علم ، محنت اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے ۔ عقل ، زندگی کے تجربوں سے آتی ہے ۔ علم ، بغیر عقل کے کارآمد نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات نقصان رساں ہوتا ہے اور عقل ، بغیر علم کے اکثر غلط رستے پر لے جاتی ہے ۔ علم اور عقل دونوں کے تعاون پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے ۔ لیکن ایک چیز اور ہے جو ان سے بھی برتر اور افضل ہے ، وہ انسان کی سیرت ، یعنی کیریکٹر ہے ۔ اس میں کچھ فطرت کا عطیہ ہوتا ہے ، جو پیدائشی ہے اور کچھ ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر ۔ جہاں یہ نہیں وہاں علم و عقل دونوں بے کار ہیں ۔

حوالہ متن :۔ یہ عبارت مولوی عبدالحق کے مضمون " حالی کی سیرت " سے لی گئی ہے ۔

سیاق و سباق :۔ اس مضمون میں مولوی عبدالحق حالی کی سیرت کے اہم پہلو بیان کرتے ہیں ۔

تشریح :۔ علم حاصل ہوتا ہے محنت اور کوشش سے اور عقل حاصل ہوتی ہے زندگی کے تجربات سے ۔ بغیر عقل کے اگر علم حاصل بھی ہو جائے تو فائدے بجائے اُلٹا نقصان پہنچاتا ہے اور بغیر علم کے عقل انسان کو بُری راہوں پر لگا دیتی ہے ۔ انسانی زندگی کا انحصار تمام تر علم اور عقل دونوں ہی کی معاونت پر ہے ۔ مگر ۔

ایک اور چیز بھی ہے جو ان سب سے بڑی اور بہتر ہے، وہ ہے انسان کی سیرت جسے کیریکٹر بھی کہتے ہیں۔ سیرت کے معاملے میں یہ بات بھی درست ہے کہ بڑی حد تک یہ قدرت کی طرف سے تحفتاً ملتی ہے۔ گویا سیرت ایک حد تک تو پیدائشی شے ہے لیکن کسی حد تک ماحول اور تعلیم و تربیت کے زیر اثر بھی بنتی چلی جاتی ہے — جہاں سیرت نہ ہو، وہاں علم اور عقل دونوں ہی بالکل بے کار ہیں۔

(۲)

مولانا حالی کو اپنے زمانے میں ایسا صالح ماحول اور ایسے برگزیدہ صاحبِ اخلاق اساتذہ اور عالی خیال صاحب ذوق اصحاب کی صحبت ملی جس نے ان کی نیک سرشت کے جوہر روشن کر دیئے۔ مجھے بہت سے نامور لوگوں سے ملنے اور بعض کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے کسی کو خلوص و صداقت، ہمدردی و رواداری میں حالی کا ہم پایہ نہ پایا۔ وہ ہماری اسلامی تہذیب اور شرافت کا سچا نمونہ تھے۔ نواب عمادالملک (مولوی سید حسین بلگرامی) فرماتے تھے کہ سید احمد خاں کے گروہ میں کوئی شخص انسانیت میں مولانا حالی کے رتبے کا نہ تھا، یہاں تک کہ سر سید بھی اس بات میں ان کو نہیں پہنچتے تھے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت "حالی کی سیرت" (مولوی عبدالحق) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مولوی عبدالحق حالی کی سیرت کے اہم پہلوؤں کو زیر بحث لاتے ہیں۔

تشریح:۔ مولانا حالی کو اپنے عہد میں ایسا نیک ماحول ملا، ایسے بزرگ اور اعلیٰ اخلاق والے استاد نصیب ہوئے اور ایسے روشن خیال صاحب ذوق لوگوں کی صحبت میسر آئی جس نے ان کی نیک فطرت کے جوہر روشن کر دیئے۔ مجھے کئی مشہور لوگوں سے میل ملاقات کا اور بعض کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے مگر میں نے کسی کو بھی خلوص، سچائی، ہمدردی اور برداشت کے لحاظ سے حالی کے برابر نہیں دیکھا۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری اسلامی تہذیب اور شرافت کا سچا نمونہ تھے۔ نواب عمادالملک فرماتے تھے کہ سر سید

کے ملتے ہی کوئی بھی شخص حالی کے پائے کا نہ تھا، یہاں تک کہ خود سرسید بھی سیرت کے اعتبار سے حالی کے ہم پایہ نہ تھے۔

(۳)

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس سے بڑھ کر انکسار کیا ہو گا کہ انہوں نے اپنی کتابوں پر جو حقیقی معنوں میں تصنیف ہیں کبھی مؤلفہ یا مصنفہ نہیں لکھا بلکہ ہمیشہ "مرتبہ" لکھتے تھے۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی وہ سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو فرماتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی ادب سے پیش آتے:

ہم نے ہر ادنا کو اعلا کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت "حالی کی سیرت" (مولوی عبدالحق) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ عبدالحق اس مضمون میں حالی کی سیرت کے اہم پہلو بتاتے ہیں۔

تشریح:۔ حالی کی طبیعت میں عاجزی اور خاکساری پیدائشی تھی۔ عاجزی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں پر جو واقعی ان کی تصانیف ہیں کبھی اپنے آپ کو مؤلف یا مصنّف نہیں لکھا بلکہ اپنے آپ کو مرتب لکھا۔ اتنے عظیم انسان ہوتے ہوئے بھی ہر ایک سے جھک کر ملتے اور خلوص سے پیش آتے۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے پیار تو کرتے ہی تھے مگر لبا اوقات اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے۔ خود کہتے ہیں۔ "ہم نے عاجزی اختیار کر کے ہر چھوٹے کو بڑا بنا دیا۔ سو ہم نے عاجزی سے بڑا کام لیا۔"

(۴)

اُن کی زبان سے کبھی کوئی سبک یا غیر مہذب لفظ نہیں سُنا گیا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا، نج کی بے تکلف گفتگو میں بھی اُن کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ سُننے میں نہیں آیا جو کسی فرد یا فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ اُن میں حد درجہ رواداری تھی۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ اُن کے شناساؤں اور دوستوں

ہیں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے اور سب سے خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ کبھی تکرار و بحث نہیں کرتے تھے۔ سب کی سُن لیتے تھے، مگر اپنی رائے کے اظہار میں یا حق بات کہنے میں کبھی تامل نہ کرتے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت عبدالحق کے مضمون "حالی کی سیرت" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ عبدالحق اس مضمون میں حالی کی سیرت کے خاص خاص پہلو زیر بحث لاتے ہیں۔

تشریح:۔ حالی کی زبان سے کبھی کسی نے کوئی ہلکی بات نہیں سُنی، کبھی کوئی تہذیب سے گرا ہُوا لفظ نہیں سُنا۔ تحریر اور تقریر کی تو کیا، وہ تو ذاتی بے تکلف بات چیت میں بھی کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرتے تھے جس سے کسی شخص یا فرقے کا دل دکھنے کا امکان ہو۔ طبیعت کے اندر برداشت کا مادہ تھا۔ ضد نام کو نہ تھی، بے جا جانبداری سے ناآشنا تھے، دوستوں، واقفوں، ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں سے محبت اور خلوص سے ملتے تھے۔ کبھی بحث میں نہ پڑتے۔ سب کی سُنتے مگر اپنی کا اظہار بھی کر دیتے اور سچ بات کہنے سے کبھی نہ ہچکچاتے۔

(۵)

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے، مگر مولانا کی ذات اس عیب سے بری تھی۔ محمد حسین آزاد، مولانا شبلی وغیرہ کی کتابوں پر بہت اچھے تبصرے لکھے اور تعریف کی۔ جو بات بھی اس کی دل کھول کے تعریف کی۔ کہیں کوئی خامی نظر آئی تو صرف لطیف پیرائے میں اشارہ کر دیا۔

وہ اپنے کلام یا اپنی تالیف کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ایسا موقع آ پڑتا اور کچھ کہنا ہی پڑتا تو بادل ناخواستہ دو ایک جملے کہہ دیتے۔ اگر کوئی ان کے کلام کی تعریف کرتا تو بڑی خوبی سے ٹال دیتے یا کوئی ایسا ذکر چھیڑ دیتے کہ کہنے والے کی توجہ دوسری طرف ہو جاتی۔ ایک صاحب نے اُن کی مسدس کی تعریف کرنی شروع کی۔ میں بھی اُس وقت موجود تھا۔ مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ اُسے نہیں مانتے۔

وہ صاحب میری طرف متوجہ ہو گئے اور لگے مجھ سے بحث کرنے!

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت عبدالحق کے مضمون دو حالی کی سیرت " سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں عبدالحق حالی کی سیرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

تشریح:۔ ایک ہی عہد کے لوگوں خصوصاً ہم مرتبہ لوگوں میں رقابت یا مخالفت کا ہونا کوئی نئی بات نہیں لیکن حالی کی ذات اس عمومی خامی سے پاک تھی۔ آزاد، شبلی وغیرہ کی کتابوں پر بڑے اچھے تبصرے کئے اور ان کی بہت تعریفیں کیں۔ ہر اچھی بات کی دل کھول کر تعریف کی لیکن اگر کہیں کوئی کمزوری دکھائی دی تو اس کا اظہار باریک سے اشارے میں کر دیا ــ وہ اپنے کلام یا اپنی کسی کتاب کا کبھی تذکرہ نہ کرتے۔ اگر کبھی ایسا موقع آ جاتا کہ کچھ کہنا ضروری ہو جاتا تو بددلی سے ایک دو فقرے بول دیتے۔ اگر کوئی ان کی شاعری کی تعریف کرتا تو بڑی خوبصورتی سے ٹال جاتے یا کوئی بات چھیڑ کے مخاطب کی توجہ دوسری طرف لگا دے۔ ایک صاحب نے میری موجودگی میں ان کی مسدس کی تعریف کرنی شروع کی تو انہوں نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ تو نہیں مانتے ــ اب اس شخص نے میری طرف دھیان کر لیا اور لگا مجھ سے بحث کرنے جیسے میں واقعی مسدس کو تسلیم نہیں کرتا۔

(۶)

مولانا حالی ہماری تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔

ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کئے بغیر مانتے ہی نہیں تھے، اُن کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔

حوالۂ متن:- یہ عبارت "حالی کی سیرت"، (عبدالحق) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:- اس مضمون میں عبدالحق نے حالی کی سیرت کے خاص خاص پہلو بیان کئے ہیں۔

تشریح:- حالی ہماری تہذیب کا ایسا نمونہ تھے جس کی مثال ہی نہیں مل سکتی۔ شرافت اور نیک طبعی کا یہ حال تھا کہ ان سے زیادہ شریف اور نیک طبع انسان مل ہی نہیں سکتا۔ ان کے چہرے ہی سے شرافت، ہمدردی اور پیار اس طرح جھلکتے تھے کہ انسان کا دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچ جاتا تھا۔ ان کی صحبت میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شے انجانے طور پر ہم پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص بچ کے نکل جاتا اور ان کی صحبت سے پرہیز کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے اچھے سلوک اور محبت کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ جو لوگ حد درجہ بے جا تنقید کرنے کے شوقین تھے اور دوسروں کے عیب گنوانے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ ہی نہ تھا، جب ان کے پاس آتے اپنی زہرناکی بھول جاتے اور شرافت کا مظاہرہ کرتے۔

(۷)

ہمیں حالی کی زندگی سے کئی بیش بہا سبق ملتے ہیں۔ سب سے پہلی بات صحیح ذوق ہے جو ادب کی جان ہے۔ نہ صرف ادب کی، بلکہ انسانی تمدن کی جان ہے۔ حالی نے تمام عمر صحیح ذوق کی تعلیم و تلقین کی۔ دوسرے جس کام کو لیا اسے اس شغف اور انہماک سے انجام دیا گویا ان کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ وہ صاحب ثروت نہ تھے، وہ لیڈر نہ تھے، وہ غریب شخص تھے۔ ان کے وسائل و ذرائع بہت محدود تھے، تاہم انہوں نے تنہا خاموشی سے وہ کام کیا جو انجمنیں اور ادارے بلکہ حکومتیں بھی انجام نہیں دے سکتیں۔ تیسرے انہوں نے اپنی ہمدردی اور خلوص و صداقت سے انسانیت کی مثال پیش کی۔

جو لوگ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں وہ ان کے کلام کو دیکھیں۔ اور جو سادگی و عالی خیالی، اعتدال و ضبط، دردِ دل اور خلوص، رواداری

وبے نفسی کی مثال دیکھنا چاہیں تو وہ مولانا کی زندگی کا مطالعہ فرمائیں۔ غالباً ہمیں آج کل ایسے بزرگوں کی سیرت کے مطالعے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت عبدالحق کے مضمون "حالی کی سیرت" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں عبدالحق نے حالی کی سیرت کے خاص خاص پہلو محبت اور احترام کے پیرائے میں بیان کئے ہیں۔

تشریح:۔ ہمیں حالی کی زندگی سے بڑے قیمتی سبق ملتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو صحیح ذوق کی ہے جسے نہ صرف ادب کی بلکہ انسانی تہذیب کی بھی جان کہہ سکتے ہیں۔ حالی نے ساری عمر صحیح ذوق کو عام کرنے کی سعی کی اور اس کی تعلیم دی۔ دوسرے انہوں نے جو کام اپنے ذمے لیا اسے پوری دلچسپی اور توجہ کے ساتھ انجام دیا، یوں جیسے ان کی زندگی کا انحصار ہی اسی پر ہو — نہ وہ امیر تھے، نہ لیڈر تھے، بلکہ ایک غریب انسان تھے، ان کے وسائل اور ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے — پھر بھی انہوں نے نہائیت خاموشی سے وہ کام انجام دیئے جو بڑی بڑی انجمنیں اور ادارے بلکہ حکومت بھی نہیں کر سکتی۔ تیسرے انہوں نے ذاتی ہمدردی، خلوص اور سچائی کے ذریعے بنی نوع انسان کو انسانیت کا عملی نمونہ فراہم کیا۔

جو لوگ ادب برائے زندگی کے اصول کے ماننے والے ہیں انہیں چاہیئے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کریں اور جنہیں سادگی، روشن خیالی، توازن، ضبط، ہمدردی، خلوص، برداشت، بے غرضی کی زندہ مثال دیکھنی ہو وہ حالی کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ آج شائید پہلے سے کہیں زیادہ ایسے بزرگ لوگوں کی سیرت کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

فرحت اللہ بیگ

سوانحی خاکہ

مرزا فرحت اللہ بیگ ستمبر ۱۸۸۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد بدخشاں سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے دادا کو اکبر شاہ ثانی نے دربار میں اپنا با اختیار نمائندہ مقرر کیا۔ یوں آپ کا خاندان دہلی کے معزز اور اہم خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے گورنمنٹ ہائی سکول سے حاصل کی جبکہ ۱۹۰۷ء میں سینٹ سٹیفنز کالج سے بی۔ اے کیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے مولوی نذیر احمد سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے۔ عملی زندگی کا آغاز ۱۹۰۷ء میں چادر ہائی سکول میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کیا۔ لیکن جلد ہی درس و تدریس کا پیشہ ترک کر دیا اور ۱۹۰۸ء میں ہائی کورٹ میں مترجم ہو گئے۔ ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد میں فوت ہوئے۔

آپ کی شہرت آپ کے مضامین کی وجہ سے ہے جن میں خاص قسم کی شوخی و ظرافت اور شگفتہ مزاجی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض مضامین تو اردو ادب میں یادگار حیثیت کے حامل ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے اندازِ تحریر کی خصوصیات

۱۔ ظرافت ظرافت و شگفتگی فرحت اللہ بیگ کی تحریر کا خاصا ہے۔ بات بات میں مزاح پیدا کرنا ان کا وصفِ خاص ہے۔ بات بات میں مزاح اور شگفتگی پیدا کرنا نذیر احمد کی شاگردی کے سبب اپنایا۔ ہلکے پھلکے مضامین ہی میں

نہیں، ان کے تنقیدی مضامین بھی مزاح اور شگفتگی سے خالی نہیں۔

۲- سنجیدگی اور ظرافت کا امتزاج مقصد کے اعتبار سے فرحت اللہ بیگ سنجیدہ ہیں، انداز بیان شگفتہ اور ظریفانہ ہے۔ گویا ان کے ہاں سنجیدگی اور ظرافت کا دلپذیر امتزاج ملتا ہے جس کے باعث ان کی تحریر لطیف اور اثر آفریں ہے۔

۳- زبان کی خوبی فرحت اللہ بیگ نے مستند اور ٹکسالی زبان میں لکھا ہے۔ اسی لئے ان کی زبان میں ایک مخصوص چٹخارا اور خاص چاشنی ہے جس کے باعث قاری ان کی تحریر کا مطالعہ کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہے۔

۴- محاورات کا استعمال فرحت اللہ بیگ اپنی تحریر میں جگہ جگہ محاورات کا استعمال بھی کرتے ہیں مگر ضروری مواقع پر انہوں نے بے موقعہ محاورات کا استعمال نہیں کیا۔

۵- ترکیب سازی فرحت اللہ بیگ نئی نئی تراکیب خود وضع کرتے اور انہیں اپنی تحریر میں استعمال کرتے ہیں — یوں انہوں نے اُردو نثر کو ارادی کوششوں سے خوبصورت بنایا اور تراکیب کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔

۶- مشرقیت وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و ثقافت کے شیفتہ تھے۔ چنانچہ ان کے مضامین "پھول والوں کی سیر"، "دلی کا یادگار مشاعرہ" "نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر" اور "ایک وصیت کی تعمیل" مشرقیت سے ان کی محبت کی مظہر ہیں۔

۷- قدامت پسندی مرزا فرحت اللہ بیگ جدت پسند ہونے کے ساتھ قدیم افراد، مقامات اور اشیاء سے محبت کرتے تھے۔ مولوی نذیر احمد، وحید الدین سلیم، عظمت اللہ خاں اور دوسری شخصیات کے خاکے بھی ان کی قدامت پسندی کی دلیل ہیں اور "دلی کا یادگار مشاعرہ" اور دوسرے کئی مضامین بھی۔

۸۔ منظر نگاری ان کی تحریر میں منظر نگاری بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں شخصیات، واقعات اور اشیاء کی صحیح منظر کشی کی ہے۔

۹۔ وضاحتی انداز مرزا فرحت اللہ بیگ بات اشاروں میں نہیں کرتے، بلکہ ہر بات کھول کر اور پوری وضاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں بات افراد کی ہو یا اشیاء کی، مقامات کی ہو یا شخصیات کی ان کی ساری تفصیلات ضرور بیان ہوں گی۔

۱۰۔ اصلاحی مقاصد مرزا کے پیشِ نظر نرا مزاح ہی نہیں تھا، وہ معاشرت کی اصلاح بھی کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنی تحریروں کے حوالے سے وہ اصلاحِ معاشرہ کے مقصد میں کامیاب ہیں۔

خلاصہ:

ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی

مولوی نذیر احمد اپنے قوت بازو پر بھروسہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی میں جو کچھ بھی حاصل کیا سراسر اپنی محنت کے بل بوتے پر بغیر کسی سفارش یا خوشامد کے۔ وہ اپنے آپ کو SELF-MADE MAN کہتے تھے۔ وہ نہ صرف خود کو بلکہ دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے۔ بیٹا جو کچھ کرنا چاہو خود کرو اپنے باپ دادا کی ہڈیوں کے لیے بھیک نہ مانگتے پھرو۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ غریب گھرانوں کی اولاد اپنے آباؤ اجداد کی مفلسی کو چھپا کر خود کو اعلیٰ خاندان کا فرد بتاتی ہے۔ لیکن نذیر احمد اپنے آباؤ کا نقشہ اصلی رنگ میں دکھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ انہیں اپنی ابتدائی غربت پر فخر تھا۔ مولوی صاحب کا رنگ سانولا، قد اور کپ اور جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ موٹاپے کی وجہ سے قد ٹھگنا محسوس ہوتا تھا اس کو چھپانے کے لیے ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ کمر چوڑی، سر بڑا، اور چھدری ڈاڑھی تھی۔

مولانا کے گھر اور باہر کے لباس میں بہت فرق تھا۔ گھر میں محض بنیان اور تہبند پہنے ہوتے اور گھر سے باہر جاتے تو مکمل اور صاف ستھرا لباس یعنی صاف شفاف سفید اچکن، کشمیری کام کا جبہ، سر پر ترکی ٹوپی یا سفید عمامہ زیب تن کیے ہوتے۔ ان کا بیشتر وقت پڑھنے پڑھانے میں گزرتا۔ لوگوں سے ملاقات کے لیے ٹاؤن ہال کی لائبریری میں جا کر بیٹھتے ان کے گھر میں ملاقات کے لیے صرف ان کے شاگرد آتے تھے۔

مولوی صاحب خوش خوراک بھی تھے اور موسم کے پھل اور میوے شوق سے کھاتے تھے۔ لیکن کسی کو شریک طعام نہ کرتے تھے۔ وہ ترجمہ بہت اچھا کرتے تھے اور اس پر انہیں ناز تھا لیکن وہ سب سے زیادہ تعریف (اپنے) قرآن مجید کے ترجمے کی کرتے۔ دانی نے ان سے ہدیہ کے عوض کل شریف لی۔ لیکن میں نے ان سے بہت سی کتابیں مفت حاصل کیں۔ ہر دفعہ کہتے جاؤ اس دفعہ قیمت معاف کی لیکن آئندہ میری کتاب کو ہاتھ مت لگانا۔

اس کے بعد حیدرآباد چلا گیا۔ دوسری مرتبہ میری مولوی صاحب سے دلی میں ملاقات ہوئی۔ لیکن دوسری بار ان کی صحت ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ حیدرآباد آنے کے چند دنوں بعد معلوم ہوا مولوی صاحب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

فرہنگ

صفحہ نمبر ۱۹۰:- ابتداً۔ شروع میں ؛ الم نشرح۔ بالکل واضح، صاف ظاہر ؛ معروف۔ جانا پہچانا ؛ منصۂ شہود پر آئے۔ ظاہر ہوئے ؛ شائع ہوتا ؛ طرفگی۔ عجیب ہونا، دلچسپی ؛

صفحہ نمبر ۱۹۱:- بے باکی۔ جرأت ؛ تبراقی۔ تیزی، چالاکی ؛ ظرافت۔ مزاح ؛ اپنے بل بوتے پر۔ اپنے سہارے، اپنی طاقت سے، کسی دوسرے کے سہارے کے بغیر ؛ وجاہت۔ شان ؛ بے یاری و بے مددگاری۔ بے چارگی ؛ مانع ترقی۔ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ؛ نااہل۔ نالائق ؛

صفحہ نمبر ۱۹۲:- محو ہو جانا۔ مٹ جانا ؛ آباؤ اجداد۔ باپ دادا ؛ گدرا۔ بھرا ہوا، پکا ؛ تکملہ۔ مکمل کرنے والی چیز، تکمیل ؛ چھدری۔ کھلی کھلی ؛ فرق فرق سے

- فاصلے فاصلے سے ۔ استغنا - بے نیازی، لاپرواہی ۔

صفحہ نمبر ۹۳ :- بے اعتنائی - لاپرواہی ۔ کنٹرٹپ - بڑی سی ٹوپی جس سے کان بھی چھپ جائیں اور سردی سے بچاؤ بھی رہے ۔ مرزئی - جیکٹ ۔ شریکِ طعام ہونا - کھانے میں شریک ہونا ۔

صفحہ نمبر ۹۴ :- اینٹھنا - ہتھیا لینا ، ٹھگ لینا ۔ حجت کرنا - تکرار کرنا - بحث کرنا ۔

صفحہ نمبر ۹۵ :- بے تکی باتیں - فضول باتیں ۔ گلشنِ دنیا سے کوچ کیا - فوت ہو گئے ۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

انسان فطرت سے مجبور ہے - جب دنیا کی نظریں اُس پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ ہمیشہ اپنی پہلی حالت کی کمزوریوں کو چھپاتا اور خوبیوں کو دکھاتا ہے ۔ جس طرح بڑے بڑے گھرانوں کی نااہل اولاد اپنے باپ دادا کے نام سے اپنی نالائقی چھپاتی ہے - اسی طرح غریب گھرانوں کی لائق اولاد چاہتی ہے کہ اُن کے باپ دادا کے نام لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں - یہ ہے ہماری اخلاقی کمزوری اور یہ ہے ہماری اسلامی سبق سے بے خبری ۔

حوالۂ متن :- یہ عبارت مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" سے لی گئی ہے ۔

سیاق و سباق :- اس مضمون میں مرزا ، نذیر احمد کی زندگی کے حالات اور ان کی صفات بیان کرتے ہیں ۔

تشریح :- یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ جب دنیا کی نظریں کسی انسان پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ اپنی پہلی کمزوریوں کو چھپاتا ہے اور اپنی اچھائیوں کو نمایاں کرتا ہے - بڑے بڑے گھروں کی نالائق اور نااہل اولاد اپنی نالائقی اور نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنے

آباءواجداد کا نام استعمال کرتے ہیں اور "پدرم سلطان بود" کے مصداق باپ دادا کے نام سے اپنے نام کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح بڑے گھروں کی نالائق اولاد کا یہ رویّہ ہوتا ہے، اسی طرح غریب گھرانوں کی اولاد جب ترقی کر جاتی ہے تو بالعموم اپنے باپ دادا کا نام چھپاتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ان کے باپ دادا غریب تھے۔ وہ تو اس کے برعکس ہی تاثر دینا پسند کریں گے کہ انہوں نے غریبی کبھی دیکھی ہی نہیں۔ یہ بہت پست اخلاق کی نشانی اور اسلامی اصولوں سے لاعلمی کی علامت ہے۔

(۲)

گھر میں اس لباس سے استغنا کے کئی باعث تھے۔ اوّل تو یہ بات تھی کہ اُن کو اپنے کاموں ہی سے فرصت نہ تھی، پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں ان کا سارا دن گزر جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت کم لوگوں سے مکان پر ملتے تھے۔ جس کو ملنا ہوتا تھا شام ٹاؤن ہال کی لائبریری میں اُن سے جا کر مل آتا تھا۔ جو لوگ مکان پر آتے تھے وہ یا تو اُن کے شاگرد ہوتے تھے یا خود صاحب کمال — اور ظاہر ہے کہ ایسے صاحب کمال لوگ ظاہری حالت کو نہیں دیکھتے، یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب ہیں کتنے پانی میں۔ لباس سے بے اعتنائی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی یا کم سے کم اُن کا کنٹوپ، مرزئی یا سرہانے کے تکیے کا غلاف تو بدل دیا کرتی — گھر میں تھا کون ایک مولوی صاحب، دوسرا اُن کا نوکر۔ وہ بھی ایسا بے پرواہ کہ خدا کی پناہ۔ ظالم نے بہرہ بن کر کام سے اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا —

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مرزا نے نذیر احمد کی زندگی کے حالات اور ان کی صفات کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ گھر میں ان کے لباس کے بارے میں لاپروائی کا

تجزیہ کرتے ہیں۔

تشریح:۔ گھر میں لباس کے معاملے میں نذیر احمد کی بے نیازی کے کئی اسباب تھے۔ ایک سبب تو یہ بھی تھا کہ انہیں اپنے کاموں ہی سے فراغت نصیب نہ ہوتی تھی، ان کا سارا دن پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں گزر جاتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے گھر پر بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ جسے بھی ملنا ہوتا تھا وہ شام کو ٹاؤن ہال لائبریری میں ان سے مل لیتا تھا۔ گھر پہ تو صرف ان کے شاگرد آتے تھے یا اہلِ کمال لوگ اور صاف ظاہر ہے کہ جو واقعی اہلِ کمال ہیں وہ تو انسان کی ظاہری شکل و صورت کو نہیں دیکھتے، انہیں انسان کی ظاہری حالت سے کوئی غرض نہیں ہوتی، وہ صرف مولوی صاحب کے کمالات ہی دیکھتے تھے۔ تاہم لباس سے بے نیازی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی جو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھے یا کم از کم ان کی ٹوپی، واسکٹ یا تکیے کا غلاف ہی بدل دیا کرتی — گھر میں تو صرف مولوی صاحب ہی تھے، یا ان کا ایک نوکر — اور وہ نوکر بھی ایسا لاپروا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ اس ظالم نے بہرا بن کر کام کاج سے جان چھڑالی تھی کہ جو کام نہ کرنا چاہا، ظاہر کیا کہ سُنا ہی نہیں۔

(۳)

مولوی صاحب نے کئی مرتبہ اس عاجز پر بھی رقمی حملے کیے لیکن یہ ذرا ٹیڑھا مقابلہ تھا۔ ایک چھوڑ کئی کتابیں مولوی صاحب سے اینٹھیں، کبھی ایک پیسہ نہ دیا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ وعدہ کرتا اور رقم نہ دیتا۔ میں اُس وقت تک کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک مولوی صاحب خود نہ فرما دیتے کہ اچھا بھئی تو یوں ہی لے جا مگر میرا پیچھا چھوڑ — میری ترکیب یہ تھی کہ پہلے کتاب پہ قبضہ کرتا۔ مولوی صاحب قیمت مانگتے۔ میں حجت کرتا۔ وہ جواب دیتے۔ میں اس کا جواب دیتا۔ غرض بہت کچھ جھک جھک کے بعد تھک کر کہتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کی۔ آئندہ میری کسی کتاب کو ہاتھ لگایا تو اچھا نہ ہوگا۔

حوالۂ متن:۔ یہ عبارت مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق:۔ اس مضمون میں مرزا مولوی صاحب کی عادات و اطوار کا تفصیل سے ذکر کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان کی اس عادت کا ذکر بھی کیا کہ وہ اپنے شاگردوں اور ملنے والوں سے کتابوں کی قیمت لے لیا کرتے تھے۔

تشریح:۔ مولوی صاحب نے کئی بار مجھ پر رقم ہتھیانے کی خاطر وار کئے مگر یہاں ٹیڑھا معاملہ تھا اور مقابلہ سخت تھا۔ میں نے ایک نہیں کئی کتابیں مولوی صاحب سے ہتھیا لیں مگر ایک پیسہ تک ادا نہ کیا۔ میں یہ بھی نہیں کرتا تھا کہ کتاب لے لی اور رقم بعد میں ادا کرنے کا وعدہ کر دیا اور پھر یہ وعدہ پورا نہ کیا۔ میں نے کبھی بہانہ بازی نہیں کی، میں تو اس وقت ان سے کتاب لیتا ہی نہ تھا جب تک وہ خود نہ کہہ دیں کہ "جاؤ، کتاب لے جاؤ، میری جان چھوڑو"۔ میرا طریقۂ واردات یہ تھا کہ پہلے کتاب پر قبضہ جما لیتا۔ پھر جب مولوی صاحب قیمت طلب کرتے تو تکرار کرتا۔ وہ اس کا جواب دیتے، میں اور کوئی دلیل دے دیتا۔ غرض تھک ہار کر کہہ دیتے کہ جاؤ میں نے قیمت معاف کر دی مگر آئندہ کسی کتاب کو ہاتھ بھی لگا تو اچھا نہ ہو گا۔

فرحت اللہ بیگ کی شخصیّت نگاری

فرحت اللہ بیگ کا نام ایک مزاح نگار کی حیثیت سے اس قدر نمایاں ہو گیا ہے (اور اس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ وہ ایسے بلند پایہ مزاح نگار ہیں جن کے پائے تک پہنچنا ایک کٹھن مرحلہ ہے جو شاید ہی کوئی مزاح نگار سر کر سکے) کہ ان کی شخصیّت نگاری کی طرف توجہ کم ہی دی گئی ہے حالانکہ وہ بڑے کامیاب شخصیّت نگار تھے ——— خود فرحت اللہ بیگ کے ان الفاظ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ شخصیّت نگاری اتفاقیہ نہیں ہوئی بلکہ ان کے مقاصد کا ایک جزو تھی:۔

"مضامین لکھنے میں میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک تو پرانے واقعات تحریر میں آجائیں جو بزرگوں کی زبانی مجھ تک پہنچے تاکہ کچھ دن بعد نیست و نابود نہ ہو جائیں، دوسرے

یہ کہ ان اہلِ قلم کے واقعات قلم بند ہو جائیں جنہوں نے زبانِ اُردو کی اصلاح میں اپنی عمریں صرف کر دیں۔ —— تیسرے اُردو زبان میں خوش مذاقی کے ذریعہ اصلاحِ معاشرت کا پرچار کیا جائے۔ ——

گویا شخصیت نگاری ان کے پیشِ نظر تھی اور اس ضمن میں ان کے پیشِ نظر ایسے اہلِ قلم تھے جنہوں نے اُردو زبان کی خدمت کی۔ چنانچہ "نذیر احمد کی کہانی" اور "دلی کا یادگار مشاعرہ"، پڑھتے ہوئے مصنف کے دعوے کی تائید حاصل ہوتی ہے کہ کس طرح اس نے وہ واقعات محفوظ کر لئے جن کے نیست و نابود ہونے کا خدشہ تھا۔ اور کس طرح اہلِ قلم کے حالات و واقعات اور اس کے ساتھ ہی ان کی قلمی تصویریں بھی محفوظ کر لیں۔

کسی بھی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہوئے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ کسی بھی طرح کی رو رعایت رکھے بغیر زیرِ نظر شخصیت کی تصویر کشی ہو جائے مگر بنیادی رویہ مزاح کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی کا ہے۔ چنانچہ اپنے مخصوص لہجے میں ایسے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ جب کمزور پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں تضحیک کا پہلو نہیں نکلتا بلکہ وہ کمزوریاں بھی ایک ہمدرد اور مخلص شخص کی بیان کردہ لگتی ہیں۔

کرداروں کا نقشہ ایسے انداز میں کھینچتے ہیں کہ ان میں جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے تصویر کشی کی اس مہارت کا اندازہ ہمیں "نذیر احمد کی کہانی"، سے بخوبی ہوتا ہے جس میں اپنے مخصوص دلچسپ پیرائے میں وہ اپنے استادِ محترم کی باغ و بہار شخصیت کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ نذیر احمد کا یہ تعارف شاید بیسیوں مضامین پر بھی بھاری ہو کہ اس میں ان کی تمام خوبیاں بھی آ گئی ہیں اور ان کے کمزور پہلو بھی آ گئے ہیں جن کا ذکر ایسے لہجے میں کیا گیا ہے جس میں محبت اور ہمدردی ہے۔ کہیں بھی احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ جگہ جگہ ہنسنے اور ہنسانے کا سامان فراہم کیا ہے مگر ادب و احترام بھی ملحوظ رکھا ہے۔

اسی طرح "دلی کا یادگار مشاعرہ"، میں انہوں نے شاعروں کی جو قلمی تصویریں پیش کی ہیں۔ وہ ہر شاعر پر الگ الگ مضمون پڑھے بغیر بھی اس سے متعارف کرا دیتی ہیں اور ان کی شخصیت اور فن سے آشنا کر دیتی ہے —— اور —— بقول ان کے

اپنے ان شخصیتوں کے واقعات بھی قلم بند ہو گئے ہیں کہ نیست و نابود ہونے سے بچ جائیں۔

انہوں نے صرف ان شخصیات پر لکھا جنہیں انہوں نے نہ صرف ادبی حوالے سے اہم سمجھا بلکہ جن سے متاثر بھی تھے اور جن کا احترام بھی کرتے تھے۔ اس لئے ان شخصیات کے خاکے بھرپور اور جاندار ہیں جن میں ان کے مخصوص اندازِ تحریر نے دلچسپی اور چاشنی پیدا کر دی ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ کا شمار اُردو کے صاحبِ طرز مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جن کی وجہ شہرت ان کے مزاحیہ مضمون ہیں جن کے بارے میں غلام احمد فرقت کاکوروی لکھتے ہیں —— "فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی پطرس اور رشید احمد صدیقی کی طرح ان طنز نگاروں میں ہیں جن کے پاس لہجہ ہے جس نے ان کی تحریروں میں انفرادیت پیدا کر دی ہے —— فرحت کے یہاں آپ کو قہقہے اور تمسخر قسم کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کا قلم طنز کی راہوں کو سنجیدگی اور متانت کی روشنی میں طے کرتا ہے —— ان کی تحریروں سے ان کے مشاہدے کی وسعت اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے وہ اپنی تحریر میں شستہ اور شائستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں —— اور —— ان کی ظرافت میں ایک مقصد ہوتا ہے"۔

وہ براہِ راست نذیر احمد کے شاگرد رہے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان کی لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی کا اثر بھی مرزا کی طبیعت نے قبول کیا ہو گا۔ نذیر احمد خود مرزا کی شوخیٔ طبع اور بذلہ سنجی کے معترف ہیں جس کا اظہار انہوں نے ان کی شاگردی کے زمانے میں ہی کر دیا —— انہوں نے نذیر احمد سے بھی بڑھ کر اُردو کے مستند محاورے اور ٹکسالی کے روزمرّہ کا استعمال کیا اور زیادہ بے تکلفی سے کیا۔ چنانچہ ان کی ادبی نثر میں ادبی نثر کی شان بھی ہے اور باتوں کا مزہ بھی —— انہیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہے اور روانی اور بے تکلفی سے لکھتے چلے جاتے ہیں جن میں محاورات اور ضرب الامثال بھی شامل ہوتی جاتی ہیں مگر تحریر ان سے بوجھل نہیں ہونے پاتی۔

فرحت اللہ بیگ کے مزاح کی تمام تر بنیاد ان کے شگفتہ اسلوب پر ہے۔ یہی ان کا سٹائل

ہے جس نے انہیں خالص مزاح نگار بنایا۔ ان کے مزاح میں طنز بھی آتی ہے مگر اس میں زہرناکی نہیں ہوتی۔ بلکہ طنز بھی لطف دیتی ہے — انہوں نے اس مخصوص لہجے یا سٹائل کو ماضی کے — واقعات رقم کرتے ہوئے بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ورنہ ایسی تحریریں محض تاریخ بن کر رہ جاتیں۔

فرحت اللہ بیگ نے مزاح کے لئے کوئی اوچھا حربہ استعمال نہیں کیا بلکہ صرف اپنے اسلوب کا ہی سہارا لیا ہے۔ اسلوب کے ذریعے پیدا کیا جانے والا مزاح خالص ادبی مزاح ہوتا ہے مگر ایسا کرنا بڑا کٹھن کام ہے جو ہر کسی مزاح نگار کے بس کا روگ نہیں ہے۔ مرزا نے صاف ستھری زبان استعمال کی، مزاح کا استعمال حتیٰ کہ طنز تک کا استعمال نہایت سلیقے سے کیا اور کسی بھی طرح کے مضحک واقعات یا رکیک جملے استعمال کرنے سے گریز کیا جس سے مزاح کا ایک معیار آخر تک قائم کرنے میں کامیاب رہے — دراصل سٹائل کی ظرافت ہی مرزا کا فن ہے اور یہی ان کی مزاح نگاری کی کامیابی کا راز ہے۔ لیکن کہیں انہوں نے اس سے انحراف کیا اور سٹائل یا اسلوب کی بجائے واقعات کا سہارا لے کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے (مثلاً نئی پرانی تہذیب کی ٹکر، غلام، مردہ بدست زندہ") مگر ان کے وہ مضامین دوسرے مضامین کی طرح کامیاب نہیں —

رشید احمد صدیقی

حسرت موہانی ــــــ محشرِ عمل

سوانحی خاکہ

ملاحظہ کیجئے صفحہ ۹۶

اندازِ تحریر کی خوبیاں

ملاحظہ کیجئے صفحہ ۹۶

حسرت موہانی

حسرت موہانی جتنے بڑے انسان تھے۔ اتنے ہی سادہ لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ معمولی سے لباس کے ساتھ وہ ہر کہیں جاتے، جلسوں میں، پارلیمنٹ میں غرضیکہ ہر جگہ ان کا ایک ہی لباس ہوتا تھا۔ اسی حلیے کے ساتھ وہ ہر کہیں بدرنگ سا تھیلا، میلا سا بستہ، ٹرنک اور تا ٹ لیے سفر کرتے۔ ان کا سفر کرنے کا انداز ہی فقیرانہ تھا۔ ہمیشہ تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور چاہے سرکاری کام کے لیے سفر کرتے، کرایہ یا تو لیتے ہی نہ تھے۔ اور لیتے تھے تو تھرڈ کلاس کا حالانکہ ان کے مقام اور رتبے کے لحاظ سے وہ فرسٹ کلاس کے حقدار تھے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس میں پیدل چل کر جاتے اور پر تکلف دعوتوں میں بھی جہاں لوگ زرق برق لباس میں ملبوس ہوتے وہ اپنے قلندرانہ لباس میں عجب شانِ بے نیازی سے چلے جاتے اور کسی کی پرواہ نہ کرتے۔ اسی عالم میں وہ تمام لوگوں کی توجہ اور احترام کا مرکز بنے ہوتے۔

وہ بلا کے حق گو تھے۔ نڈر اس قدر کہ کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ انگریزوں سے تو انہوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی ٹکر لے لی تھی۔ اس مخالفت کی پاداش میں کالج سے

نکالے گئے تھے - انہوں نے کالج سے نکالے جانے کے بعد کپڑے کی دکان کھول لی۔ غالب کے دیوان پر حاشیہ لکھا اور "اردوئے معلیٰ" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیئے - وہ اس قدر بے باک، اتنے بلند کردار، اتنے سچے اور محبت کرنے والے تھے کہ ان سے لوگ بہت کم یاب ہیں۔ شاذونادر ہی ایسی ہستیاں ہوتی ہیں کہ لگ بھگ نصف صدی تک آزمائشوں سے گزرے ہوں اور ہر قدم پر ثابت قدم رہے ہوں اور ان کے دامن پر کہیں بھی کوئی دھبہ نہ لگا ہو - وہ انتہا درجے کے جفاکش اور خداترس انسان تھے - وہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ شاعری میں ان کو غزل کا امام کہہ سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی نازگی اور ترنم کے علاوہ ایک عمدہ توازن ملتا ہے - حسرت موہانی جیسا شاعر اور سیاستدان ہوتے ہوئے بھی حد درجہ شریف النفس اور درویش صفت کوئی کیا ہوگا - وہ صحیح معنوں میں محشر خیال تھے۔

فرہنگ

صفحہ ۹۶ - تحسین: تعریف کرنا۔ تکریم: عزت کرنا۔ شُستہ: دُھلا ہوا، صاف - پرکاری: مضبوطی - اصرار: ضد، بضد رہنا - چھدری: کھری کھری۔

صفحہ ۹۷ - ملگجی: مٹیالا، غبار آلودہ۔ ملوث: ڈونگا۔ ٹین کا لوٹا۔ نباض: نبض شناس تضاد: الٹ - سودیشی: دیسی - اکتفا کرنا: کافی سمجھنا - عزیمت: عزم، ارادہ - کھرے: کھُردرے - مشاہیر: مشہور لوگ۔

صفحہ ۹۸ - فارغ التحصیل ہوکر: تعلیم کا سلسلہ مکمل کر کے - عقوبتیں: تکلیفیں - آلام: مصیبتیں - آشوب: فتنہ فساد - وثوق تکلیفیں۔

صفحہ ۹۹ - جانبر ہونا: بچ جانا - بشرے: چہرے - شمہ: تھوڑی مقدار - ردوقدح: بحث، تکرار - کشادہ، کھلا - پُرفضا: کھلا - دید و باز دید: میل ملاقات بے۔ گ: بغیر کسی لحاظ کے - اعیان: امراء، وزراء - اکابر: بڑے لوگ - جاہ و حشم: شان و شوکت - صاحبانِ ثروت: امیر لوگ۔

صفحہ ۱۰۰ تحت اللفظ پڑھنا: لفظوں کے ساتھ ساتھ پڑھنا یعنی کلام کو بغیر ترنم کے پڑھنا۔ تلبل تھوڑی۔ بال: بزرگ اقبال - رزم: میدانِ جنگ۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

۱) لیکن کس قیامت کا یہ آدمی تھا۔ محشر خیال نہیں، محشر عمل! جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا، اُس کو بغیر مصلحت یا موقع کا انتظار کئے، بے ساختہ زبان میں، بغیر پلک جھپکائے، مخاطب افلاطون ہو یا فرعون، اس کے سامنے کہہ ڈالنا حسرت کے لیے معمولی بات تھی ____

ایسا نڈر، سچا، محبت کرنے والا اور محبت کا گیت گانے والا، اب کہاں سے آئے گا۔ کسی سے نہ دبنے والا، ہر شخص پر شفقت کرنے والا، زبان کا نبّاض، شاعروں کا والی غزل کا امام، ادب کا خدمت گزار ____ کیسی سچی بات ایک عزیز نے کہی کہ سیاست کوئلے کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ اور بہتوں کا منہ کالا ہوتا ہے، سوائے حسرت کے!

حوالۂ متن یہ اقتباس رشید احمد صدیقی کے مضمون "حسرت موہانی ____ محشرِ عمل" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق مصنف اس مضمون میں حسرت موہانی کی شخصیت کی اہم خصوصیات بیان کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بعض ضروری واقعاتی حوالے بھی دے رہا ہے۔

تشریح حسرت موہانی قیامت کے انسان تھے ____ محض خیال کے اعتبار سے نہیں بلکہ عمل کے اعتبار سے، حسرت جس بات کو خود بُرا سمجھتے تھے، اسے بغیر کسی بھی طرح کی ہچکچاہٹ کے بغیر کسی کمی بیشی کے، بغیر بات کو کوئی نرم لہجہ عطا کئے۔ بغیر کسی مصلحت کوشی کا شکار ہوئے، بغیر کسی خاص موقعہ کا انتظار کیے۔ پلک جھپکائے بغیر پوری بے ساختگی سے کہہ دیتے تھے چاہے ان کا مخاطب کوئی فرعون سا متکبر انسان ہو یا افلاطون جیسا دانا فلسفی ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے مگر حسرت کے نزدیک ایک معمولی بات تھی ____

ایسا بے خوف محبت کرنے والا اور محبت کے گیت گانے والا شخص اب ہمیں کہاں سے ملے گا ____ وہ شخص کیا تھا ____ ایک انسان جو کسی سے نہیں دبتا تھا، ہر ایک سے پیار سے پیش آتا تھا۔ زبان کا نبض شناس تھا، مشاعروں کا سرپرست تھا، غزل کا رہنما سے درجے کا شاعر تھا۔ ادب کا خادم تھا ____ غرض وہ شخص سب کچھ تھا ____ ایک عزیز نے اس کے بارے میں کیسی سچی بات کہی کہ سیاست کوئلے کا روبار ہے۔ جس میں سب کے ہاتھ اور اکثر کے منہ سیاہ ہو جاتے ہیں لیکن حسرت اس کاروبار میں بھی محفوظ و مامون رہا۔

(۲) حسرت، علی گڑھ کالج کے بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ انگریز دشمنی میں نکالے گئے۔ علی گڑھ میں سودیشی کپڑے کی دکان کھول لی۔ دیوانِ غالب پر حاشیہ لکھا۔ اردوئے معلیٰ کی ایڈیٹری کرتے رہے اور ان مشغلوں سے جو کچھ روکھا پھیکا میسر آجاتا، اسی پر اکتفا کرتے اور دنیا کی تمام عیش کامرانی کو ٹھکرائے فریب فرعونیت پر گرجتے اور حسن و عشق کا راگ گاتے رہے۔ کسی صاحبِ دولت کا زہرہ نہ تھا کہ محبت و مسکنت کے اس بوریہ نشین اور عزیمت اور صداقت کے اس نقیب و ناخدا سے آنکھ ملا سکے۔ دیسی کھردے، مٹیلے کاغذ پر اردو کے مشاہیر، کم نصیب، گوشہ گیر اور تقریباً بھلائے ہوئے شعراء کے کلام کا انتخاب شائع اور اُن کی خدمات کو اُجاگر کرتے رہے۔

حوالہء متن | یہ اقتباس حسرت موہانی ــــ محشرِ عمل (رشید احمد صدیقی) سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق | مصنف اس مضمون میں مولانا حسرت موہانی کی سیرت بیان کر رہا ہے۔ وہ اس کی سیرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو بعض ضروری واقعات بھی بیان کرتا ہے۔

تشریح | حسرت موہانی علی گڑھ کالج کے بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ وہ انگریزوں کے بڑے دشمن تھے ــــ اسی "جرم" کے باعث کالج سے نکالے گئے تو علی گڑھ ہی میں دیسی کپڑے کی دکان شروع کر دی۔ دیوانِ غالب حاشیے تحریر کیے۔ "اردوئے معلیٰ" کی ادارت کرتے رہے اور ان معروفیات سے جو تھوڑا بہت میسر آجاتا اسی پر قناعت کر لیتے اور پھر دنیا کے آرام و آسائش کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر فریب اور تکبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اور محبت کے گیت گاتے ــــ کسی امیر ترین آدمی کو بھی ہمت نہیں پڑتی تھی اس محبت کرنے والے بوریہ نشین اور عزم و حق کے پرستار سے آنکھ ملا کر بات کر سکے ــــ وہ دیسی موٹے مٹیلے کاغذ پر اردو کے مشہور لوگوں، کم نصیب لوگوں اور گوشہ نشیں لوگوں کے دیوان مرتب بھی کرتے اور شائع بھی کرتے اور ان کی خدمات کو نمایاں کر کے پیش کرتے تاکہ نوجوان ان سے سبق سیکھیں۔

(۳) حسرت، ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے لیکن اُن کے اپنے اندازِ درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ ممبروں کی آرام دہ کشادہ اور پُر فضا قیام گاہ، نہ ٹیلی فون، نہ موٹر نہ تفریح، نہ دعوت، نہ دید و بازدید ــــ ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا۔ فرش پر آس پاس اخبارات، کاغذات اور فائلیں ــــ وقت آیا تو کسی دکان پر جا کر کھانا کھا لیا۔ کاغذات جھولے میں ڈالے، پارلیمنٹ پہنچ گئے۔ راستہ

اکثر پیدل ہی طے کرتے اور موقع جان پڑتا تو پارلیمنٹ میں ایسی ایسی دوٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ درو بام گونج اٹھتے۔

حوالۂ متن | یہ عبارت "حسرت موہانی ——— محشرِ عمل" (رشید احمد صدیقی) سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق | مصنف اس مضمون میں حسرت موہانی کی محشرِ عمل قرار دے کر ان کی سیرت کے اہم پہلوؤں پر بحث کرتا ہے اور بعض واقعات بھی رقم کرتا ہے۔

تشریح | حسرت ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن تھے مگر کوئی آرام دہ کھلا مکان حاصل کیا (جو ارکان کے لیے موجود ہوتے ہیں، خاص طور سے اہتمام نہیں کرنا پڑتا) نہ ٹیلی فون لگوایا (جو ارکانِ پارلیمنٹ کا استحقاق ہوتا ہے) نہ گاڑی لی، نہ کوئی تفریح کی، نہ کسی دعوت میں شریک ہوئے (حالانکہ پارلیمنٹ کے ارکان اکثر دعوتوں میں موجود ہوتے ہیں) ——— اور ——— نہ ہی میل ملاقات کے سلسلے قائم کئے ——— بس ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد (جو اتنی معروف بھی نہ تھی) میں ٹھہرتے تھے ——— مسجد کے فرش پر اِدھر اُدھر اخبار، فائلیں اور کاغذ پڑے ہوتے تھے ——— کھانے کا وقت ہوا تو کسی دوکان پر جا کر کھانا کھا آئے ——— اور ——— پھر کاغذات تھیلے میں ڈالتے اور پارلیمنٹ کا رخ کرتے ——— اکثر پیدل چلتے تھے اور جب بھی موقع پیدا ہوتا پارلیمنٹ میں ایسی واضح اور بغیر کسی کا لحاظ کئے تقریر کرتے کہ ایوان کی دیواریں اور چھتیں لرز اُٹھتیں۔

(۴)

دہلی میں ایک نیم سرکاری و سیاسی قسم کا اجتماع تھا۔ بعض اہم اور نازک مسائل زیرِ بحث تھے۔ شام کو عصرانہ تھا۔ اعیان و اکابر جمع تھے۔ حسرت بھی مدعو تھے۔ ایسے مواقع پر ایسی پارٹیاں صرف جائے پئے بلانے کے لیے نہیں ہوتیں اور باتیں بھی مدِ نظر ہوتی ہیں ——— آرائش و زیبائش، جاہ و حشم، ساز و سامان، تکلف و تواضع، صاحبانِ ثروت، ماہرینِ سیاست، اکابرِ علم و حکمت اپنے اپنے وزن اور وقار کے ساتھ اور خواتین مع اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں۔ فضا آراستہ، چمن پیراستہ،

حوالۂ متن | یہ عبارت "حسرت موہانی ——— محشرِ عمل" (رشید احمد صدیقی) سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق | مصنف اس مضمون میں عظیم شاعر اور پارلیمنٹ کے بے باک رکن مولانا حسرت موہانی کی سیرت کے اہم پہلو زیرِ بحث لاتے ہیں ——— اس ضمن

ہیں وہ بعض چشم دید واقعات کے حوالے بھی دیتے ہیں۔

تشریح | دہلی میں ایک سیاسی اجتماع تھا۔ اس کی حیثیت یکسر سرکاری نہیں تھی، بس نیم سرکاری کہہ سکتے ہیں۔ کچھ نازک اور اہم مسئلوں پر بحث ہوتی تھی۔ شام کو دعوت تھی۔ تمام بڑے بڑے لوگ جمع تھے۔ حسرت کو بھی دعوت دی گئی تھی ــــ ان موقعوں پر جو دعوتیں دی جاتی ہیں، ان کا مقصد صرف چائے پینا ہی نہیں ہوتا، وہاں کچھ اور باتیں بھی کرنی ہوتی ہیں ــــ آرائش اور خوبصورتی کا خاص خیال رکھا گیا تھا ــــ ہر طرف شان و شوکت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ طرح طرح کے ساز و سامان مہیا تھے، بڑے تکلفات تھے، بڑی توضع کا اہتمام تھا، امراء، سیاستدان، عالم، فاضل، فلسفی بھی پورے وقار کے ساتھ جمع تھے اور عورتیں بھی اپنی تمام تر خوبصورتی اور دل لبھانے والی آرائشوں کے ساتھ جلوہ گر تھیں ــــ گویا فضا سجی ہوئی تھی اور باغ سجایا ہوا تھا۔"

(۵)

حسرت اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سارے اکابر اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ محفل کا رنگ بھی بدل گیا۔ تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں آتی رہیں اور اپنا اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں۔ سارا گرد و پیش جو دولت، امارت اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا، ایک شخص کی موجودگی سے کیا سے کیا ہو گیا اور اس مردِ درویش کے جلال اور اس کی شاعری کے جلو میں وہ سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا ــــ کتنی ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کو باضابطہ اور بامعنی تحریر کا جامہ پہنانا ناممکن معلوم ہونے لگا ــــ اور بے اختیار یاد آنے لگے؛ ــــ

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

حوالۂ متن | یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "حسرت موہانی ــ محشرِ عمل" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | مصنف اس مضمون میں حسرت موہانی کی سیرت کے اہم پہلو زیرِ بحث

لاتا ہے اور اس حوالے سے بعض واقعات بھی بیان کرتا ہے۔

تشریح حسرت موہانی کلام سنا رہے تھے۔ ان کے گرد تمام بڑے بڑے لوگ جمع ہو گئے۔ مجلس کا رنگ ہی تبدیل ہو گیا۔ تھوڑی دیر ذہن میں کچھ اور باتیں بھی آتی رہیں اور اپنے اثرات چھوڑتی رہیں ـــــ یہ سارا ماحول جہاں ہر طرف دولت، امارت اور نفاست ہی کی عکاسی ہو رہی تھی، صرف ایک شخص (وہ بھی بس عام سے حُلیے کا) کی موجودگی سے کیسے یکسر بدل گیا اور ـــــ اس درویش آدمی کے رعب داب اور شاعری کے سامنے وہ سارے کے سارے انتظامات کس قدر بے وقعت اور اضافی معلوم ہونے لگے ـــــ کتنی ہی ایسی باتیں ذہن میں اُبھریں جنہیں باقاعدہ اور بامعنی تحریر میں پیش نہیں کیا جا سکتا اچانک اقبال کی ایک نظم کے نقوش میرے ذہن میں اُبھرنے لگے اور بے اختیار یاد آنے لگے ـــــ (ان اشعار کا مفہوم یہ ہے) ـــــ اس کی (یعنی جو واقعی مردِ مومن ہے) امیدیں بہت تھوڑی ہوتی ہیں اور مقاصد بڑے بلند ہوتے ہیں ـــــ اس کی ادائیں دلوں پر اثر انداز ہونے والی ہوتی ہیں اور اس کی نگاہیں دلوں پر نوازشیں کرتی ہیں ـــــ وہ بات کرتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کرتا ہے۔ مگر میدانِ عمل میں سرگرم ہوتا ہے ـــــ وہ تمام مجالس میں بھی اور میدانِ جنگ میں بھی ہر کہیں نیک اور پاک ہوتا ہے ـــــ وہ فی الحقیقت عقل کی منزل، عشق کا حاصل اور کائنات میں مجالس کی گرمی ہوتا ہے۔

محمد طفیل

خلاصہ

احسان دانش

محمد طفیل مرحوم نے احسان دانش مرحوم کا جو خاکہ لکھا، انہی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یوں ہے: میری احسان دانش سے پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں کتابوں کی دکان پر ہوئی اس وقت انہوں نے چار خانہ تہبند باندھ رکھا تھا۔ اور کھدر کا شلوکا پہن رکھا تھا۔ ان کی رنگت سیاہ تھی۔ ان کی باقاعدہ تعلیم چوتھی جماعت تک ہے مگر بے قاعدہ تعلیم اتنی کرائم۔ اے کے طالب علم ان سے رہنمائی حاصل کرتے۔ جوانی کے کئی سال مزدوری کر کے گزارے وزن انہیں ڈھوتے رہے مگر افسوس ہے کہ مزدور طبقے کو ان کی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ سیلف میڈ انسان ہیں۔ شروع ہی سے جرات رندانہ کے مالک ہیں۔ باغیانہ خیالات کے مالک ہی نہیں ان کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ایک بار میں نے ٹوکا کر یوں باغیانہ خیالات کا اظہار نہ کیا کریں۔ جیل چلے جاؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ میں جیل جانے سے نہیں ڈرتا۔ مگر ڈر یہ ہے کہ مجھے بی کلاس دیں گے جہاں موجودہ زندگی کے مقابلے میں آرام ہوگا اور میں اس زندگی کا عادی ہو جاؤں گا۔ بلکہ چاہوں گا کہ میرے بال بچوں کو بھی جیل میں ہی بھیج دیں۔ یعنی جب مجھے زندگی کا سکھ حاصل نہیں تو مجھے جیل جانے کا کیا ڈر؟

کھانا صرف ایک وقت کھاتے ہیں اور چارپائی کی بجائے فرش پر سوتے ہیں۔ رہائش انارکلی کے ایک مکان میں ہے مگر کہتے ہیں کہ میں نے الاٹ نہیں کرایا، بس بیوی بچوں سمیت اس میں اپنا سامان لے کر آگیا۔ جب آ رہا تھا تو سارے انارکلی والے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

انہیں کبوتر پالنے کا بہت شوق تھا۔ مگر کبوتر صرف قاصد قسم کے ہی رکھتے ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں پیغام پہنچاتے ہیں اور کہاں کہاں سے انہیں پیغام آتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت

ہے کہ ان کے کبوتر سارے قاصد ہی ہیں۔

شاعروں کا جمگھٹا بھی ان کے ہاں رہتا ہے اور اصلاح لینے والوں کا بھی مگر چائے جو بھی آتا ہے اپنے لیے آرڈر دے کر آتا ہے۔ ایک دفعہ ایک انکم ٹیکس افسر نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنا حساب کتاب دکھائیں، آخر آپ اتنے زیادہ اخراجات پورے کیسے کرتے ہیں۔ انہوں نے اسے بھی کہہ دیا کہ یہاں کا طریقہ تو یہ ہے کہ آپ کو بھی اگر چائے پینی ہو گی تو آپ کو خود ہی نیچے چائے کا آرڈر دے کر آنا پڑے گا۔

ان کی طبیعت قلندرانہ اور زندگی درویشانہ ہے۔ مگر مزاج کے اعتبار سے کاروباری بھی ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے میرے پاس تیس ہزار روپے تھے مگر اب کچھ بھی نہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ پاکستان بننے سے پہلے والی بات شاید درست ہو مگر اب والی درست نہیں۔

فرہنگ

صفحہ ۱۰۱۔ مرتبت: مرتبہ۔ لازم وملزوم: ایک دوسرے سے وابستہ یا ضروری

صفحہ ۱۰۲۔ شلوکا: کرتا جو کمر تک ہوتا ہے اور آستین کہنی تک ہوتی ہے۔ طوعاً وکرہاً: مجبوراً۔ بہ رضا ورغبت: اپنی مرضی سے۔

صفحہ ۱۰۳۔ سیلف میڈ: اپنی محنت سے بنے ہوئے۔ مقتدی: پیچھے نماز پڑھنے والے۔ مقلد۔ امام: نماز پڑھانے والا، رہنما۔ سرشت: فطرت، مزاج۔ مضائقہ: ڈر، حرج۔ ضرورتاً: ضرورت کی بنا پر۔

صفحہ ۱۰۴۔ کابک: کبوتروں کا ڈربا۔ ری ہیبلیٹیشن: بحالیات۔

صفحہ ۱۰۵۔ معالجات: علاج۔ دسترس: مہارت۔ تندہی: جانفشانی۔ انہماک: توجہ، دھیان۔ طبعاً: مزاجاً، طبیعت کے لحاظ سے۔

صفحہ ۱۰۶۔ نوک پلک درست کرنا: سنوارنا، ٹھیک کرنا، اصلاح دینا۔ سبکدوش: فارغ۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

باقاعدہ تعلیم چوتھی جماعت تک اور بے قاعدہ اتنی کہ ایم۔ اے پاس کو بھی پڑھا دیں۔ ان کے والد مزدوری کرتے تھے اور زندہ رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس برخوردار کے لیے بھی یہی کام مناسب سمجھا، تاکہ یہ بھی انہی کی طرح اینٹیں اور گارا ڈھو ڈھو کر اپنے مستقبل پر ایک دیوار چن دیں۔ طوعاً و کرہاً یا برضا و رغبت انہوں نے بھی اپنی عمر کے کئی جوان سال اسی گارے اینٹ کی نذر کر دیئے، مگر یہ اپنی جدوجہد اور صلاحیتوں سے چنی ہوئی دیوار کو ڈھا کر آگے بڑھ گئے ——

حوالۂ متن یہ عبارت محمد طفیل کے مضمون "احسان دانش" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس مضمون میں محمد طفیل احسان دانش کی شخصیت کے بارے میں ایک متوازن خاکہ لکھ رہے ہیں جس میں ان کی خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کا بین السطور حوالہ بھی ہے۔

تشریح جہاں تک احسان دانش کی تعلیم کا تعلق ہے، انہوں نے باقاعدہ تعلیم تو چوتھی جماعت تک حاصل کی لیکن بے قاعدہ تعلیم کا یہ عالم ہے کہ ایم اے پاس بھی ان سے تعلیم حاصل کریں۔ ان کے والد مزدوری کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے بھی یہی پیشہ مناسب سمجھا تاکہ وہ بھی انہی کی طرح اینٹیں اور گارا ڈھو ڈھو کر اپنے مستقبل کی دیوار استوار کرے۔ انہوں نے بھی مجبوراً یا اپنی مرضی سے بہرحال کسی بھی بنیاد پر اپنی جوانی کے کئی سال اینٹ گارا ڈھونے میں صرف کر دیے —— مگر —— اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے اس استوار کی ہوئی دیوار کو گرا کر آگے نکل گئے۔

(۲)

یہ قطعی سیلف میڈ قسم کے آدمی اور شاعر ہیں —— جو کچھ کیا خود کیا۔ یہ اپنے ہر اچھے اور ہر برے کام کے خود مقتدی ہیں اور خود ہی امام۔ جس شخص نے مزدوری کرتے کرتے اتنی ترقی کر لی ہو کہ ہندوستان اور پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ نہ صرف ان کو جانتا

ہو بلکہ ان کے شعر گنگناتا بھی ہو تو یہ حادثہ اپنی جگہ کوئی معمولی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ مزدوروں کے تو یہ بے تاج بادشاہ ہیں، اس لیے کہ مزدور ان کا کلام سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

حوالۂ متن | یہ عبارت محمد طفیل کے مضمون "احسان دانش" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس مضمون میں محمد طفیل احسان دانش کی شخصیت کے بارے میں ایک متوازن خاکہ پیش کر رہے ہیں۔ جس میں ان کی خوبیوں کا تذکرہ برملا ہے جبکہ خامیوں کا بین السطور ——

تشریح | احسان دانش نے اپنی زندگی سراسر ذاتی محنت سے بنائی اور شاعر بھی سراسر اپنی ہی محنت کے بل پر بنے —— انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے، خود ہی کیا ہے —— یہ ہر اپنے اچھے اور بُرے کام کے آغاز کرنے والے بھی خود ہی ہیں اور پیروی کرنے والے بھی خود ہی —— یعنی انہوں نے اچھا بُرا جو بھی کچھ زندگی میں کیا صرف اپنے ہی بل بوتے پر کیا —— یہ کوئی معمولی بات تو نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے پڑھے لکھے لوگ جسے جانتے ہی نہ ہوں، اس کے شعر بھی گنگناتے ہوں، اس نے ساری ترقی محنت مزدوری کر کے کی ہو —— البتہ مزدوروں کے وہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ بیچارے ان کا کلام سمجھ ہی نہیں سکتے، گویا جس طبقے سے وہ اُبھرے ہیں وہ ان کی قدرشناسی کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔

(۳)

احسان صاحب کو کبوتر پالنے کا بھی شوق ہے۔ انہیں کی کابکیں تھیں جن کو لاکر انہوں نے انارکلی میں سب کو حیرت زدہ بنا دیا تھا۔ ایک شاعری کا شوق ہی کون سا کم تھا کہ کبوتر بھی پالتے ہیں جناب ——، وہ بھی ایسے ویسے نہیں، قسم خاص، قاصد نسل کے، جو پیغام لاتے اور لے جاتے ہیں۔ نہ جانے اُن کے کتنے پیغام آئے اور گئے —— بہر حال یہ پالتے صرف قاصد کبوتر ہی ہیں۔ ایک کبوتر کو دیکھ کر اس کی چار نسلوں تک کا پتہ بتا دیتے ہیں کہ اس کبوتر کی ماں ایسی تھی اور باپ ایسا، اور اس کبوتر کے دادا کا ہاضمہ درست تھا یا نہیں اور اس کبوتر کی پڑدادی کا اخلاق اچھا تھا یا بُرا۔ کبوتروں کے معالجات میں بھی انہیں بڑی دسترس ہے۔ اگر کسی کبوتر، کبوتری کو کوئی "زنانہ مردانہ" بیماری ہو جائے تو یہ اس کا علاج اتنی تندہی اور اتنے انہماک سے کریں گے کہ کیا کسی ڈاکٹر نے کسی عظیم شخصیت کو بچانے کے لیے کیا ہو گا۔

حوالۂ متن | یہ اقتباس محمد طفیل کے مضمون "احسان دانش" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق | محمد طفیل اس مضمون میں احسان دانش کی عادات و اطوار اور کمالات کا اظہار کرتے ہیں۔

تشریح | احسان صاحب کبوتر پالنے کے بھی بہت شوقین ہیں۔ کبوتروں ہی کے ڈربے تھے جنہیں لاکر انہوں نے انار کلی میں سب کو حیران کر دیا تھا۔ — شاعری کا شوق ہی کیا کم تھا کہ انہوں نے کبوتر پالنے بھی شروع کر دیئے اور وہ بھی تو عام سے کبوتر نہیں، خاص قسم کے، قاصد نسل کے جو پیغام رسانی کا کام کرتے ہیں — اب کیا پتہ کبوتروں کے ذریعے انہوں نے کہاں کہاں پیغام رسانی کی اور ان کے کبوتر کہاں کہاں سے ان کے لیے پیغام لائے — بہر حال وہ پالتے صرف قاصد کبوتر ہی ہیں — کبوتروں کے بارے میں ان کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ کبوتر کو دیکھ کر اس کی چار نسلوں تک کے بارے میں بتا دیتے ہیں کہ اس کی ماں کیسی تھی، اس کے باپ کیسے تھے اور اس کے دادا کا ہاضمہ کیسا تھا یا اس کی پڑدادی کا اخلاق کیسا تھا۔ انہیں کبوتروں کے علاج معالجے میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے — اگر کوئی کبوتر یا کبوتری بیمار پڑ جائے تو احسان صاحب اس کا علاج اتنی محنت اور توجہ کے ساتھ کریں گے کہ کسی ڈاکٹر نے کسی بڑی شخصیت کو بچانے کے لیے بھی نہ کیا ہوگا۔

(۴)

"میاں! میں قید و بند سے نہیں ڈرتا۔ حکومت مجھے کل گرفتار کرتی آج کر لے۔ میں باہر کونسی آرام کی زندگی گزار رہا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ حکومت مجھے "بی کلاس" میں رکھ لے گی۔ اگر بی کلاس میں رہوں تو بے شک میرے بیوی بچوں کو بھی عمر بھر کی قید کر دے۔ اگر کسی نظم کی وجہ سے مجھے سات برس کی بھی قید ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ انشاء اللہ سات بجے اور ساتھ لاؤں گا۔ اس وقت میرا جیل سے باہر گزارا اور مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے باہر آتے ہی مجھے ضرورتاً مزید تیز نظم لکھنی پڑے گی۔ نتیجتاً پھر جیل کے اندر — اگر اسی آنے جانے میں بقایا دن کٹ جائیں تو میں سمجھوں گا کہ میری شاعری کام آ گئی۔"

حوالۂ متن | یہ عبارت محمد طفیل کے مضمون "احسان دانش" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | محمد طفیل احسان دانش کے خاکے میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے گورنر جنرل ہاؤس میں گورنر جنرل اور ساری کابینہ کے سامنے باغیانہ نظم پڑھ دی۔ طفیل صاحب نے انہیں کہا کہ احتیاط کیا کریں۔ جیل ہو جائے گی۔ مگر انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔

تشریح | طفیل صاحب! میں قید سے نہیں گھبراتا۔ حکومت مجھے کل کی بجائے آج ہی پکڑ لے۔ قید کے باہر کونسی آرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں —— خیال ہے کہ حکومت مجھے بی کلاس دے گی —— اگر بی کلاس میں رہا تو بے شک میرے بال بچوں کو بھی عمر قید کی سزا سنا دی جائے۔ اگر مجھے کسی نظم کی وجہ سے سات برس کی بھی قید ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ انشاء اللہ قید سے باہر آؤں گا تو سات بچے اور ساتھ لے کر آؤں گا۔ اُس وقت جیل سے باہر میرا گزارا اور بھی مشکل ہو جائے گا —— اور —— پھر اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر مجھے پھر کوئی ایسی ہی نظم لکھنی پڑے گی۔ جس کے نتیجے میں پھر جیل کے اندر چلا جاؤں گا —— اگر میری زندگی کے باقی دن اسی قید میں آتے جاتے ہیں بسر ہو جائیں تو سمجھوں گا کہ میری شاعری میرے کام آ گئی۔

(۵)

یہ طبعاً کاروباری آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اچھے خاصے تعلقات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ ویسے یہ زبان حال سے یہی کہیں گے کہ سخت بے وقوف قسم کا آدمی ہوں۔ اللہ نے مجھے ذرا سا بھی کاروباری آدمی نہیں بنایا۔ لیکن آپ ان کی بات پر مطلق کان نہ دھریں۔ اکثر یہ کہتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے میرے پاس بائیس ہزار روپیہ تھا۔ اب کچھ نہیں۔ ممکن ہے۔ اس میں کچھ صداقت ہو! صداقت اس اعتبار سے تو یقینی معلوم ہوتی ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ان کے پاس اتنا روپیہ ہو گا۔ لیکن "اب" اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا!

حوالۂ متن | یہ عبارت محمد طفیل کے مضمون احسان دانش سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس مضمون میں وہ احسان دانش کی عادات و اطوار پر بحث کرتے ہیں۔

تشریح | احسان دانش طبیعت کے اعتبار سے کاروباری آدمی ہیں —— اسی لیے کئی بار ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اچھے بھلے تعلقات کی قطعاً پروا نہیں کرتے بلکہ اگر کہا جائے کبھی بھی پرواہ نہیں کرتے تو یہ بھی درست ہی ہے۔ ویسے اپنی زبانی وہ خود کو بے وقوف قسم کا آدمی کہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مجھے ذرا سی کاروباری آداب نہیں آتے لیکن —— ان کی بات پر یقین نہ کریں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ پاکستان بننے سے پہلے میرے پاس بائیس ہزار روپے تھے، اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ سچائی بھی ہو کہ پاکستان بننے سے پہلے ان کے پاس بائیس ہزار روپیہ ہی ہو لیکن ——

وہ پاکستان بننے کے بعد کی جوبات کرتے ہیں (یعنی پاس کچھ نہ ہونے کی) اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ــــــ

(۶)

ان کے ہاں روز منڈلی لگی رہتی ہے جسے ذہنی بدہضمی ہو جاتی ہے وہ شعر کہنا شروع کر دیتا ہے اور اصلاح لینے پہنچتا ہے۔ احسان صاحب کے پاس۔ یہ ان حضرات کے شعروں کی نوک پلک درست کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اپنی شان میں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے جاتے ہیں۔ دو چار نادر قسم کے فقرے کہہ کر مرعوب کر لیا۔ کچھ اپنے خلوص کا یقین دلا دیا، کچھ اپنی جرات اور بے باکی کے تذکرے کر کے اپنا رعب قائم کر دیا، کچھ اپنی زندگی کے حالات سنا کر متحیر کر دیا، غرض:

صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے

حوالۂ متن یہ عبارت محمد طفیل کے مضمون "احسان دانش" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق محمد طفیل احسان دانش کی عادات و اطوار کا تذکرہ کرتے ہیں۔

تشریح احسان دانش کے ہاں روزانہ مجلس لگی رہتی ہے۔ جسے بھی ذرا ذہنی بدہضمی ہوتی ہے وہ شاعری شروع کر دیتا ہے اور شعر لکھ کر ان کے پاس پہنچ جاتا ہے کہ اصلاح دیجئے ــــــ وہ ان کے اشعار کی اصلاح شروع کر دیتے ہیں ــــــ ساتھ ہی ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جاتے ہیں اور اپنی شان بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ ــــــ دو چار مختلف قسم کے اور ذرا عجیب سے جملے بولی کہ وہ اسے مرعوب بھی کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ ذکر اپنے خلوص کا کر دیتے ہیں، کچھ اپنی سادگی کا اور کچھ اپنے علم کا، کچھ اپنی جرأت مندی کا، کچھ اپنی دلبری کا ــــــ یوں وہ اس شخص پر اپنا رعب ڈال دیں گے اور ــــــ پھر ــــــ اپنی زندگی کے طرح طرح کے واقعات سنا کر حیران کر دیں گے ــــــ غرض ــــــ زندگی گزر رہی ہے۔

شیخ عبدالقادر

میری زندگی

یوں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت سی نعمتیں عطا کیں۔ لیکن ایک نعمت جس کی مجھے حسرت ہے وہ میرا بچپن ہے۔ چونکہ میں سب بہن بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ اس لیے میں اپنے ہمعصر بچوں کے ساتھ کھیل کود سے محروم رہا۔ میری جوانی کا آغاز لاہور سے ہوا اور پھر یہی میرا مستقل مسکن ٹھہرا۔ عملی زندگی میں ایک انگریزی اخبار کی ایڈیٹری کی۔ اس کام میں میرا دل کافی لگ گیا۔ جوانی کی مصروفیات میں سے ایک اقبال کے ساتھ میری دوستی ہے۔ انہوں نے میرے گھر کے قریب مکان لے لیا۔ لہٰذا ہماری شامیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ اسی زمانے میں اردو ادب کی خدمت کے جذبے کے تحت "مخزن" کا اجراء کیا۔ لہٰذا میری مصروفیتیں بڑھ گئیں۔ یعنی اخبار کے ساتھ ساتھ اردو مضامین کی فکر درپیش ہوئی۔ روزگار کے سلسلے میں انگلستان جانا پڑا۔ لیکن رسالے کو بھی جاری رکھا۔ اقبال بھی انگلستان پہنچے تو دو سال کے مشاغل میں ان کا ساتھ شامل رہا۔ انسان کی اخلاقی یا علمی نشوونما پر بہت سی شخصیتوں کا اثر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے بھی چند ایسی بزرگ ہستیاں میسر آئیں جن کی اچھی خصلتوں کا گہرا نقش آج تک میرے دل پر ہے۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ایک تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں سرسید احمد خاں لاہور آئے تو شامیانوں کے سوراخ کے ذریعے ان کا دیدار نصیب ہوا۔ اس دیدار سے ان کی بڑائی کا پہلا اور بیرونی نقش میرے دل پر کھنچ گیا۔ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر میں اخبار سے منسلک ہوا تو شاہجہان پور کے جلسۂ کانفرنس میں ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان ملاقاتوں کا اثر آج تک میرے دل پر قائم ہے۔ وہ بہت محنتی تھے۔ اس کے باوجود کوئی جائیداد نہ بنا سکے۔ حتیٰ کہ ان کے مرنے پر کفن دفن کا انتظام ان کے دوست محسن الملک نے کیا۔ ادب میں اردو نثر نگاری میں طریقۂ نو کی ایجاد کا سہرا سرسید ہی کے

سر ہے۔ سرسید کے بعد میں نذیر احمد، شبلی اور حالی سے متاثر ہوا حالی کے اشعار نے مجھے یہ سکھایا کہ شعر میں جاذبیت کے علاوہ تاثیر اور مقصد بھی ضروری ہے۔ ان کے کلام نے اس دور کا اندازِ شاعری بدل دیا۔ حالی کے بعد اکبر الہ آبادی اور اقبال نے ان اصولوں کو اپنایا۔ حالی قدیم علماء کے بہترین صفات کا مجموعہ تھے۔ وہ منکسر المزاج تھے۔ وہ شیخی اور بے جا تعلی سے نفرت کرتے تھے۔

ان کے بعد جس عالم سے متاثر ہوا ان کا تعلق سمندر پار سے ہے۔ یہ ڈاکٹر جے۔ سی۔ آر۔ ایونگ تھے وہ ایف سی کالج میں پرنسپل تھے۔ مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک بے مثال معلمِ ادب و اخلاق اور غیر معمولی طور پر ذہین و طباع تھے۔ وہ کئی سال تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ مندرجہ بالا تینوں بزرگ میدانِ علم کے شاہسوار تھے۔ ان کی روشن مثالیں ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

فرہنگ

صفحہ ۱۰۷۔ قلیل : تھوڑا۔

صفحہ ۱۰۸۔ کوفت : تکلیف، رنج۔ تلافی : تدارک، بدلہ۔ ہم نشینی : قرب۔ آب و دانہ : رزق۔ معیت : ساتھ۔ پیروی : تقلید۔

صفحہ ۱۰۹۔ محب : محبت کرنے والا۔ ناخدا : ملاح۔ نصب کرنا، گاڑنا۔ رخنہ : سوراخ۔ جاگزیں : ٹھہرنے والا۔ متانت : سنجیدگی

صفحہ ۱۱۰۔ غمازی : چغلی۔ بشاش : ہنس مکھ، خوش و خرم۔ بشاشت : خوشی کی کیفیت۔ افسردہ : اداس۔ نظم و نسق : انتظام۔ رقعات : خطوط۔ تجہیز و تکفین : کفن دفن۔ دلدادہ : شوقین۔ کاربند رہنا : پابند کرنا۔ تعلی : شیخی، بڑائی۔ نفور : متنفر۔ پود : نسل۔ انکساری : عاجزی

صفحہ ۱۱۱۔ بے نظیر : بے مثال۔ طباع : بہت ذہین۔ مدارج : درجے۔ مساعی : کوششیں۔ ممنون : احسان مند۔ تشدد : سختی۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

انسان کی زندگی مختلف اثرات کا مجموعہ ہے۔ پہلا اثر ہر شخص پر اس کے ماں باپ کا

ہوتا ہے، پھر اُن حالات کا جو اُس کے گرد و پیش ہیں۔ پھر اُستاد کا جس سے پڑھنا لکھنا یا کوئی ہنر سیکھے۔ ان اثرات کے علاوہ اکثر ہوتا ہے کہ آدمی کی اخلاقی یا علمی نشوونما پر اس وقت کے بڑے آدمیوں کا اثر ہوتا ہے جن کے حالات وہ سنتا ہے یا جن کے کمالات وہ دیکھتا ہے اور ان سے متاثر ہو کر اُس کے دل میں قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان کی مثال کی کسی حد تک پیروی کرے۔ خوش قسمتی سے مجھے بہت سے ایسے بزرگوں کو دیکھنے کا اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا جن کی اچھی خصلتوں کا گہرا نقش میرے دل پر ہے۔

حوالۂ متن | یہ عبارت شیخ عبدالقادر کے مضمون "میری زندگی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس مضمون میں سر عبدالقادر اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات بیان کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان سے ان کی زندگی کیسے متاثر ہوئی؟

تشریح | انسان کی زندگی مختلف اثرات ہی سے مل کر تعمیر ہوتی ہے۔ انسانی زندگی پر سب سے پہلے ماں باپ کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد اُن حالات کا اثر ہوتا ہے جو اس کے ارد گرد رونما ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس استاد کا اثر ہوتا ہے جو پڑھاتا ہے یا کوئی فن سکھاتا ہے۔ ان اثرات کے علاوہ بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے عہد کے بڑے لوگوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس کا اثر اس کی اخلاقی اور علمی نشوونما پر ہوتا ہے — جب وہ کسی بڑے آدمی کے حالات سنتا ہے یا ان کے کمالات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اُن سے متاثر ہو کر فطری طور پر چاہتا ہے کہ وہ بھی ان جیسا بن جائے، اس لیے وہ ان کی تقلید شروع کر دیتا ہے — خوش نصیبی کی بات ہے کہ مجھے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا موقعہ ملا جن کی اچھی عادات کے گہرے نقوش میرے دل پر ثبت ہیں۔

(۲)

ابھی میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا جب ایک موقع پر تعلیمی کانفرنس کے لیے سر سید احمد خاں مرحوم لاہور تشریف لائے۔ یہ وہ بزرگ تھے جن کی شہرت میں نے اپنے بچپن میں ہی سنی تھی کہ بڑے محب وطن ہیں اور مسلمانوں کی تعلیمی کشتی کے ناخدا ہیں۔ میرے دل میں شوق ہوا کہ اُن کو دیکھنا چاہئے۔ ایک بنگلے کے وسیع احاطے میں شامیانہ نصب کر کے اور اس کے گرد قناتیں لگا کر جلسے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چھوٹی

جماعتوں کے طالب علموں کو جلسے کے اندر نو کون جانے دیتا تھا، میں انہیں دور سے دیکھنے کی امید میں دور جا کھڑا ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ کچھ لوگ قناتوں کے رخنوں میں جھانک رہے تھے۔ میں نے بھی ایک رخنہ ڈھونڈ کر جھانکنا شروع کیا۔ اندر جلسہ گاہ کے وسط میں ایک بزرگ جلوہ افروز تھے جن کی لمبی سفید داڑھی تھی اور جن کے چہرے سے شانِ بزرگی عیاں تھی۔ کسی نے بتایا کہ یہی سر سید احمد خاں ہیں ___ یہ دیدار' اُن کی بڑائی کا پہلا اور بیرونی نقش تھا جو میرے صفحۂ دل پہ کھنچ گیا، گفتار سننے کی نوبت کئی برس بعد آئی۔

حوالۂ متن | یہ عبارت شیخ عبدالقادر کے مضمون "میری زندگی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس مضمون میں عبدالقادر اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات بیان کرتے ہیں اور بعض اہم لوگوں سے ملاقاتوں کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

تشریح | ابھی میری زندگی کے ابتدائی ایام ہی تھے کہ ایک موقع پر سر سید احمد خاں تعلیمی کانفرنس کے لیے لاہور آئے۔ میں نے ان کی شہرت بچپن ہی سے سن رکھی تھی کہ وہ وطن سے شدید محبت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں ترقی کرتی ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ مسلمانوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں میرے دل میں انہیں ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ جلسے کا انتظام ایک بنگلے کے کھلے احاطے میں کیا گیا تھا۔ جہاں شامیانے لگا دیئے گئے تھے اور قناتوں کا اہتمام کر دیا گیا تھا___ اب مسئلہ یہ تھا کہ چھوٹی جماعتوں کے طالب علموں کو جلسہ گاہ کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اس امید میں دور جا کھڑا ہوا کہ انہیں دور ہی سے دیکھ لوں گا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ بعض لوگ قناتوں کے سوراخوں میں سے اندر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی ایک سوراخ ڈھونڈ لیا اور جلسہ گاہ کے اندر جھانکنے لگا ___ جلوہ گاہ کے درمیان میں ایک بزرگ تشریف رکھتے تھے جن کی داڑھی سفید تھی اور چہرے سے بزرگی کی شان جھلکتی تھی ___ مجھے کسی نے بتایا کہ یہی بزرگ سر سید احمد خاں ہیں ___ اس دیدار نے میرے دل پر ان کی عظمت کا پہلا نقش ثبت کیا مگر یہ صرف بیرونی نقش کہلا سکتا ہے ___ ان سے بات کرنے کا موقعہ مجھے کئی سال بعد نصیب ہوا۔

(۳)

حالی کے اشعار نے مجھے سادگیٔ زبان کا دلدادہ بنایا اور مجھے یہ سکھایا کہ شعر میں جاذبیت کے علاوہ تاثیر اور مقصد ضروری ہے۔ ان کے کلام نے اس زمانے کا اندازِ شاعری بدل دیا۔ مولانا حالی کے معاصروں میں سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی بھی اسی اُصول پر کاربند رہے۔ ان کی شاعری میں ظرافت کا عنصر غالب تھا۔ ان سے بعد کی پود میں سر محمد اقبال مرحوم نے اس اصول کو اور بھی قابلِ عمل بنا دیا۔ مولانا حالی پرانے علماء کی بہترین صفات کا مجموعہ تھے۔ ان کی طبیعت انکسار پسند تھی اور شیخی اور بے جا تعلی سے وہ نفور تھے۔

حوالۂ متن یہ عبارت شیخ عبدالقادر کے مضمون "میری زندگی" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق اس مضمون میں شیخ صاحب نے بتایا ہے کہ وہ کس کس طرح متاثر ہوا ہے۔

تشریح حالی کے شعر پڑھ کر مجھے زبان کی سادگی سے پیار ہو گیا اور میں نے یہ سبق سیکھا کہ شعر کے اندر صرف ظاہری کشش ہی نہیں تاثیر اور مقصد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ حالی کے کلام نے اس عہد کی شاعری کا اسلوب ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حالی کے ہمعصروں میں اکبر الہ آبادی نے بھی اسی اصول پر عمل کیا ـــــ ان کی شاعری زیادہ تر ظریفانہ کلام ہے۔ ان کے بعد کی نسل میں علامہ اقبال مرحوم نے اس اصول کو اپنایا اور اس پر عمل کر کے اسے اور بھی قابلِ عمل بنا دیا ـــــ مولانا حالی کے اندر پرانے عالموں کی ساری صفات یکجا طور پر جمع تھیں۔ ان کی طبیعت میں عاجزی تھی اور شیخی اور بلا وجہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے سخت نفرت تھی۔

(۴)

پنجاب کی تعلیمی ترقی میں اُن کی کوششوں کا خاص حصہ ہے۔ وہ کئی سال یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور یونیورسٹی کی ترقی بھی ان کی مساعی کی ممنون ہے ڈاکٹر ایونگ بڑے منتظم تھے مگر انتظام کرتے نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی ایک نگاہ کسی اور کی جھڑکی یا تشدد سے زیادہ مؤثر تھی۔ میں اُن کے سامنے کھڑے ہوئے یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے دل کا حال پڑھ رہے ہیں۔ انہیں اپنے شاگرد کے حالات سے بے حد دلچسپی رہتی تھی اور ہر وقت اُن کو صلاح مشورہ اور امداد دینے کے

لیے آمادہ رہتے تھے۔

حوالۂ متن یہ اقتباس سر عبدالقادر کے مضمون "میری زندگی" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق سر عبدالقادر بتاتے ہیں کہ وہ کن کن شخصیات سے کس کس طرح متاثر ہوئے، ان متاثر کرنے والی شخصیات میں پروفیسر الیونگ بھی تھے۔

تشریح پنجاب نے تعلیمی میدان میں جس قدر ترقی کی، اس میں ڈاکٹر الیونگ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے وہ کئی سال تک یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، چنانچہ یونیورسٹی نے جو ترقی کی اس کے لیے بھی ان کی خدمات ایسی ہیں کہ یونیورسٹی پر بلاشبہ ان کا احسان ہے۔ ڈاکٹر لیونگ بہت اچھے منتظم تھے لیکن بظاہر کوئی ایسے آثار نظر نہیں آتے تھے جن سے اندازہ ہو کہ وہ کتنے سخت منتظم تھے۔ ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ ان کی ایک نظر کسی اور کی جھڑکی یا سختی سے زیادہ اثر انداز ہوتی تھی۔ میں ان کے سامنے کھڑا ہوتا تھا تو میں محسوس کرتا تھا جیسے وہ میرے دل کا حال پڑھ رہے ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں کے حالات میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور ہر حسبِ ضرورت انہیں مشورہ دینے یا ان کی عملی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین

خلاصہ

خود اپنی زندگی کی کہانی

یوں تو ہر شخص اپنی سوانح عمری لکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں ایک تو یہ کہ اس کی زندگی میں واقعی کچھ غیر معمولی واقعات و حادثات اور مشاہدات ہو گزرے ہوں دوسرے اس کے اندر بیان کی صلاحیت ہو۔ میں عمر بھر اچھی اقدار کا متلاشی رہا ہوں۔ بچپن کی یادیں بڑی پختہ ہوتی ہیں۔ بچپن کی انہیں پختہ یادوں میں سے محبوب یاد مولانا حالی تھے۔ وہ شفیق و فرشتہ صفت انسان تھے۔

میں اللہ تعالیٰ کا مشکور ہوں کہ اس نے مجھے ایک اچھے خاندان میں پیدا کیا۔ ایسا خاندان جس کی وجہ شہرت دولت نہیں بلکہ علم و شرافت تھی۔ میری والدہ مولانا حالی کی پوتی ایک نفیس خاتون تھیں۔ میں نے سب سے پہلے انہیں سے فیض حاصل کیا۔ انہوں نے مجھے سکھایا کہ زندگی کی قیمت محنت اور کام ہے۔ ان کی زندگی نے مجھے سکھایا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے اس کے بندوں کی خدمت کرنا ضروری ہے۔

میرے والد صاحب بیالیس سال کی عمر میں میری کمسنی میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے پوری زندگی قومی خدمت میں صرف کر دی۔ ان کی ذات اور تصنیف سے میں نے یہ سبق حاصل کیا کہ انسان کو ہمیشہ سب کے ساتھ رواداری اور انصاف کے ساتھ پیش آنا چاہیے

میدانِ تعلیم میں بڑا کامیاب رہا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے جونیئر اور سینیئر اسکالرشپ کے دو اعزاز حاصل کیے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ اسی دوران یوپی حکومت کی جانب سے مجھے وظیفہ ملا اور میں نے لیڈز یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ایم ایڈ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ سے ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری لی ایم ایڈ کا نتیجہ نکلتے ہی علی گڑھ یونیورسٹی کی جانب سے علی گڑھ ٹریننگ کالج کی پرنسپلی پیش کی گئی۔ یہ میری پہلی تقرری تھی اور میری آخری تقرری تک میں نے کسی آسامی کے لیے درخواست

نہ دی بلکہ خود بخود مجھے اللہ کی طرف سے یہ ملازمتیں ملتی رہیں۔ حکومت کشمیر میں میری تقرری دو سال کے لیے ڈیپوٹیشن پر تھی۔ لیکن میں وہاں سات سال تک رہا۔

میں اللہ کی اس مصلحت کا شکر گزار ہوں کہ میں دنیاوی مال و دولت سے محفوظ رہا کیونکہ یہ عارضی نعمت ہوتی ہے۔ لیکن میرے پاس مستقل دولت یعنی میرے جذبات، خیالات آرزوئیں اور امنگیں میرے پاس ہیں۔ میرے نزدیک دنیا میں دو چیزیں سب سے اہم ہیں ایک انسان اور دوسرا کام اور یہ باتیں میں نے اپنے والدین سے سیکھی ہیں کہ کام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان خود کو اس کام میں گم کردے اور انسانی رشتوں کو اس راستے میں رکاوٹ نہ بننے دے انسانوں کے مابین انسانیت کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ اچھے آدمی کی پہچان ہے۔ کہ وہ روزمرہ کے کاموں اور باہمی تعلقات میں اپنی شخصی خوبیوں کو اجاگر کردے۔ میرے نزدیک وہ لوگ کوتاہ نظر ہیں جو اپنے دوستوں، عزیزوں اور محبوبوں کی زندگی کی نعمت کو چھوٹی چھوٹی دلآزاریوں کے ذریعے ضائع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ لوگوں کے دلوں کو نیکی، شرافت اور خوش اسلوبی سے جیتا جا سکتا ہے۔ انسان کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ تو پھر کیوں نہ انسانوں کے دلوں میں اپنا گھر بنایا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔

فرہنگ

صفحہ ۱۱۳۔ شفیق: مہربان۔ استحقاق: حق۔ سرعنوان: سرفہرست

صفحہ ۱۱۴۔ اعجاز: معجزہ۔ ودیعت کرنا: عطا کرنا، بخشنا۔ بےنفس: بےغرض۔ رضاجوئی: رضا تلاش کرنا۔ منافی: الٹ، برعکس۔ طائرانہ نگاہ: سرسری نظر۔

صفحہ ۱۱۵۔ مصلحت: بہتری۔ صعوبت: مصیبت۔ وابستہ ہو جانا: ساتھ مل جانا۔

صفحہ ۱۱۶۔ دنیوی: دنیاوی۔ بار: بوجھ۔ منبذول کرنا: کھینچنا۔ آدرش: نصب العین۔ امنگیں: خواہشیں۔ انکساری: عاجزی۔

صفحہ ۱۱۷۔ جولانی: تیزی۔ گداز: نرمی۔ سوز: رنج۔ تسلط: غلبہ۔ کھوجنا: تلاش کرنا۔ کھوٹ کھپٹ: ملاوٹ، عیب، ٹیڑھاپن۔ سیوک: خادم۔ ضم کر دینا: ملا دینا، جذب کر دینا۔ اٹوٹ: نہ ٹوٹنے والا۔

صفحہ ۱۱۸۔ خدا ترسی: خدا سے ڈرنا۔ دست نگراں: محتاج، حاجت مند۔ مراسم: راہ و رسم۔ کوتاہ نظر: تنگ نظر۔ نفسانیت: خود غرضی، غرور، تکبر۔ شاذ:

عجیب، کبھی کبھی، اتفاقاً۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

اگر انسان کو خدا پر ایمان ہو تو زندگی میں اُس کا شکر ادا کرنے کے (اور کبھی کبھی ادب کے ساتھ شکوہ کرنے کے لیے بھی!) بہت سے مواقع مل جاتے ہیں۔ شاید سب سے اہم، جس کے لیے میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں، یہ ہے کہ اُس نے مجھے ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر میں خود انتخاب نہ کر سکتا تھا! میں یہ بات فخر کے ساتھ نہیں بلکہ انکساری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ نعمت مجھے بغیر کسی استحقاق کے ملی۔

حوالۂ متن یہ عبارت خود اپنی زندگی کی کہانی (ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس مضمون میں ڈاکٹر سیدین اپنی زندگی اور زندگی کے حوالے سے کئی کام کی باتیں بتلاتے ہیں۔

تشریح اگر انسان کو واقعی اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو تو اسے زندگی میں کئی ایسے مواقع مل جاتے ہیں۔ جب وہ اس کا شکر ادا کر سکتا ہے یا احترام آمیز الفاظ میں شکایت بھی کر سکتا ہے ___ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور سب سے زیادہ شکر اس بات کا ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر اگر میں خود بھی منتخب کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا ___ میں کسی فخر سے ساتھ نہیں بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کیونکہ مجھے یہ نعمت بغیر کسی حق کے ملی ہے ___

(۲)

میرے والد کا انتقال میری کم سنی میں ہو گیا تھا، جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی۔ مجھے اُن کی صحبت میں زیادہ مدت گزارنے کا موقع نہیں ملا ___ لیکن اُن کی یاد، اُن کی شخصیت، ان کی سیرت کی خصوصیتیں (جس حد تک میں انہیں سمجھ سکتا تھا) میرے حافظے میں واضح طور پر موجود ہیں ___ انہوں نے اپنی ساری عمر (جو صرف بیالیس سال کی ہوئی) قومی خدمت اور پبلک کاموں میں صرف کی ___ باوجود اپنی علمی اور ادبی دلچسپیوں کے اُن میں عملی کاموں کی بھی بہت اچھی صلاحیت تھی جو افسوس ہے مجھ میں بہت کم پیدا ہو سکی ___ مجھے اُن کی اس صلاحیت عمل پر تعجب ہوتا تھا اور اب رشک آتا ہے۔

حوالۂ متن | یہ اقتباس ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین کی تحریر "خود اپنی زندگی کی کہانی" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق | اس مضمون میں ڈاکٹر سیدین نے اپنی زندگی کے اہم واقعات بیان کیے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے اہم تجربات و نظریات بھی بیان کیے ہیں۔

تشریح | ابھی میری عمر بہت تھوڑی ہی تھی کہ میرے والد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ اس وقت میری عمر بمشکل گیارہ برس تھی۔ مجھے ان کی صحبت میں زیادہ وقت گزارنا نصیب نہیں ہوا ـــــ لیکن ـــــ ان کی یاد سے ان کی سیرت کی خاص خاص خوبیاں (جتنا میں سمجھ سکا) واضح طور پر میرے ذہن میں موجود ہیں۔ انھوں نے بیالیس سال کی عمر پائی۔ یہ ساری عمر انھوں نے قومی خدمت اور عوام کے کاموں میں ہی گزار دی۔ اگرچہ ان کی دلچسپیاں بنیادی طور پر علمی اور ادبی تھیں پھر بھی علمی اور ادبی مصروفیات کے باوجود وہ اس اہل تھے کہ دوسرے بہت سے علمی کام بھی سرانجام دے سکتے۔ بہت افسوس ہے کہ یہ اہلیت میرے اندر نہیں ہے۔ میں اتنا کچھ نہیں کر سکتا ـــــ پہلے تو مجھے ان کی عمل کرنے کی اس خاص اہلیت کو دیکھ کر حیرانی ہوا کرتی تھی ـــــ مگر اب یہ صورت ہے کہ میں جتنا ان کی سیرت کے اس پہلو پر غور کرتا ہوں مجھے ان پر رشک آتا ہے۔

(۳)

خدا نے اپنی مہربانی اور مصلحت سے مجھے بہت سی دنیوی دولت سے اور جائیداد کے بار سے محفوظ رکھا ہے۔ 'محفوظ' اس لیے کہتا ہوں کہ دولت ایک "مشکوک نعمت" ہے، یقیناً اس سے دنیا کے بہت سے کام نکلتے ہیں اور جب تک کسی فرد یا جماعت کے پاس مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام ایک معقول حد تک نہ ہو اس کے لیے ایک اچھی زندگی کی بنیاد ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بہت خطرے بھی ہیں کیونکہ دولت میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ذریعہ بننے کی بجائے مقصد بن جاتی ہے اور انسان کی تمام توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔ . . . .

حوالۂ متن | یہ عبارت "خود اپنی زندگی کی کہانی" سے لی گئی ہے جو خواجہ غلام السیدین کی تحریر ہے۔

سیاق و سباق | خواجہ صاحب اپنی زندگی کے حالات بتاتے ہیں اور تجربات و نظریات بھی بیان کرتے ہیں۔

تشریح خداوند کریم نے اپنی نوازش اور مصلحت سے مجھے زیادہ دولتِ دنیا اور جائیداد کے بوجھ سے بچائے رکھا۔ بوجھ سے بچائے رکھنے کی بات یوں کہنی پڑتی ہے کہ دولت بذاتِ خود ایک مشکوک نعمت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کے کئی کام اس سے نکلتے ہیں اور جب تک کسی شخص یا جماعت کے پاس دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کا مناسب بندوبست نہ ہو، اس کے لیے اچھی زندگی گزارنے کی ابتدا کرنی ہی مشکل ہو جائے گی۔ مگر اس میں بھی بڑے خطرے ہیں — کیونکہ — دولت میں ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ یہ ابتدا میں تو ذریعہ ہی ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ ذریعہ کی بجائے مقصد بن جاتی ہے اور جب دولت ہی انسان کا مقصدِ حیات بن جائے تو اس کی تمام تر توجہ بھی اسی کی طرف لگ جاتی ہے۔

(۴)

اکثر اس سوچ میں رہا ہوں کہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کسی چیز کی ہے اور مختلف موقعوں پر اور مختلف ذہنی کیفیتوں میں مختلف جواب ذہن میں آئے ہیں لیکن ان میں سے دو ایسے ہیں جن کا ایک طرح میرے فکر پر تسلط ہے — ایک تو یہ کہ دنیا میں سب سے اہم چیز کام ہے۔ یہی زندگی کی قیمت ہے جو ہر شریف انسان کو ادا کرنی چاہیے۔ کام، جو محنت اور دیانت داری کے ساتھ کیا جائے۔ جس میں کرنے والا اپنی صلاحیتوں کی بازی لگا دے۔ کام جس کا مقصد محض اپنی ذات کے لیے نفع کمانا نہ ہو بلکہ وہ کسی بڑے مقصد کی خاطر کیا جائے جس میں کرنے والا خود کو کھو سکے۔

حوالۂ متن یہ عبارت "خود اپنی زندگی کی کہانی" از خواجہ غلام السیدین سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق خواجہ صاحب اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے تجربات و نظریات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

تشریح میں نے اکثر سوچا ہے کہ انسانی زندگی میں سب سے اہم شے کیا ہے — اور — مختلف مواقع اور مختلف ذہنی کیفیات میں مجھے مختلف جواب ملتے رہے ہیں۔ لیکن — ان میں سے دو جواب ایسے ہیں جو میری سوچ پر حاوی رہتے ہیں — ایک تو یہ ہے کہ دنیا میں سب سے ضروری شے کام ہے — بلکہ — کام ہی زندگی کی وہ قیمت ہے جو ہر شریف انسان کو ادا کرنی بھی چاہیے — کام بھی وہ جو پوری ایمانداری اور محنت کے ساتھ کیا جائے، جس کا کرنے والا اپنی خداداد اہلیت کو استعمال کرتے ہوئے بازی لگا دے، جس کا مقصد صرف اپنی ذات کے لیے فائدے حاصل کرنا نہ ہو بلکہ وہ کبھی بڑے مقصد کے لیے ہو جس میں کام کرنے والا خود کو پوری طرح جذب کر سکے — گویا —

زندگی کی سب سے اہم شے محنت اور ایمانداری سے کام کرنا ہے —

(۵)

ان دونوں چیزوں میں جو اپنی اپنی جگہ پر انتہائی اہمیت رکھتی ہیں، کبھی کبھی تضاد پیدا ہوتا ہے۔ کام کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے، ایک روشن دماغ سائنس دان کے لیے، ایک صاحبِ دل آرٹسٹ کے لیے، ایک علم کے سیوک کے لیے کہ وہ خود کو اس میں ضم کر دے اور اپنے انسانی رشتوں کو اس میں حائل نہ ہونے دے۔ چنانچہ تاریخ میں بہت سے ایسے انفرادیت پسند پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے سماج کے بندھنوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا، بلکہ اپنے کام کی خاطر جس کی ایک مثالی تصویر اُن کے ذہن میں تھی، انھوں نے انسانی رشتوں کو قربان کر دیا۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ؟

حوالۂ متن یہ عبارت "خود اپنی زندگی کی کہانی" (خواجہ غلام السیدین) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق "خود اپنی زندگی کی کہانی" میں مصنف اپنے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ تجربات و مشاہدات زندگی کا بیان بھی کرتا ہے اور نظریات کا بھی۔

تشریح دنیا میں کام بھی اہم ہے، رشتے بھی اہم ہیں — دونوں اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں مگر کبھی کبھی ان میں ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے — ہو سکتا ہے کہ کام ایک لائق سائنس دان، ایک صاحبِ دل فنکار اور ایک علم کے خادم سے تقاضا کرے کہ وہ خود کو اس میں پوری طرح جذب کر دے اور اپنے سارے انسانی رشتوں کو اس میں مداخلت نہ کرنے دے — چنانچہ تاریخ میں بہت سے ایسے منفرد مزاج کے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے معاشرتی پابندیوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا — بلکہ — انھوں نے کام کے لیے جس کا ایک مثالی خاکہ ان کے ذہن میں تھا، انسانی رشتوں کی قربانی دے دی۔ کیا یہ درست ہے ؟ — یعنی دونوں ہی کام اہم ہیں۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ان میں توازن قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۶)

بڑے بڑے کام کرنے کی فکر بہت لوگوں کو ہوتی ہے، لیکن انسان کی سچی بڑائی کا اندازہ ان کاموں سے نہیں ہوتا جو بعض اوقات وہ جوش اور جذبات کی شدت اور تحسین عوام سے متاثر ہو کر کرتا ہے — اس کا صحیح اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ

انسان، روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں، شرافت دیانتداری، انسان دوستی اور خداترسی کا ثبوت دیتا ہے ـــــ ایسے کاموں میں جو اسٹیج پر نہیں کئے جاتے بلکہ گھر کی چار دیواری میں یا بالکل تنہائی میں جہاں نہ کوئی سراہنے والا ہوتا ہے، نہ ٹوکنے والا، بس اپنا ضمیر ہے یا خدا پر ایمان، جو نگرانی کرتا ہے۔

حوالۂ متن یہ اقتباس "خود اپنی زندگی کی کہانی" (خواجہ غلام السیدین) سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق اس تحریر میں خواجہ صاحب اپنے تجربات ونظریاتِ زندگی بیان کرتے ہیں۔

تشریح بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی خواہش اور فکر ہر انسان کے اندر قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے ـــــ لیکن سچی عظمت کا اندازہ ان کاموں سے نہیں ہوتا جو آدمی اکثر و بیشتر جوش اور جذبے کی زیادتی اور لوگوں کی تعریف وتحسین سے متاثر ہو کر انجام دیتا ہے ـــــ عظمت کا صحیح اندازہ تو اس بات سے ہوتا ہے کہ انسان روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں شرافت، ایمانداری، انسانیت اور خدا خوفی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ عظیم انسان ہے ـــــ یہ چھوٹے چھوٹے کام وہ ہیں جو کسی اسٹیج پر نہیں کئے جاتے بلکہ گھر کی چار دیواری میں انجام دیئے جاتے ہیں یا سراسر تنہائی کے اوقات میں جہاں نہ کوئی تعریف کرنے والا ہو، اور نہ کوئی ٹوکنے والا ـــــ بس اپنا ضمیر ہوتا ہے یا خداوندِ کریم جو اس عالم میں ہماری نگرانی کرتا ہے۔

(۷)

سوچتا ہوں کہ کس قدر کوتاہ نظر ہیں وہ لوگ جن کو اپنے دوستوں، عزیزوں اور محبوبوں کی زندگی کی نعمت حاصل ہے اور وہ اس انمول وقت کو ضائع کرتے ہیں ـــــ چھوٹی چھوٹی مخالفتوں، بدگمانیوں، دل آزاریوں، خود غرضیوں، نفسانیتوں میں، انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ محبت اور ہمدردی کرنے کا موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا ـــــ اور یہ احساس تو شاذ ہی ہے کہ اصل چیز یہ نہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، بلکہ ہم اُن کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں!

حوالۂ متن یہ اقتباس "خود اپنی زندگی کی کہانی" سے لیا گیا ہے۔ جس کے مصنف خواجہ غلام السیدین ہیں۔

سیاق وسباق اس تحریر میں خواجہ صاحب اپنی زندگی کے حالات بھی بتاتے ہیں اور زندگی کے اہم تجربات و مشاہدات اور نظریات بھی بیان کرتے ہیں۔

تشریح میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ بھی کتنے تنگ نظر ہیں اور احمق ہیں جنہیں دوستوں، عزیزوں محبت کرنے والوں اور کئے جلنے والوں کی نعمت میسر ہے، مگر وہ اپنا قیمتی وقت ضائع کردیتے ہیں اور اس نعمت کی قدر نہیں کرتے —— وہ معمولی معمولی مخالفتوں، بدگمانیوں، دل آزاریوں اور خود غرضیوں اور ذاتی لالچوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ انہیں خیال ہی نہیں آتا کہ ہو سکتا ہے محبت اور ہمدردی کرنے کا موقعہ بعد میں آئے یا نہ آئے اور یہ احساس تو انہیں شاید ہی ہوتا ہے کہ اصل اہم شے یہ نہیں کہ دوسرے ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

کرنل محمد خان

(خلاصہ)

مُصنف بیتی

میں اس بات سے واقف نہ تھا کہ اگر ایک عام شہری مصنف بن جائے تو پھر عوام اسے اپنی ملک یا پٹواری کی زبان میں "شاملات" دہ "بنا لیتے ہیں کہ جس کا جی چاہا بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیا اور جو جی چاہا اس کو کہہ دیا۔ یعنی مصنف کو نقادیوں الٹ پلٹ کر اور ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے ہیں کہ گویا وہ کوئی عجوبہ ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا۔ پنڈی کے ایک ادارے نے تے میری کتاب "بجنگ آمد" کی اشاعت کے بعد میرے ساتھ شام منائی تو اس میں شریک ایک خاتون نے حیرت کے عالم میں پوچھا "ہائے میں مر گئی! ایہہ کتاب ایس گھگھو نے لکھی اے۔ اُنوں کِنا بھولا لگدا سی تے وچوں کِنا میسنا نکلیا"۔

۱۹۶۶ء میں جب "بجنگ آمد" پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو پبلشر نے مجھے کچھ کتابیں دیں جو میں نے احباب میں تقسیم کر دیں۔ میرے ایک تیز رو دوست میجر رفیع جو میجر سے ترقی پا کر پریذیڈنٹ کے سیکرٹری بن گئے تھے۔ ان کو میں نے ایک کاپی دی تو انہوں نے ایک کاپی اور مانگ لی کہ شائد پریذیڈنٹ صاحب بھی پڑھنا چاہیں۔ جب میں وہ کتابیں لے کر گیا تو میجر رفیع نے صدر صاحب کو میرے غائبانہ تعارف کے ساتھ وہ کتاب پیش کی۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کا اظہار کیا تو میجر رفیع نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا۔ میرا لباس فوجی آدمی ہونے کی حیثیت سے مکمل اور مناسب نہ تھا۔ یعنی میں نے خاکی ڈرل وردی پہنی ہوئی تھی۔ بہر حال تھوڑے سے پس و پیش کے بعد میں ملاقات کے لیے چلا گیا۔ مناسب طریقے سے سیلوٹ مارا صدر صاحب نے مجھے منی سی شاباش دی اور میں باہر آ گیا۔ انہیں دنوں میری خفیہ فائل G.H.Q میں میری بریگیڈیئری کے سلسلے میں گئی ہوئی تھی۔ اگلے دن جی۔ ایچ۔ کیو سے بریگیڈیئر اسحاق کا فون آیا کہ کل تم کمانڈر انچیف کی اجازت کے بغیر صدر صاحب سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ لہذا اس بات سے ناراض ہو کر

تمہاری فائل (NO FURTHER ACTION) N.F.A کے ساتھ واپس آگئی ہے یعنی اب تم بریگیڈیر نہیں بن سکتے۔

دوست احباب مجھے تسلیاں دینے لگے۔ ایک موہوم سی امید تین پھولوں کی مثلث کندھوں پر سجانے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ اب ایک اور آرزو "آدم جی" انعام حاصل کرنے کی دل میں مچلنے لگی لیکن "آدم جی" ایوارڈ دینے والوں نے یہ اعلان کر کے اس آرزو کا بھی گلا گھونٹ دیا کہ اس سال کوئی کتاب معیار پر پوری نہیں اتری۔

۱۹۷۵ء میں "بسلامت روی" شائع ہوئی تو اس پر بھی تنقید کے بھاری پتھر گرائے گئے۔ اس سنگباری کی بنیادی وجہ یہ بتائی گئی کہ بسلامت روی میں عورتوں کا ذکر ہے اور وہ عورتیں تعداد میں زیادہ اور خوبصورت ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہے۔ حالانکہ میں نے فرنگ کا ذکر کیا ہے اور فرنگ کی خواتین کا جو کچھ ہے۔ اسی کو میں نے اس کتاب میں پیش کیا تھا۔ پھر یہ شکایت کیسی۔ بہر حال نقاد بہتر جانتے ہیں۔

۱۹۸۰ء میں جو کتاب شائع ہوئی اس کا نام "بزم آرائیاں" رکھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے بیشتر مندرجات کا مزاج بزمیہ سا ہے۔ اور ان واقعات پر جن کے گرد کہانیاں بنی گئی ہیں۔ غالب کا یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بزم آرائیاں کی بیشتر نزعی تحریریں انداز میں لکھی گئی ہیں۔ اس پر ایک لطیفہ ہو گیا ایک خاتون تشریف لائیں وہ کافی نالاں تھیں۔ کہنے لگی۔ "ہم تو سمجھتے تھے آپ ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ تو بالکل دوسرے لوگوں کی طرح سیدھی سادھی باتیں کرتے ہیں۔ بس کسی وقت ہی ہنستے یا ہنساتے ہیں۔ بزم آرائیاں پھلجھڑی کا ایک تارا ہے اور غالباً آخری تارا۔۔۔ اور اب اسٹیج سے رخصت ہونے کا وقت ہے۔

فرہنگ

صفحہ ۱۱۹۔ فرحت بخش: خوشی بخشنے والا۔ بعد از نزول: نازل ہونے کے بعد۔
صفحہ ۱۲۰۔ شاملات دہ: گاؤں کی مشترکہ زمین، جو مشترکہ مقاصد کے لیے وقف ہوتی ہے۔
ٹوہ: ٹٹول کر دیکھنا، پرکھنا۔ تیز رو: تیز رفتار۔ بیبا: بھلا مانس۔
صفحہ ۱۲۱۔ ناتمام: نامکمل۔ کڑے: سخت۔ وسوسے: اندیشے۔ خندہ پیشانی سے: مسکرا کر، خوش ہو کر۔ مروتاً: ازراہِ مروت، لحاظ کر کے۔
صفحہ ۱۲۲۔ ایما: مرضی، رضامندی۔ ولولہ خیز: جوش پیدا کرنے والا۔ تجسس: ٹوہ
تفنن: مذاق۔ ناچار: مجبوراً۔ چاشنی: مٹھاس، ذائقہ، مزا۔
صفحہ ۱۲۳۔ اشک افشاں: آنسو بہاتا ہوا، روتا ہوا، افسوس کرتا ہوا۔ عالمِ ناپائیدار: فانی دنیا۔ سرعت: تیزی۔ خوش بختی: خوش نصیبی۔
صفحہ ۱۲۴۔ تمسخر: مذاق۔ غنچہ، ناشگفتہ: نہ کھلی ہوئی کلی۔ گلپاشی: پھول برسانا، تعریف۔ سنگباری: پتھر برسانا، سخت تنقید کرنا۔ تضحیک: مذاق اڑانا۔
قریہ: گاؤں۔ فردوس: جنت۔
صمیم قلب سے: سچے دل سے، خلوص سے۔ مستجاب: قبول۔ مضمحل: کمزور۔
منفعل: شرمسار۔ نسیان: بھول جانے کا مرض۔ ظرف: حوصلہ۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

الغرض میں پھٹیچر وردی میں اندر گیا اور صدر کو زندگی کا چست ترین سلیوٹ پیش کیا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ سلیوٹ کی چستی، وردی کی سستی کی تلافی نہیں کر سکتی تھی ــــ لیکن یہ سب میرے وسوسے تھے۔ صدر ایوب کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا دماغ نہ تھا۔ خندہ پیشانی سے ملے۔ کتاب پیش کرنے کا شکریہ ادا کیا۔ مروتاً اسے ایک دو جگہ سے کھول کر دیکھا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے سوال پوچھے اور آخر میں منی سی شاباش دے کر رخصت کر دیا اور شاباش سمیت اس سارے انٹرویو پر دو منٹ لگے یا شاید اڑھائی منٹ بس۔

حوالہ متن | یہ عبارت کرنل محمد خاں کی مصنف بیتی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مصنف اپنی کتاب کی اشاعت کے بعد صدر ایوب سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کر رہا ہے۔

تشریح غرضیکہ میں اسی نکمی سی وردی میں اندر چلا گیا اور صدر کو ایسے چست انداز میں سلیوٹ کیا جیسے میں نے ساری زندگی میں کسی کو نہیں کیا تھا۔۔۔ اگرچہ مجھے علم تھا کہ میری سلیوٹ کرنے کی چستی سے میری وردی کی سستی کی تلافی ہونی ممکن نہیں۔۔۔ مگر یہ سب میرے خدشے تھے۔ صدر ایوب ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا ہی نہیں کیا کرتے تھے۔۔۔ وہ مجھے مسکرا کر ملے اور کتاب پیش کرنے کا شکریہ ادا کیا۔ از راہ مروت کتاب کو جگہ جگہ سے کھول کر دیکھا بھی اور دو تین چھوٹے چھوٹے سوال بھی کئے اور شاباش بھی دی۔ اس سارے معاملے میں بس دو ڈھائی منٹ لگے۔۔۔

(۲)

لیکن دوستوں کی تقریروں اور تمسخر کے باوجود اگر ہمیں بریگیڈیری مل جاتی تو ہم بڑے شوق سے اسے سینے سے لگاتے اور وہ تین پھولوں کی مثلث کندھوں پر سجاتے۔ مگر وہ سے پہلے ہی مرجھا گئی تھی۔ چنانچہ بریگیڈیری کے پھول ہمارے ذہن سے محو ہونے لگے اور اب ہمارے سامنے آدم جی ادبی انعام کا غنچہ ناشگفتہ لہرانے لگا۔ جس کے کھلنے کی امید میں ہم غنچے پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے اور یہ امید ایسی بے جا بھی نہ تھی۔ اُن دنوں کئی نامور ادیبوں اور نقادوں نے "بجنگ آمد" کی تعریفوں کے اس فیاضی اور فضول خرچی سے پل باندھے تھے اور ہماری خودی کو اس قدر بلند کر ڈالا تھا۔ گویا جج صاحبان ہم سے خود پوچھنے آئیں گے: محمد خاں! بتا تیری رضا کیا ہے؟

حوالۂ متن یہ عبارت کرنل محمد خاں کی "مصنف کی آپ بیتی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مصنف (جو کرنل بھی ہیں) بریگیڈیئر نہ بن سکنے کا ذکر کرتے ہیں اور کتاب پر آدم جی انعام کی آس لگائے ہوئے ہیں۔

تشریح یار دوستوں کی تقریروں اور مذاق کے باوجود اگر ہم بریگیڈیر بن بھی جاتے اور ہم شوق سے سینے پر نشان لگا لیتے اور کندھوں پر تین پھولوں کی تکون بھی سجا لیتے، مگر ہوا یہ کہ ہم بریگیڈیر بن ہی نہ پائے۔ چنانچہ بریگیڈیری کے پھول تو ہمارے ذہن میں ایسے کامیاب جوکروں کی تعریف تو کرتا ہوں۔ میں خود ان میں سے نہیں بلکہ میں تو مختصر اخ لگا رہا نہیں، بس سچا سا ہوں۔

ے نکلنا شروع ہو گئے۔ ان کی بجائے ہمارے سامنے آدم جی ادبی انعام کی کلی (جو ابھی کھلی نہیں تھی) لہرانے لگی۔ جس کے کھلنے کی امید میں ہم کلی پر نظر جما کر بیٹھ گئے یعنی آدم جی انعام کی آس لگائی اور یہ آس کوئی بے جا بھی نہیں تھی۔ ان دنوں کئی مشہور ادیبوں اور نقادوں نے "بجنگ آمد" کی اتنی کھل کر تعریف کی اور ہماری خودی کو اتنا بلند کر دیا کہ ہم سوچنے لگے کہ جج صاحبان خود آ کر انعام پیش کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیا منظور ہے؟

(۳)

"بزم آرائیاں" کی بیشتر تحریریں تفریحی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان تحریروں سے آپ کے چہرے پر نہ سہی، آپ کے ذہن میں ایک روشنی کی کرن پھوٹ پڑے۔ ایک فرحت کی کرن! اور یہ ہو جائے تو ہمیں اپنی پیٹھ تھپکنے کا حق ہو گا ___ اور اگر یہ کرن نہ پھوٹے تو پھر آپ اپنی پیٹھ تھپکالیں۔ ایک خاتون تشریف لائیں ___ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اٹھیں تو تقریباً نالاں سی تھیں۔ وجہ ملال پوچھی تو فرمایا: "کرنل صاحب ہم تو سمجھتے تھے آپ ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ تو بالکل دوسرے لوگوں کی طرح سیدھی سادی باتیں کرتے ہیں۔ بس کسی وقت ہی ہنستے یا ہنساتے ہیں ___" اور پھر ایک واضح سی سسکی لی! ___ ہنسنا ہنسانا تو مخاطب کی کیمسٹری یا ظرف پر منحصر ہے۔ لیکن ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونا یا کرنا مزاح نگار کا کام نہیں جوکر کا کام ہے۔ میں ایسے باکمال جوکروں کا مداح ضرور ہوں مگر بدقسمتی سے ان میں سے ایک نہیں ہوں۔ بلکہ میں تو اتنا پکا مزاح نگار بھی نہیں ہوں، کچا سا ہوں۔

حوالۂ متن یہ عبارت کرنل محمد خاں کی مصنف "بیتی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مصنف اپنی کتاب کے حوالے سے کچھ باتیں کر رہا ہے۔ انداز مزاحیہ ہے۔

تشریح "بزم آرائیاں" کی اکثر تحریریں مزاحیہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان تحریروں سے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آئے۔ مگر ان کے مطالعے سے آپ کے ذہن میں روشنی اور خوشی کی کوئی کرن پھوٹ سکے ___ اگر ایسا ہو جائے تو ہم تعریف کے بجا طور پر حقدار ٹھہرتے ہیں ___ اگر ایسا نہ ہو تو آپ اپنی تعریف کریں ___ ایک خاتون میرے پاس آئیں ___ کچھ دیر قیام کے بعد بیزار سی ہو کر اٹھیں ___ میں نے رنج کی وجہ پوچھی تو کہا: "کرنل صاحب ہم تو سمجھتے تھے آپ کی تحریر بے ساختہ ہنسا دیتی ہے۔ مگر آپ تو عام لوگوں کی طرح سیدھی سادی باتیں کرتے ہیں بس کبھی کبھار ہنسا دیتے ہیں ___" اور پھر صاف سنائی دینے والی سسکی بھری ___ ہنسنا ہنسانا تو اصل میں مخاطب کے اپنے حوصلے پر منحصر ہے۔ لیکن خواہ مخواہ ہنسانا مزاح نگار کا نہیں جوکر کا کام ہے۔

پطرس بُخاری

خلاصہ

سفر نامۂ پطرس

(I)

"بمبئی پہنچنے پر کمپنی کی طرف سے ڈاکٹری معائنہ کا نوٹس ملا۔ یہ معائنہ جہازوں کے قوانین کے مطابق ہر جہاز کی روانگی سے پیشتر ضروری ہوتا ہے۔ اس کی کیفیت یوں ہے جو زندہ ہو اس کو سفر کرنے کی اجازت ہے اور جس کی نبض بند ہو جائے اسے سفر کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ خیر اس کاروائی کے بعد جہاز پر سوار ہو کر عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ چار آدمیوں نے مل کر ٹیکسی لی اور عدن اور گرد و نواح کی سیر کی۔ یہاں سے ستمبر ۱۹۲۶ء کو روانہ ہوئے کل دوپہر سویز پہنچ جائیں گے اور پرسوں پورٹ سعید۔۔۔۔"

(۲)

ہمارا جہاز دن کے دس بجے پورٹ سعید پہنچا یہاں کی عمارات مغرب کی تقلید میں خوبصورت بنائی گئی ہیں۔ یہاں کے بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ قہوہ خانوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہاں کے دکاندار حسبِ روایت خوشامد بھی کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بے نیازی کا اظہار کریں تو فحش گالیوں سے نوازتے ہیں۔ یہاں سے وینس پہنچے۔ وینس ایک معجزہ، طلسم اور ایک رومان انگیز خواب ہے۔ یہاں کے لوگ خوش و خرم اور حسین ہیں اور یہاں کی عورتیں نہایت خوبصورت، خوش ذوق، خوش سلیقہ۔ مرد با اخلاق اور خوبصورت ہیں۔ وینس کی نہریں اس قدر خوبصورت ہیں کہ یہیں مرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں دن بھر (وینس کے ایک مشہور چرک) پراسین مارکو میں کھڑا اپنی آنکھوں کی ساتی گری کرتا رہا اور رات کو گرینڈ کنال کے کنارے جیسے نشے میں جھومتا رہا تھا۔ ایک دن پورا سینٹ مارک کا گرجا اور اکاڈیمیا دیکھنے میں گزارا۔ یہاں کے عجائبات اس قدر خوبصورت ہیں کہ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ آخر جو صدر کرکے وینس کو خیر باد کہا۔ فرانس پہنچے تو یہاں

کے لوگوں میں ایک خوبی دیکھی کہ وہ ٹرین میں ہمسفر لوگوں کی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود سلسلہ کلام شروع کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر اپنائیت بھرے انداز میں دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس یورپ کے لوگ ناک چڑھے اور مغرور ہوتے ہیں۔ فرانس سے لندن پہنچا۔ یہاں کے بازاروں میں لاکھوں موٹریں، ٹرامیں، بسیں اور گاڑیاں بے تحاشا بھاگی جاتی ہیں کہ دماغ کو فرصت نہیں ملتی۔ لہٰذا لندن جیسا شہر مجھ جیسے آدمی کو موہ نہ سکا۔ ہائے وینس کی کیا بات ہے۔

۳

لندن سے انگلستان پہنچا میں یہاں نو وارد تھا۔ اس لیے ہر چیز کو متحیر انداز میں دیکھتا چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کیے دیتی تھیں۔ انگریزوں خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ کی سمجھ نہ آئی تھی۔ اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں مصروف ہوں اور جس انداز میں یہاں کی طرز زندگی کو اپنایا ہے خود متحیر ہوں۔ انگریز دوستوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ہندوستان جیسا خلوص اور محبت ناپید ہے۔ کیمبرج آکسفورڈ کے مقابلے میں زیادہ قدامت پرست ہے۔ یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں۔ لیکن وہاں کی طالبات کو جو یونیورسٹی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ انہیں ڈگری نہیں ملتی اور نہ ہی وہ یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود کافی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اگر لیکچر میں کوئی لڑکی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آجاتی ہے۔ ایک تلخ تجربے کے بعد میں ایک فالتو پنسل ضرور پاس رکھتا ہوں۔

یہ کیمبرج یونیورسٹی ہے جہاں ہم سے پہلے جان ہارورڈ، آلیور کرام ویل، کولرج، سیموئیل بٹلر، بیکن، ٹینی سن، ٹھیکرے، میکالے، نیوٹن، لارڈ چیسٹرفیلڈ، مارلو، ولیم پٹ، گرے اور ملٹن کسبِ فیض حاصل کر چکے ہیں اور جہاں انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر اس وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا پھول کیا اہمیت رکھتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ عزت سے رکھے اور عزت سے وطن کو واپس لے جائے ...... دو سال بعد

میرے مولا بلا لے مدینے مجھے

فرہنگ

صفحہ ۱۲۶ا۔ چہل قدمی کرنا: ٹہلنا۔ ہر فرد و بشر: ہر شخص۔
صفحہ ۱۲۷ا۔ متقدمین: پہلے لوگ۔ ناپید ہو جانا: ختم ہو جانا۔ خوش وضع: خوبصورت۔
صفحہ ۱۲۸ا۔ ترنگ: جوش، امنگ۔ مترادف: ہم معنی۔ شادکام: خوش۔
صفحہ ۱۲۹ا۔ شاہد: گواہ۔ نووارد: نیا آیا ہوا۔ متحیر: حیران۔
صفحہ ۱۳۰ا۔ منہمک: مصروف، محو۔ خوش گفتاری: ہنسی مذاق کی باتیں، تفریح کی باتیں۔
پھبتیاں: مذاق، مضحکہ اڑانے والی باتیں۔ قدامت پرست: پرانے خیال کے لوگ۔
طوعاً و کرہاً: مجبوراً، چاروناچار۔
صفحہ ۱۳۱ا۔ کسب فیض کرنا: فیض یاب ہونا، استفادہ کرنا۔ دل دادہ: شوقین، عاشق۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

خیر جہاز پر سوار ہوئے۔ اب جہاز کی کیفیت یہ ہے کہ ہر فرد و بشر کرسی بچھائے جہاز پر بیٹھا ہے اور سمندر کو دیکھ رہا ہے۔ چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل میں کچھ کہہ رہے ہیں، "اچھا! تو گویا یہ سمندر ہے ___ تو گویا اب ہم سمندر میں ہیں بھئی بہت اچھے ___" جو دوست ہیں وہ ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں اور ابھی سے وینس، لندن اور ایڈنبرا کے متعلق نہایت واقف کارانہ انداز اور بے پروائی کے لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں ___

حوالۂ متن یہ عبارت پطرس بخاری کے "سفرنامہ پطرس" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق پطرس بخاری ممالکِ غیر کا سفرنامہ لکھ رہے ہیں۔ وہ سفر کا حال آغاز سے بیان کرتے ہیں۔

تشریح خیر، ہم جہاز پر سوار ہو گئے اب جہاز کی حالت یہ ہے کہ ہر شخص کرسی بچھائے بیٹھا ہوا ہے اور سمندر کو تک رہا ہے ___ یوں لگتا ہے جیسے سب نے پہلی بار سمندر کا نظارہ کیا ہے اور دل ہی دل میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں ___ "اچھا تو یہ سمندر ہے ___ اچھا تو اس وقت ہم سمندر میں ہیں ___ بہت خوب ___" ___ جو مسافر باہم دوست ہیں وہ ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہیں اور ابھی سے وینس، لندن اور ایڈنبرا کے بارے میں بڑی بے پروائی کے سے انداز میں پرانے واقف کاروں کی طرح باتیں کر رہے ہیں۔

(۲)

انگلستان میں نو وارد تھا (تو) ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیر اور بدحواس سا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کیے دیتی تھیں اور بسا اوقات انگریزی کی خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سیکھنے کا بے حد مشتاق تھا لیکن کوئی سکھانے والا نہ ملتا تھا، سوائے اُن چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں مقیم ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا لیکن اُن کے رویے میں ایک تصنع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک کھوکھلاہٹ پائی جاتی تھی، جس سے میں کوسوں دور بھاگتا ہوں۔

حوالۂ متن یہ عبارت پطرس بخاری کے "سفرنامۂ پطرس" سے لی گئی ہے ـــــ یہ سفرنامہ پطرس بخاری کے تین طویل خطوں سے مرتب کیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۹۲۶ء میں امتیاز علی تاج کو لکھے۔

سیاق و سباق مصنف انگلستان میں نیا نیا پہنچا ہے ـــــ تو وہاں کے تاثرات بیان کرتا ہے۔

تشریح میں انگلستان میں نیا نیا ہی آیا تھا۔ اس لیے ہر شے ظاہری طور پر تو بڑی سنجیدگی سے دیکھتا تھا مگر اندر سے گنواروں کی طرح حیران اور بدحواس ہو رہا تھا اور معمولی معمولی باتوں سے خواہ مخواہ رُعب میں آ رہا تھا ـــــ کئی بار مجھے انگریزی کی اور بالخصوص کیمبرج کی روزمرہ زبان کی سمجھ نہیں آتی تھی ـــــ میں سیکھنا چاہتا تھا۔ مگر سوائے چند پرانے ہندوستانی واقفوں کے کوئی سکھانے والا ہی نہ ملتا تھا۔ ان پرانے واقفوں کو انگلستان میں رہتے ہوئے مدت گزر چکی تھی اس لیے وہ سکھا سکتے تھے مگر ان کے رویے میں بناوٹ، تکبر اور کھوکھلا پن صاف نظر آتا تھا۔ جس سے مجھے سخت نفرت ہے۔

(۳)

یورپ کی ٹرین میں انگریز آدمی دور سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ پائپ منہ میں ٹھونسے، ٹرین کے ایک کونے میں بیٹھا، ماتھے پر تیوری چڑھائے "ٹائمز" کے اشتہاروں کا مطالعہ کر رہا ہے۔ آپ نے کسی موقعہ پر "ایکس کیوزمی" کہا تو انہوں نے اپنی بھنویں ذرا اونچی کیں ـــــ آپ کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر مطالعے میں مصروف ہو گئے ـــــ خدا شاہد ہے کہ اطالیہ، سوئٹزرلینڈ اور فرانس دیکھنے کے بعد انگریز کو منہ لگانے کو دل نہیں چاہتا۔

حوالۂ متن یہ اقتباس پطرس بخاری کے "سفرنامۂ پطرس" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق مصنف یورپ کے سفر کے دوران کے مشاہدات بیان کرتا ہے ـــــ وہ انگریزوں کی حالت بیان کر رہا ہے اور دوسرے یورپی ممالک کے باشندوں سے ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔

تشریح یورپی ریل گاڑیوں میں انگریز آدمی دور ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ پائپ منہ میں دبائے گاڑی کے ڈبے کے ایک گوشے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہوگا۔ اس کے ماتھے پر بل ہوں گے۔ گویا ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ جیسے کسی سے بات کرنے کا خواہاں نہیں۔ آپ نے کسی موقع پر "معاف کیجئے" کہہ دیا تو ذرا بھنویں اونچی کرے گا۔ آپ کی طرف ایک نظر دوڑائے گا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہو جائے گا۔ خدا جانتا ہے کہ جب سے میں نے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس دیکھا ہے، میرے دل میں انگریزوں سے میل جول رکھنے کی خواہش ہی نہیں رہی۔

(۴)

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے۔ اُس پر میں خود حیران ہوں ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے پندرھواں دن ہے۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے۔ دل و دماغ نے اپنے لیے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پوری اُترنے کے لیے وقف ہے ــــ لیکن وہ ہندوستان کی صحبتیں کہاں ــــ وہ خوش گفتاری، وہ شعر بازی، وہ پھبتیاں، روٹھنا۔ ومنانا وقت ــــ اپنے گھر کا غلام، موقع و محل، خانہ زاد ــــ ایک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے۔ خیر ان باتوں کو کچھ عرصے کے لیے بھلانا ہوگا۔

حوالۂ متن یہ عبارت پطرس بخاری کے "سفر نامۂ پطرس" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق یورپ کے سفر کے دوران کے مشاہدات بیان کرتے ہوئے مصنف اپنے قیام کیمبرج کا ذکر کرتا ہے۔

تشریح اب میری حالت یہ ہے کہ میں کیمبرج کی علمی، ادبی اور سماجی مصروفیات میں کھویا ہوا ہوں اور جس قدر آسانی سے اور جتنے سلیقے کے ساتھ میں نے یہاں کی زندگی اپنائی ہے میں خود اس پر حیران ہو رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ ہندوستان سے تعلق کٹ رہا ہے ــــ یہاں تک کہ آج پندرہ روز ہو گئے ہیں۔ میں نے کسی ہندوستانی سے بات تک نہیں کی۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز بڑھ رہا ہے اور وقت گزارنے کا ایک انداز اپنے ہی آپ بنتا چلا جا رہا ہے۔ میرے دل و دماغ نے اپنے لیے ایک معیار مقرر کر لیا ہے اور ہر کام کے دوران اس متعین معیار پر پورا اُترنے کی کوشش کرتا ہوں ــــ مگر ــــ وہ ہندوستان کی مجلسیں کہاں! ــــ وہ گپ شپ، وہ شعر بازی، وہ ہنسی مذاق، وہ ایک دوسرے سے روٹھ روٹھ جانا اور پھر ایک دوسرے کو منانا۔ کیا زمانہ تھا ــــ وقت ہمارے تابع تھا ــــ

ہر موقع و مقام ہمارے ماتحت ـــــ یہ سوچ سوچ کر دل سے آہ نکلتی ہے ـــــ خیر ان باتوں کو بھلانے میں وقت لگے گا۔

(۵)

ایک دن شام کے بعد ہم وینس پہنچے اور وہاں جہاز کو الوداع کہا۔ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے۔ ایک رومان انگیز خواب ہے۔ اطالوی آتشیں شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے جو مجھے عمر بھر نہیں بھولے گی۔ تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں اور دنیا بھر کا لٹریچر یہاں کی دلکشی کا سماں نہیں باندھ سکتا۔ عورتیں نہایت حسین، خوش ذوق، خوش سلیقہ، مرد از حد با اخلاق، خوبصورت ـــــ اخلاق کا یہ حال ہے کہ سارا دن آپ کے کانوں میں پیرمیساں، پیرمیساں (PERMISSION) کی آواز آتی رہے گی جو انگریزی کے ایکس کیوزمی کے مترادف ہے۔ لیکن جس لہجے، جس لوچ اور جس تبسم کے ساتھ کہا جاتا ہے وہ قوم انگلش کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا۔

حوالۂ متن یہ عبارت پطرس بخاری کے "سفرنامۂ پطرس" سے لی گئی ہے جو دراصل پطرس کے خطوں پر مشتمل ہے جو انہوں نے امتیاز علی تاج کو لکھے۔

سیاق و سباق اپنے یورپی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ وینس کا حال بیان کر رہا ہے۔

تشریح ایک دن شام کے بعد ہم وینس پہنچے اور جہاز کو آخری سلام کیا۔ وینس کیا ہے ایک معجزہ سے کم نہیں، ایک جادو ہے، ایک رومان پرور خواب ہے۔ اٹلی کے شراب کے نشے کی اپنی ہی موج ہے جو ساری زندگی نہ بھلا سکوں گا۔ تصویریں اس کے حسن کو ظاہر نہیں کر سکتیں۔ اس لیے وہ اس کی داد کیا دیں گی۔ دنیا بھر کا ادب وینس کی خوبصورتی بیان نہیں کر سکتا ـــ یہاں کی عورتیں نہایت خوبصورت، خوش خلق اور خوش سلیقہ ہیں ـــ مرد بہت با اخلاق بھی ہیں اور خوبصورت بھی ـــ ان کے اخلاق کا یہ حال ہے کہ سارا سارا دن آپ کے کانوں میں معاف کیجئے، معاف کیجئے کی آوازیں آتی رہیں گی۔ لیکن جس لہجے، نرمی اور مسکراہٹ کے ساتھ وہ پرمیاں (معاف کیجئے) کہتے ہیں انگریز قوم کو ایکس کیوزمی کہنے کا یہ انداز زندگی بھر نصیب نہیں ہوگا ـــــ پرمیساں، ایکس کیوزمی یا معاف کیجیے کا ہم معنی لفظ ہے۔

جمیل الدین عالی

یہ نیویارک ہے

نیویارک کی آبادی تقریباً اسی لاکھ سے زائد ہے۔ اس میں اونچی اونچی عمارات، عجائب گھر، نائٹ کلب، کتب خانے، سینما، جرائم پیشہ لڑکیاں، افسانوی کردار اور اقوام متحدہ ہے۔ مجھے یہاں صرف چھ سو ڈالر ماہانہ میں گزارہ کرنا ہے۔ آغا اشرف کو میں نے زیورک سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ لہٰذا انہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا اور ہم دونوں یو این کے سیکرٹریٹ کی انتالیس منزلہ عمارت کی چوتھی منزل پر واقع ریستوران میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ یہ ریستوران بہت بڑے ہال کی مانند ہے۔ اس کی دیواریں شیشے سے بنی ہیں۔ سامنے دریا بہتا ہے اور یہ منظر شیشے کی دیواروں میں سے صاف نظر آتا ہے۔

اس عمارت کے ساتھ سفید گنبد کی عمارت ہے۔ اس میں اقوام متحدہ کا اجلاس ہوتا ہے آغا اشرف نے میرا ایک میری نامی شریر لڑکی سے تعارف کرواتے ہوئے اسے یو۔ این۔ او کی عمارت دکھانے کو کہا۔ اس نے کہا کہ یہ یو۔ این کا سیکرٹریٹ ہے۔ انتالیس منزلہ یہ عمارت مکمل ائیر کنڈیشنڈ ہے۔ میں جب میری کے ساتھ اس عمارت میں پہنچا تو خود کو ایک عظیم، خاموش، باوقار اور قالینوں سے مزین برآمدے میں پایا جہاں سے یو۔ این کے تمام عظیم کمرے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جنرل اسمبلی ہے۔ جہاں ہر سال ساری دنیا کے بقراط جمع ہو کر فضول اور کبھی کبھی کام کی باتیں کرتے ہیں۔ اس وقت ہال بالکل خالی تھا۔ میں نے میری کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ ادارہ ستر کروڑ چینیوں کے بغیر کیسے کام کر سکتا ہے۔ میری کہنے لگی تم سب ایشیائی پیدائشی فلسفے باز ہوتے ہو۔ مسٹر ونڈر فل"۔ چونکہ میں ہر چیز کو دیکھنے کے بعد کہتا تھا "ونڈر فل"۔ اس لیے میری نے میرا نام ونڈر فل رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد میری نے بتایا کہ یہ سلامتی کونسل کا دفتر ہے۔ نعل نما میز کے بعد گرد سند رہین بیٹھتے ہیں۔ وہاں مبصرین، ناقدین، صحافی اور دیگر بقراط بیٹھتے تھے۔ سیکورٹی کونسل کا ہال بھی اس وقت مکمل طور پر خالی تھا۔ میری نے بتایا کہ اس کونسل کے سات رکن ہوتے

ہیں۔ جن میں سے پانچ تو مستقل ممبر ہیں۔ یعنی جنہیں "ویٹو" کا حق حاصل ہے اور باقی دو دوسرے ملکوں سے لیے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں ویٹو کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس پر ایک دم میری کو کوئی بات یاد آ گئیں اور کہنے لگی کہ تمہارے ملک کے ایک بڑے ذہین آدمی تھے جن کا نام بخاری صاحب تھا۔ وہ یو۔این۔او کے اعلیٰ اور اولین عہدیداروں میں سے تھے اور یہ ویٹو پاور کے زبردست مخالفین میں شامل تھے۔ میری بات سن کر میرا دل بھی ایک دم بخاری صاحب کی یاد میں مچل اٹھا اور میں دوڑا دوڑا اشرف صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں کہا کہ میرا دل بخاری صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کو بے چین ہے۔ آغا صاحب نے کہا کہ اگرچہ ان کا مزار یہاں سے کافی دور ہے۔ لیکن پھر بھی میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا۔ کیونکہ وہ میرے استاد تھے اور مجھے بھی ان سے عقیدت ہے۔ لہذا میں اسی وقت تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

فرہنگ

صفحہ ۱۳۲۔ خوش گفتار: اچھی گفتگو کرنے والے۔ مجلس آراء: محفلیں سجانے والے۔

صفحہ ۱۳۳۔ ناقابلِ اتباع: ناقابلِ اطاعت، ناقابلِ تقلید۔ فرُدٹ: تیز، سرپٹ، انگریزی لفظ FORWARD کی اردو شکل۔

صفحہ ۱۳۴۔ دوبالا: دوگنا۔ استعجاب: حیرت۔ عالم کیفیت۔

صفحہ ۱۳۵۔ مراقبہ: غور فکر، سوچ بچار، گردن جھکا کر فکر کرنا، سب کچھ چھوڑ کر خدا کا دھیان کرنا۔ بقراط: مراد ہے نام نہاد دانشور، اُتھلا پن۔

صفحہ ۱۳۶۔ مندوب: نمائندہ۔ حقِ استرداد: رد کر دینے کا اختیار جسے عرفِ عام میں ویٹو کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۳۷۔ لمحۂ فکریہ: سوچ بچار کا لمحہ۔ لاج: شرم۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

تو جناب یہ یو۔این کا سیکرٹریٹ ہے۔ اُنتالیس منزل کی عمارت جو ائیر کنڈیشنڈ ہے — یہ چکنا فرش، یہ تیز رفتار لفٹ، یہ شیشے کی دیواریں، یہ بارعب، خاموش ماحول — ونڈرفل، میں ہر بات پر ہر جگہ کہتا ہوں — میری نے میرا نام ہی ونڈرفل رکھ دیا ہے

____ وہ مجھے پہلے تیسری منزل پر لائی۔ وہاں سے ایک طویل برآمدے میں سے گزارتی ہوئی ایک بھول بھلیاں میں لے گئی، جس نے سکرٹریٹ اور اقوامِ متحدہ کی عمارت کو ملا رکھا ہے۔ اب میں اس کا نقشہ کیا بتاؤں، بس یوں سمجھئے کہ آن کی آن میں اس عمارت سے اقوامِ متحدہ کی عمارت میں پہنچ کر میں اپنے آپ کو ایک خاموش، باوقار اور قالینوں سے پٹے ہوئے برآمدے میں پاتا ہوں۔ اس برآمدے میں سے آپ یو۔این کے تمام 'عظیم' کمرے دیکھ سکتے ہیں۔

حوالۂ متن یہ اقتباس جمیل الدین عالی کے سفرنامہ "یہ نیویارک ہے" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق مصنف سفرِ امریکہ کے دوران نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے دفاتر بھی جاتا ہے اور ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و آراء بھی دینا چاہتا ہے۔

تشریح یہ اقوامِ متحدہ کا سیکرٹریٹ ہے، یہ عمارت انتالیس منزلوں کی ہے اور ساری کی ساری ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ اس کا چکنا فرش اور تیز رفتار لفٹ، شیشے کی دیواریں اور بارعب اور خاموش ماحول اتنا دلفریب ہے کہ انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے "بہت خوب!" ____ میں تو جگہ جگہ "بہت خوب!" کہتا ہوں، اس لیے میری نے میرا نام ہی یہی رکھ چھوڑا ہے ____ وہ پہلے مجھے تیسری منزل پر لائی۔ وہاں سے ایک لمبے سے برآمدے میں سے گزار کے بھول بھلیوں میں لے گئی جو اقوامِ متحدہ کی عمارت اور سکرٹریٹ کو ملاتی ہیں ____ میں اس کی صورت کی وضاحت کرنا چاہوں تو کر نہ پاؤں ____ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بس لمحوں میں ہی میں اس عمارت سے اقوامِ متحدہ کی عمارت میں پہنچ گیا ____ وہاں جب پہنچا تو میں نے اپنے آپ کو ایک خاموش باوقار اور قالینوں سے آراستہ برآمدے میں پایا ____ اس برآمدے میں سے اقوامِ متحدہ کے تمام بڑے بڑے شاندار کمرے دکھائی دیتے ہیں۔

(۲)

یہ جنرل اسمبلی ہے، جہاں ہر سال، ساری قوموں کے بقراط جمع ہو کر زیادہ تر فضول اور کبھی کبھی کام کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ بڑا وسیع ہال، ہزاروں کرسیاں، کرسیوں کے آگے ڈیسک اور ڈیسکوں پر کان میں لگانے والے آلے جن کے ذریعے آپ اپنی پسند کی پانچ زبانوں میں سے کوئی سی زبان سن سکتے ہیں۔ اس وقت جنرل اسمبلی نہیں ہو رہی تھی۔ ہال خالی تھا اور اس میں ہلکا ہلکا اندھیرا بھی تھا۔ اس ہال میں کھڑے ہو کر میں نے چند منٹ مراقبہ کیا۔ مگر دنیا میرے سامنے

نہ آئی ہے ——— میں نے بہت چاہا کہ آنکھیں ایک دم اس کرّے کی ساری آبادی کو اس ہال میں جمع دیکھ لیں اور بہت سی سفید کالی، نیلی پیلی، بھوری اقوام، دوڑ دوڑ کر اس کے کونوں کھدروں میں بھر بھی گئیں، مگر ہال پھر خالی نظر آیا۔ دور افق پر ستر کروڑ چینی اپنی دنیا الگ بنائے ہوئے معلوم ہوئے۔ اب مجھے اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اس ہال کے اُتھلے پن پر ہنسی آئی۔

حوالۂ متن یہ عبارت جمیل الدین عالی کی تحریر " یہ نیویارک ہے " سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مصنف اقوامِ متحدہ کے سیکرٹریٹ اور دفاتر کا ذکر کر رہا ہے۔

تشریح یہ جنرل اسمبلی ہے۔ یہاں ہر سال اقوامِ عالم کے بڑے بڑے دانشور جمع ہوتے ہیں اور اکثر دبیشتر بے مقصد اور کبھی کبھی بامقصد باتیں کرتے ہیں۔ یہ بڑا کھلا ہال ہے جس میں ہزاروں کرسیاں، ان کے آگے ڈیسک اور ڈیسکوں پر سننے والے آلے لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعے آپ پانچ زبانوں میں سے اپنی پسند کی کسی بھی زبان میں سُن سکتے ہیں۔ اس وقت جنرل اسمبلی کا اجلاس نہیں ہو رہا۔ ہال خالی اور تاریک تھا۔ میں نے اپنے اندر جھانکا مگر دنیا میرے سامنے نہ آئی۔ میں نے خیال ہی خیال میں پوری دنیا کے لوگوں کو اس ہال میں دیکھنا چاہا۔ بہت سی سفید، کالی، پیلی اور بھوری قومیں جمع ہو ہی گئیں۔ مگر صرف کونے کھدرے ہی بھر سکے، ہال پھر خالی کا خالی تھا ——— دور حدِ نظر پر ستر کروڑ چینی اپنی الگ دنیا بنائے ہوئے دکھائی دیئے۔ اب مجھے اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہال کی گہرائی تو کم ہے، تب مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

(۳)

ان سب کو، بڑے سے بڑے ملک کے معاملے میں انفرادی طور پر "ویٹو" کا حق ملا ہوا ہے فرض کیجئے ہندوستان، چین، پاکستان، یعنی کوئی ایک سو تین کروڑ انسانوں کا کوئی سنگین معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش ہے اور امریکہ، روس، فرانس، تینوں ایک رائے پر متفق ہیں لیکن صرف برطانیہ متفق نہیں تو وہ اپنا حقِ استرداد استعمال کر سکتا ہے یعنی آٹھ کروڑ عوام کا ایک ملک نہ صرف ایک سو تیس کروڑ آدمیوں پر بھاری ہے بلکہ اپنے ساتھیوں کوئی چھیالیس کروڑ انسانوں کی نمائندگی کرنے والے اور حقِ استرداد رکھنے والے ملکوں پر بھی بھاری ہے ——— کشمیر کے معاملے میں کئی بار حفاظتی کونسل کے جملہ اراکین ایک رائے پر متفق ہو گئے ——— مگر

اکیلے روس نے ویٹو کر دیا — ویٹو، حق استرداد، پانچ ملکوں کا حق استرداد، جو پوری دنیا کی آبادی کے جمہوری حقوق سے زیادہ وزنی ہے۔ جمہوریت کے لیے لمحہ فکریہ!

حوالۂ متن یہ عبارت جمیل الدین عالی کے سفرنامہ "یہ نیویارک ہے" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مصنف اقوامِ متحدہ کے دفاتر کا ذکر کرتا ہے اور اپنے تاثرات بھی بیان کرتا ہے۔

تشریح ان سب کو بڑے سے بڑے ملک کے معاملے میں بھی اپنی ذاتی حیثیت میں "ویٹو" کا حق حاصل ہے۔ فرض کریں ہندوستان، چین، پاکستان یعنی لگ بھگ ایک سو تیس کروڑ انسانوں کا کوئی مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش ہوا اور امریکہ، روس اور فرانس کی ایک متفقہ رائے ہو مگر صرف برطانیہ اتفاق نہ کرے تو وہ اپنا ویٹو یعنی رد کر دینے کا حق استعمال کر سکتا ہے یعنی آٹھ کروڑ انسانوں کا ایک ملک نہ صرف ایک سو تیس کروڑ انسانوں سے زیادہ اہم ہے بلکہ کوئی چھیاسی کروڑ انسانوں کی نمائندگی کرنے والے اپنے ساتھیوں اور ویٹو کا حق رکھنے والے ملکوں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کشمیر کے مسئلہ پر کئی دفعہ حفاظتی کونسل کے سب رکن متفق ہو گئے مگر روس نے ویٹو کر دیا۔ ویٹو یعنی رد کر دینے کا حق پوری دنیا کی آبادی کے جمہوری حقوق سے بھی زیادہ اہم ہے — جمہوریت کے لیے سوچنے کا مقام ہے۔

اختر ریاض الدین

خلاصہ

لندن سے ملاقاتیں

میں لندن تین مرتبہ گئی۔ پہلی مرتبہ سیاح کی حیثیت سے، دوسری بار بحیثیت ایک شہری کے اور تیسری مرتبہ بحیثیت ایک عاشق دیرینہ کے۔ پہلی مرتبہ میں گیارہ سال قبل آٹھ دن کے لیے گئی۔ ان دنوں میری چوتھائی سسرال بھی لندن آچکی تھی۔ میں نے اپنا زیادہ وقت سسرال والوں سے الگ اپنی تین ہمسفروں کے ہمراہ موٹر میں لندن کے اہم مقامات دیکھنے میں گزارا۔ پھر میں نے قتل وغارت گری پر مبنی شکسپیر کا ایک گمنام ڈرامہ ٹائٹس اینڈر اینڈرونی کس دیکھا جس پر میری ہمسفروں نے مجھے لعن طعن کر کے پیسوں کی واپسی کا تقاضا کر دیا جب کہ میری سسرالی رشتہ دار زیادہ وقت کھانا پکانے میں گزارنے لگیں۔

دوسری مرتبہ ۱۹۶۰ء میں اپنے شوہر میاں ریاض الدین کے ساتھ گئی۔ جنہیں امپریل ڈیفنس کالج کی جانب سے کورس کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ سال میری زندگی کا یادگار سال ہے۔ ہم نے لندن کے دل "ماربل آرچ" میں ایک فلیٹ لیا۔ اس کی پشت پر سارا ہائیڈ پارک بائیں بازو میں آکسفورڈ سٹریٹ ہے جس کی دکانیں دیکھ دیکھ کر نیت بھر گئی۔ یہ فضول خرچی سے بچنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ ہمارے ایک فرانسیسی دوست کی بیوی نے اپنے میاں کے ٹکٹ پر مجھے مدعو کر کے پھولوں کی نمائش دکھائی۔ اس نمائش گاہ میں دنیا بھر کے پھولوں کی نمائش کی گئی تھی۔ سویٹ پیز کی تینتیس قسمیں اور گلاب کی ایک سو پندرہ، کاسنی اور سیاہ فام گلاب میں نے پہلی دفعہ دیکھے۔ ایک شام کو ہمیں لارڈ چانسلر کی جانب سے دعوت نامہ ملا کر ملکہ معظمہ نے ساڑھے چار بجے پارٹی پر یاد فرمایا ہے جب ہم بکھنگم پیلس پہنچے وہاں پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مہمان جوق در جوق ملکہ کی زیارت کے لیے آرہے تھے۔ کیونکہ جوان ملکہ ابھی زچگی سے اٹھی تھیں۔ ملکہ آئیں تو ان کے بے آب و رنگ چہرے کو دیکھ کر سارا تصور ٹوٹ گیا اور سخت مایوسی ہوئی۔

ڈیفنس کالج میں پینسٹھ جوڑے تھے۔ جو ایک دوسرے کو ملنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے۔ ہفتے میں چار دن باہر کھانا کھاتے اور ساتویں دن خود ڈنر دینا پڑتا۔ کالج کے انگریز جوڑے عموماً لندن سے باہر اپنے دیہی گھروں اور باغوں میں مدعو کرتے تھے۔ انگریزوں کو باغبانی سے عشق ہے۔ دفاتر سے تھکے ہارے لوٹنے کے باوجود وہ باڑیں کاٹنا اور بیج بونا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈیفنس کالج میں کسی قسم کے امتحان یا کسی قسم کی پابندی نہیں بلکہ فرسٹ ضیافت ہے۔ ہم ہفتے اور اتوار کو ملا کر کبھی کہیں چلے جاتے۔ اور کبھی کہیں بہرحال یہ سارا سال میرے لیے نیک شگون تھا۔

تیسری مرتبہ میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں لندن گئی۔ اس دفعہ بھی لندن تو وہی تھا۔ لیکن میرا دل وہ نہیں رہا تھا بلکہ اپنی جنگ نے میرے دل و دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ اب میں اپنی ایک مخلص سہیلی کے ہاں ٹھہری۔ ٹیلی ویژن کے "پنوراما" نے ساری جنگ لاہور سے سیالکوٹ اور اکھنور تک دکھائی۔ لیکن ہندوستان کے ایک بھی محاذ پر اسے جانے کی اجازت نہ ملی۔ کامن ویلتھ سوسائٹی کی مجلس میں لندن میں مقیم پاکستانی طلبہ اور مسلمانوں نے دریادلی سے چندہ دیا۔ میرا اس زمانے میں کھانا کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ کچھ ہضم ہی نہ ہوتا تھا بہرحال اس خوف سے کہ لاہور کو کچھ ہو نہ جائے مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ریاض صاحب خود پنڈی جا چکے تھے اور میں امریکہ سے بچیوں کی آمد کی منتظر تھی۔ میری تمام تر توجہ کا مرکز لاہور ہی تھا۔ جب فائر بندی کا حکم ہوا تو میری عجیب کیفیت تھی۔ نہ رو سکتی تھی اور نہ ہنس سکتی تھی۔ صرف خدا سے دعا گو تھی کہ یا اللہ جو بھی ہو بہتر ہو۔

فرہنگ

صفحہ ۱۳۸۔ اصرار: ضد۔ منصۂ شہود پر آئی: شائع ہوئی۔ ناموری: شہرت۔

صفحہ ۱۳۹۔ ادھ کچرے: ناکمل۔ دیرینہ: پرانا۔ حرافہ: بدبو دار، مرلقا، خوبصورت عورت۔ غارت: لوٹ مار۔ آہ و بکا: رونا پیٹنا۔

صفحہ ۱۴۰۔ جبراً: مجبور کر کے۔ تشفی: تسلی۔

صفحہ ۱۴۱۔ کشادہ: کھلا۔ کوشاں رہنا: کوشش کرتے رہنا۔ تنازعہ: جھگڑا۔

صفحہ ۱۴۲۔ ماؤف: معطل، بے حس۔ کماز: نصب العین۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

لندن سے میری ملاقات صرف تین بار ہوئی۔ پہلی دفعہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے، دوسری بار ایک مانوس شہری کی مانند اور آخری بار ایک عاشقِ دیرینہ کی طرح۔ پہلی دفعہ گیارہ سال ہوئے لندن صرف آٹھ دن ٹھہری۔ وقت کم، پیسے کم، جنونِ تماشہ دہ کہ کمرے میں تلوا نہ ٹکنے دے۔ اتفاق سے میرا تین چوتھائی سسرال بھی اسی زمانے میں کسی نہ کسی بہانے لندن آ ٹپکا۔ انیس افراد نے مل کر پوری منزل کے کمرے بک کر لیے، صبح ڈیڑھ سیر قیمہ مرچ ایک جٹھانی پکاتی تھی اور رات کو مرغ شوربا دیورانی۔ مجھ سے یہ اصرار تھا کہ میں بھی اگر پیاز نہ کاٹ سکوں تو کم سے کم یہ دیگ ضرور چکھوں۔ میں نے کہا ہزار لعنت سیاحت پر اور لندن پر اگر میں چولہے کے پاس جاؤں۔ جب پانچ شلنگ میں مزے سے ریستوران میں کھا سکتے ہیں (وہ زمانہ بہت سستا تھا) تو میں کیوں بُھنا ہوا قیمہ ڈبل روٹی سے کھاؤں۔

حوالۂ متن | یہ عبارت اختر ریاض الدین کے مضمون "لندن سے ملاقاتیں" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اختر ریاض الدین اس مضمون میں لندن کی سیاحت کے تاثرات بیان کرتی ہیں۔

تشریح | میں نے لندن تین بار دیکھا ہے۔ پہلی بار تو صرف ایک سیر و سیاحت کرنے والے کی حیثیت سے، دوسری بار ایک ایسے شہری کی طرح جس کے لیے شہر اجنبی نہ ہو اور آخری بار ایک پرانے عاشق کی طرح ــــ گیارہ سال قبل جب میں پہلی دفعہ لندن گئی تو وہاں صرف آٹھ روز قیام کیا ــــ وقت بھی تھوڑا تھا۔ پاس پیسے بھی تھوڑے تھے۔ سیر کا شوق اس قدر کہ چھوڑے نہ سماتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرے تین چوتھائی سسرالی رشتہ دار بھی ان دنوں وہیں پہنچ گئے۔ کل انیس افراد تھے۔ انھوں نے پوری منزل کے کمرے بک کرا لیے ــــ میری ایک جٹھانی صبح ڈیڑھ سیر قیمہ مرچ پکاتی تھی جبکہ دیورانی رات کو مرغ شوربا پکاتی تھی۔ وہ بضد تھیں کہ اگر میں اُن کی معاونت کے لیے پیاز بھی نہیں کاٹ سکتی، تو کم از کم اتنا ہی کر دوں کہ کھانا ہی چکھ لوں ــــ میں نے کہا کہ ہزار لعنت ہے ایسی سیاحت پر۔ اگر چولہے ہی کے پاس جانا تھا تو لندن کی سیاحت کس لیے ــــ جبکہ پانچ شلنگ میں مزے کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا جا سکتا ہے (یہ سستے زمانے کی بات ہے) تو میں کیوں ڈبل روٹی کے ساتھ سڑا ہوا قیمہ کھاؤں

(۲)

ڈیفنس کالج کے پینسٹھ جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے ملنے کے لیے کوشاں رہتے۔ ہفتے میں چار دن باہر کھاتے تو ساتویں دن خود ڈنر دینا پڑتا۔ کالج کے انگریز جوڑے عموماً لندن سے باہر اپنے "دیہی" گھروں اور باغوں میں بلاتے تھے۔ لندن کے دخانی سڑکیں چھوڑ کر دس میل پار کرتے ہی اس کے دیہی گرد و نواح (COUNTRY SIDE) ہو جاتے ہیں۔ جس کے لیے وہ مشہور ہے ــــ انگریزوں کو باغبانی سے عشق ہے۔ تھکے ہارے دفتروں سے آ کر بھی وہ باڑیں کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ باغبانی ایک صلح کل مشغلہ ہے۔ ازدواجی تنازعے سے بچائے رکھتا ہے۔ بیوی کی ناک یا چٹیا کاٹنے سے بہتر ہے کہ باڑ کاٹتے رہو۔ لندن میں اس سارے قیام کا ہیرو تو امپیریل ڈیفنس کالج ہی تھا ــــ اگر دنیا میں کوئی بہترین کورس ہے تو آئی۔ ڈی۔ سی، ــــ افسوس کہ یہ دوبارہ نہیں ملتا ــــ یورپ کے بہترین دماغوں، انگلستان کے مشہور لیڈروں، پروفیسروں، صحافیوں کو باری باری تقاریر اور مباحثے کے لیے مدعو کرتے ہیں ــــ ہر بدھ کو چائے پارٹی پر بیویاں بھی بلائی جاتی ہیں اور پھر چیدہ چیدہ فلم دکھلائے جاتے ہیں، غرض یہ کہ امریکہ اور دولت مشترکہ کے دلچسپ لوگوں سے مل کر ذہنی فراخی ملتی ہے ــــ

حوالۂ متن | یہ عبارت اختر ریاض الدین کے سفرنامہ "لندن سے ملاقاتیں" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اختر ریاض الدین لندن کی سیر و سیاحت کا حال بیان کرتی ہیں جس میں ان کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

تشریح | ڈیفنس کالج کے ۶۵ جوڑے تھے جو سب ایک دوسرے سے ملاقات کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ہفتے میں چار دن کھانا باہر کھاتے تو ساتویں دن خود رات کا کھانا دینا پڑ جاتا۔ کالج کے انگریز جوڑے عام طور پر کھانے کے لیے لندن سے باہر اپنے دیہاتی گھروں اور باغوں میں بلاتے تھے۔ لندن کی دھوئیں والی سڑکیں چھوڑ کر دس میل کے فاصلے سے ہی ان کے دیہاتی قرب و جوار شروع ہو جاتے تھے۔ یہ بات تو مشہور ہے کہ انگریزوں کو باغبانی سے سچا پیار ہے۔ وہ دفتروں سے تھکے ہارے آئیں تو بھی باڑیں کاٹنے لگیں گے یا بیج بونا شروع کر دیں گے۔ باغبانی ایک پیشہ ہے جس میں صلح ہی صلح ہوتی ہے۔ لڑائی نہیں ہو سکتی۔ یوں باغبانی کے شوقین میاں بیوی آپس میں لڑنے سے بچے رہتے ہیں۔ بیوی کی ناک یا چٹیا کاٹنی کوئی ضروری تو نہیں، کیوں نہ باڑ کاٹ لی جائے۔ لندن کے قیام کا اہم ترین حصہ امپیریل ڈیفنس کالج ہی تھا اور دنیا کا بہترین کورس آئی ڈی سی ــــ افسوس ہے

کہ یہ دو بارہ میسر نہیں آتا۔ یورپ کے بہترین مقرر، بہترین پروفیسر اور صحافی، مشہور لیڈر اور مشہور دانشور باری باری آتے ہیں اور تقریر کرتے ہیں یا مباحثہ کراتے ہیں۔ ہر بدھ کو چائے کی دعوت ہوتی ہے جس میں بیویاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ بعد میں خاص خاص فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں ـــــ الغرض یورپ اور امریکہ کے دلچسپ انسانوں سے مل کر ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

(۳)

یہ لندن جو میرا جذباتی جنون تھا۔ اس لندن میں کچھ کرنے کو دل نہ چاہے۔ صرف ہائیڈ پارک کے درختوں کے نیچے بیٹھ جاؤں اور سوچوں کہ اللہ یہ جنگی اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ریاض صاحب پنڈی جا چکے تھے اور میں امریکہ سے بچیوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی جب فائر بندی ہوئی تو نہ رو سکوں، نہ ہنس سکوں، صرف خدا سے دعا مانگی کہ یا اللہ جو بھی ہو بہتر ہو!

حوالۂ متن | یہ عبارت اختر ریاض الدین کے سفرنامہ "لندن سے لاقاہرہ" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | وہ لندن کی سیاحت کے تجربات و مشاہدات بیان کرتی ہیں۔

تشریح | لندن جو مجھے پاگل پن کی حد تک پسند تھا، یہاں میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ کچھ کروں ـــــ بس یہی جی چاہتا تھا کہ ہائیڈ پارک کے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر سوچوں کہ الٰہی جنگ کا نتیجہ کیا نکلے گا ـــــ ریاض صاحب پنڈی جا چکے تھے اور امریکہ سے بچیوں کے آنے کا انتظار کر رہی تھی ـــــ جب جنگ بندی ہو گئی تو مجھے رونا سوجھتا تھا نہ ہنسنا ـــــ بس یہی دعا مانگتی کہ الٰہی جو ہو بہتر ہو۔

خلاصہ شاہد احمد دہلوی

دہلی کا غسلِ خونیں

اب سے دور دلی پر وہ قیامت پڑی کہ خلقِ خدا توبہ توبہ کر اٹھی۔ شام چھ بجے سے صبح چھ بجے تک کرفیو لگا رہتا اور فوجی جوان گولیاں چلاتے رہتے۔ دھڑا دھڑ مسلمانوں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ شہر میں اشیائے خورد و نوش کا قحط پڑ گیا۔ لکھ پتی راتوں رات فقیر بن گئے۔ لوگوں نے شہر خالی کرنا شروع کر دیے۔ ہزاروں لوگوں نے جامع مسجد میں پناہ لی۔ جب آدھا شہر خالی ہو گیا تو پرانے قلعہ میں کیمپ کھول دیا گیا۔ جب یہ بھی مسلمانوں سے بھر گیا تو ہمایوں کے مقبرے میں بھی کیمپ کھول دیا گیا۔ مسلمانوں نے اپنی جاگیروں کو کوڑیوں کے مول بیچ کر کیمپوں میں پناہ لی اور ہندو سکھ ان کے مکانوں پر قابض ہو گئے۔

کیمپوں میں بھی قیامت کا سماں تھا۔ بارشوں کے باعث ہیضے کی وبا پھیل گئی پانی اور راشن کی قلت پیدا ہو گئی۔ پاکستان سے دودھ اور روٹیاں مفت تقسیم کے لیے آتے۔ لیکن منتظمین انہیں قیمتاً فروخت کرتے یا خود ہضم کر جاتے۔ یہاں سے پاکستان جانے کا بھی چارہ نہ تھا کہ لاہور کا ٹکٹ تین سو روپے میں ملتا۔ ہوائی اڈے سے ٹیکسی والے دو سو روپے مانگتے اور اڈے پر فوجی سامان کو ضبط کر لیتے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کے وسط میں سرکاری ملازمین کے لیے ریلیں چلائی گئیں۔ لیکن ان میں غیر سرکاری ملازمین گھس جاتے اور اس میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ اس پر حفاظتی انتظامات بھی پورے نہ ہوتے تھے۔ جہاں مرضی ہوتی انہیں روک کر لوٹ لیا جاتا اور مسلمانوں کو قتل کر دیا جاتا۔ دیہاتوں سے میلوں لمبے قافلے پاکستان کی جانب روانہ ہوتے تھے۔ لیکن ان کو بھی تنگ کیا جاتا کنوؤں میں زہر ڈال دیا جاتا اور راتوں کو ان کے مال و اسباب لوٹ لیے جاتے، لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ حیوانی سلوک کیا جاتا۔ ان مغویہ عورتوں

کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ دلی سے لاہور تک کا سفر سات سات دن میں طے ہوتا مسافر سارا راستہ پانی کے بغیر سفر کرتے۔ اگر اسی دوران کوئی مر جاتا تو اسے کپڑے میں لپیٹ کر گڑھے میں ڈال دیا جاتا۔ اگر کوئی بچہ مر جاتا تو اسے اتر کر دفن کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ کئی کئی دنوں تک مائیں ان کی لاشیں گود میں لیے بیٹھی رہتیں۔ لیکن جب یہ ٹرینیں پاکستانی سرحد میں داخل ہوتیں تو فرطِ محبت میں اپنے سب غم اور دکھ درد بھول جاتے خدا کا شکر ادا کرتے کہ وہ زندہ سلامت پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ پاکستانی بھی کھلے دل و دامن کے ساتھ ان کے استقبال میں کھڑے ہوتے وہ اپنے ہاتھوں میں گرم روٹیاں اور سالن یا آم کا اچار لیے کر کھڑے ہوتے کہ ان کے مہاجر بھائی جھلے ہارے آئیں گے تو یہ چیزیں ہم انہیں محبت و خلوص سے کھلائیں گے۔ اخوت کا بے پناہ جذبہ کار فرما تھا۔ لیکن افسوس یہ جذبہ کسی مفید کام میں نہیں لگایا گیا۔

فرہنگ

صفحہ ۱۴۳۔ اکابر: بزرگ۔ مطبوعہ: چھپے ہوئے۔ عروج: بلندی۔
صفحہ ۱۴۴۔ سدھارنا: جانا۔ کوڑیوں کے مول: اونے پونے۔ خانماں برباد: گھر لٹے ہوئے۔
صفحہ ۱۴۵۔ خود ساختہ: خود ہی بنے ہوئے۔ مسافت: سفر۔ مغویہ: اغوا شدہ۔
صفحہ ۱۴۶ چشم براہ: منتظر۔ اخوت: بھائی چارہ۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

جو لکھ پتی تھے اور جن کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں وہ ایک ہی رات میں فقیر ہو گئے اور انہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ جامع مسجد میں کئی ہزار آدمیوں نے پناہ لی تھی —— راشن کی دکانیں خالی ہو گئی تھیں۔ سبزی ترکاری نہ ملتی تھی —— راشن کیسے لایا جاتا اور ترکاریاں کہاں سے آتیں؟ راشن ڈپو اور سبزی منڈی تک کسی مسلمان کا پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا —— سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو کر کھا رہی تھیں۔

حوالۂ متن | یہ عبارت دلی کا غسلِ خونیں (شاہد احمد دہلوی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | شاہد احمد دہلوی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں۔

تشریح | جو لوگ کل تک رئیس تھے، بڑی بڑی حویلیوں کے مالک تھے اور لاکھوں روپے ان کے پاس جمع تھے ایک ہی رات میں بالکل قلاش ہو کر رہ گئے اور ایسے بے گھر ہوئے کہ سر چھپانے کی جگہ میسر نہ آتی تھی ــــ کئی ہزار آدمیوں نے جامع مسجد میں پناہ لی۔ راشن کی تمام دکانیں خالی پڑی تھیں۔ سبزی ترکاری تک کہیں مل نہیں رہی تھی ــــ راشن آئے تو کہاں سے، سبزی ملے تو کہاں سے۔ ــــ اور پھر کون لائے ــــ کسی مسلمان کے لیے تو راشن ڈپو یا سبزی منڈی تک پہنچ پانا ہی ممکن نہ تھا۔ مجبور و بے بسی کے اس عالم میں لوگ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہے تھے اور پیٹ کی آگ بجھا رہے تھے۔

(۲)

پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے میں قیامت کا نمونہ تھا۔ بارش ہو رہی تھی، لوگ بھیگ رہے تھے۔ ہیضہ پھیلا ہوا تھا ــــ شریف خواتین بدحواس پھر رہی تھیں۔ پانی کا صرف ایک نل تھا۔ اسی ہزار آدمی اس پر ہجوم کیے رہتے۔ دو دو مٹھی چاول کا راشن سرکار کی طرف سے کبھی کبھی مل جایا کرتا تھا۔ پاکستان سے روٹیاں اور دودھ کے ڈبے وغیرہ مفت تقسیم کرنے کے لیے آئے تھے۔ مگر یہ سب چیزیں بیچی جاتی تھیں یا خود ساختہ منتظمین آپس میں بانٹ لیتے۔ ہندو اور سکھ بیس روپے تولہ سونا خریدتے پھرتے تھے۔ مگر انسانی فطرت بھی عجیب شے ہے، اس قیامت کے وقت دنیا کے سارے کام ہو رہے تھے۔ مگر دھوکہ، فریب، چوری، آشنائی سبھی کچھ ہو رہا تھا ــــ

حوالۂ متن: یہ عبارت "دلی کا غسلِ خونیں" (شاہد احمد دہلوی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | شاہد احمد دہلوی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

تشریح | پرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے میں محشر کا سماں تھا۔ بارش ہو رہی تھی لوگ اس میں بھیگ رہے تھے ــــ ہیضہ پھوٹ پڑا تھا ــــ شریف عورتیں بدحواسی کے عالم میں پھر رہی تھیں۔ پانی کا صرف ایک ہی نل تھا اور اسی ہزار افراد کا ہجوم تھا ــــ کبھی کبھار حکومت کی طرف سے دو دو مٹھی چاول بطور راشن دے دیئے جاتے پاکستان کی طرف سے روٹیاں اور دودھ کے ڈبے مفت بھجوائے جا رہے تھے تاکہ کیمپوں

میں تقسیم کئے جائیں مگر یہ سب کچھ بیچ دیا جاتا تھا یا اپنے طور پر ہی بنے ہوئے منتظم آپس میں ہی بانٹ کر لے جاتے تھے۔ ہندو اور سکھ بیس روپے تولہ کے حساب سے سونا خریدتے تھے ــــ انسانی فطرت بھی کتنی عجیب ہے ــــ اس قیامت کے ماحول میں بھی سارے ہی کام ہو رہے تھے ــ مگر دھوکہ، فریب، چوری، چکاری، کسی بات میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔"

(۳)

یہ بھی ہوا کہ گود کے بچے مر گئے اور ریل میں سے اُترنے کا حکم نہیں ہے، تو ماں مرے ہوئے بچے کو دنوں گود میں لیے بیٹھی رہی۔ مسافر پیاس سے جب جاں بلب ہو جاتے تو بارش کے پانی سے کپڑے تر کر کے چوس لیتے۔ مگر جب ریلیں پاکستان میں داخل ہوتیں تو سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ لوگ اپنے غم بھول جاتے اور خوشی سے دیوانہ وار پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے۔

پاکستان کے اسٹیشنوں پر لوگ گرم گرم روٹیاں، ترکاری، ترکاری یا آم کا اچار لیے چشم براہ ہوتے کہ کب مہاجرین آئیں اور کب ہم انہیں کھلائیں۔ اخوت کا بے پناہ جذبہ کارفرما تھا۔ افسوس کہ اس جذبے کو کسی مفید کام میں نہیں لگایا گیا۔

حوالۂ متن | یہ عبارت شاہد احمد دہلوی کے مضمون "دلی کا غسلِ خونیں" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | شاہد احمد دہلوی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے حوالے سے بیان کر رہے ہیں۔

تشریح | اس قیامت کے عالم میں یوں بھی ہوا کہ ماؤں کی گود میں پڑے ہوئے بچے مر گئے۔ مگر ریل کے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ــ مجبوراً ماں دنوں تک مرے ہوئے بچوں کو گود میں لیے بیٹھی رہیں ــ پیاس بھڑکتی تھی مگر پانی نہیں ملتا تھا ــ مسافر پیاس سے مرے جا رہے تھے مگر پانی کہاں ملتا ــ بارش کے پانی سے کپڑا بھگوتے تھے اور اسی کو چوس کر گلا تر کرتے تھے ــ مگر جب ریلیں پاکستان کی حدود میں داخل ہوتیں تو یہ لوگ جی اُٹھتے جیسے سوکھی فصل ہری ہونے لگے ــ اب لوگ اپنے غم بھول جاتے اور خوشی سے پاگلوں کی طرح "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے ــ

پاکستان کے ریلوے سٹیشنوں پر لوگ گرم روٹیاں، سبزی یا آم کا اچار لیے منتظر تھے کہ کب مہاجر آئیں اور ان کو کھانا مہیا کیا جائے۔ بھائی چارے کی عجیب فضا تھی، بے حد جذباتی ماحول تھا۔ مگر افسوس کہ یہ جذبہ بعد میں کسی مفید کام کے لیے استعمال میں نہیں لایا گیا۔

مسعود مفتی

خلاصہ

چہرے

مصنف لکھتا ہے کہ پندرہ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ مکمل طور پر کرفیو کی آغوش میں خاموش ہے۔ لیکن فضا میں بھارتی طیارے آگ برسا رہے ہیں۔ میں انٹر کانٹی نینٹل کی سب سے اوپر والی منزل سے یہ سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اس ہوٹل میں آج دوسرا دن ہے لوگ یہاں پناہ لینے کے لیے آتے ہیں ان کی تلاشی لینے کے بعد کمرے کی چابی دے دی جاتی ہے۔ اوپر والی منزل زیادہ خطرناک ہونے کے باعث مغربی پاکستان کے لوگوں کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ کیونکہ ان کے نزدیک ہم فالتو لوگ تھے۔ بہرحال شام تک ہوٹل کھچا کھچ بھر گیا۔ اس ہجوم میں چار قسم کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایک قسم غیر ملکی لوگوں کی جو بحیثیت نامہ نگار، اخبار نویس اور تاجروں کے یہاں موجود تھے۔ دوسری قسم مغربی پاکستان کے وہ لوگ جو بحیثیت سرکاری و غیر سرکاری ملازمین یہاں کام کرتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں مارچ اپریل میں غیر بنگالیوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات گھوم رہے تھے۔ ان چہروں میں تیسری قسم مشرقی پاکستان کے ان لوگوں کی ہے جو حکومت کے وفادار تھے یہ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ چکے تھے۔ اور اب صرف زندہ لاشیں نظر آ رہے تھے۔ چہروں کے اس ہجوم میں چوتھی قسم "بہاری" کہلاتی تھی یہ لوگ ۱۹۴۷ میں بے گھر ہو کر یہاں آئے اور پھر مارچ اپریل ۱۹۷۱ء کو ان کو ۴۷ء سے بھی بڑے حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اب دسمبر ۱۹۷۱ء میں ایک بار پھر ان کے خون سے ہولی کھیلی جائے گی۔ یہ لوگ سب سے زیادہ قابلِ رحم ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ایک ہی نسل میں تین مرتبہ قتل عام سہنے کے باوجود بے گھر ہیں۔ پاکستان میں پناہ لینے آئے لیکن پاکستان نہ تو انہیں گھر دے سکا، نہ تحفظ اور نہ وطن، بلکہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر آتے پر بھی پاکستانی نہ کہلا سکے۔ بلکہ بہاری کہلاتے ہیں نہ یہ پاکستانی رہے اور نہ ہی ہندوستانی رہے۔ بلکہ فضا میں تحلیل پرندے کی مانند ہیں۔

مصنف مزید لکھتا ہے کہ آج پندرہ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ چاروں قسموں کے چہرے میرے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ سب کے چہروں پر تشویش اور پریشانی کے تاثرات موجود ہیں پہلی قسم کے لوگ ان تاثرات سے عاری اور مطمئن ہیں۔ اس لیے کہ وہ غیر ملکی ہیں۔

مصنف رات کو سونے کی کوشش میں مصروف ہے۔ لیکن پوری رات بے کلی اور بے چینی میں آنکھوں میں کٹ گئی اور سولہ دسمبر کی صبح کو اپنے ساتھی کے کمرے میں بیٹھ کر کالم "چہرے" لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ دفعتہً ان کے ساتھی نے کہا کہ سب لوگوں کو "جنیبلی روم" میں اکٹھا ہونے کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ "سرنڈر" ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا انہیں "جنیبلی روم" میں خاص ہدایات دی گئیں اور مصنف اپنے کالم "چہرے" کی آخری لائنیں لکھنے لگا۔

فرہنگ

صفحہ ۱۴۷۔ چشمِ بیدار: کھلی آنکھ۔ تحویل: قبضہ۔ دل گداز: دل کو ہلا دینے والا۔

صفحہ ۱۴۸۔ آغوش: گود۔ پُرسکوت: خاموش۔ فق چہرے: رنگ اُڑے ہوئے چہرے۔

صفحہ ۱۴۹۔ آبیاری: پانی دینا، سیراب کرنا۔ بیخ کنی: جڑیں کاٹنا۔ لحد: قبر۔ امان: پناہ۔ استقلال: مستقل مزاجی۔ انحراف کرنا: پھر جانا۔

صفحہ ۱۵۰۔ تحفظ: پناہ۔ متوحش نظریں: ڈری ہوئی نظریں، وحشی نظریں۔

صفحہ ۱۵۱۔ بے کل: بے چین۔ بے کلی: بے چینی

صفحہ ۱۵۲۔ اضطرار: کسی کام کو کرنے پر مجبور ہو جانا کہ اس کے سوا چارہ ہی نہ رہے، بے اختیاری، بے بسی، بے چینی، بے قراری۔ اضطراری طور پر: غیر ارادی طور پر۔ مخدوش: پُرخطر، وسوسہ کیا ہوا

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

ہم بھی اسی طرح اپنے کمروں میں پہنچے جو سب سے اوپر والی گیارہویں منزل پر ہیں۔ وہاں بمباری کی وجہ سے سب سے زیادہ خطرہ تھا، ——— مگر ہم مغربی پاکستانی ہونے کی وجہ سے فالتو تصور کئے گئے تھے۔ لہٰذا وہیں بھیجے گئے۔ میں اپنے کمرے نمبر ۱۱۰۸ کی کھڑکی میں

سے جھانکتا ہوں تو پہلا منظر جو مجھے نظر آتا ہے وہ رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ بالکل سامنے گورنمنٹ ہاؤس پر ہوائی جہاز جھپٹ جھپٹ کر بمباری کر رہے تھے۔ وہی گورنمنٹ ہاؤس جس میں سات روز کے قیام کے بعد ہم تھوڑی دیر پہلے نکلے تھے ابھی ہمارے کئی ساتھی وہیں ہیں، کیونکہ کابینہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ نیچے وہ عمارتیں دھول اور مٹی بن کر اڑ رہی ہیں۔ جنہوں نے سات آٹھ روز تک ہمیں پناہ دی تھی اور پچیس سال تک مشرقی اور مغربی پاکستان کی اکائی کی علامت رہی تھیں۔

کل کا دن یقین ڈولنے کا دن تھا۔ شہر کے مختلف حصوں سے لوگ آتے گئے۔ اپنی امیدوں کی لاشوں کو سینے سے لگائے ہوئے، فق چہروں سے، اڑی اڑی رنگت سے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے، ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔ شام تک ہوٹل کھچا کھچ بھر گیا۔

حوالۂ متن یہ عبارت مسعود مفتی کے "چہرے" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مسعود مفتی دسمبر ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ میں تھے۔ وہ سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں۔

تشریح ہم بھی گیارہویں یعنی سب سے اوپر والی منزل میں اپنے کمروں میں اسی طرح پہنچ گئے جس طرح دوسرے لوگ پہنچے تھے۔ وہاں بمباری کا خطرہ سب سے زیادہ تھا۔ مگر مغربی پاکستان سے تعلق کی بنا پر ہمیں فالتو سمجھا جا رہا تھا اس لیے اسی منزل میں بھیجا گیا۔ میں اپنے کمرے (نمبر ۱۱۰۰) کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو جو پہلا منظر مجھے دکھائی دیتا ہے وہ رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔ بالکل سامنے ہی گورنمنٹ ہاؤس ہے، وہاں ہوائی جہاز جھپٹ جھپٹ کر حملہ کر رہے ہیں اور بم برسا رہے ہیں۔ یہ وہی گورنمنٹ ہاؤس ہے جہاں سے سات دن ٹھہرنے کے بعد ہم آج ہی نکلے ہیں۔ ہمارے کئی ساتھی اس وقت بھی وہیں ہیں کیونکہ کابینہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ نیچے وہ عمارتیں، جن میں ہم نے سات آٹھ دن تک پناہ لے رکھی تھی۔ مٹی بن بن کر اڑ رہی ہیں۔ یہی عمارتیں کل تک، پچیس سال سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک ہونے کی نشانی کے طور پر موجود رہی تھیں۔

کل کا دن ایسا تھا کہ یقین ڈگمگا رہا تھا۔ شہر کے مختلف حصوں سے لوگ آتے چلے گئے۔ یہ لوگ اپنی امیدوں کی لاشیں اپنے سینوں سے چمٹائے ہوئے تھے۔ ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ چہرے فق تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ ایک کے بعد ایک آتا

تھا ـــ یہ سلسلہ شام تک چلتا رہا حتیٰ کہ شام تک ہوٹل پوری طرح بھر گیا۔

(۲)

اس ہجوم میں عام طور پر چار قسم کے چہرے ہیں۔ پہلی قسم غیر ملکی چہروں کی ہے جو نامہ نگاروں اخبار نویس اور تاجروں کا نقاب اوڑھے ہیں۔ ان میں کئی ایسے ہیں جو اس دن کے لیے کام کرتے رہے ہیں اور آج پاکستان کی گردن کو آہستہ آہستہ جھکتا دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں۔ یہ چہرے اس چمن کی آبیاری کرنے کے روپ میں آتے تھے اور نہایت مہارت سے بیخ کنی کر رہے تھے اور اب ہماری خزاں کو اپنی بہار بنا رہے ہیں۔ اس وقت میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ان چہروں کا تاثر ہے جو قلم کی گرفت میں نہیں آتا۔ جو پیچیدگی کے باوجود صاف پڑھا جاتا ہے مگر بیان نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ میرے دل کو چھید کرتا جاتا ہے۔ کل دوپہر کے قریب ہم لوگ یہاں پہنچے تو یہ چہرے باہر گیٹ پر عجیب عجیب کیمروں سے لیس کھڑے تھے۔ یہ بڑے ہی بے درد چہرے ہیں جو زیبِ محفل بھی رہے اور محفل سے پنہاں بھی رہے۔

حوالۂ متن یہ عبارت چہرے (مسعود مفتی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مسعود مفتی سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں اور چشم دید واقعات بتا رہے ہیں۔

تشریح اس ہجوم میں چار طرح کے لوگ تھے۔ پہلی قسم ان لوگوں کی تھی جو غیر ملکی تھے اور نامہ نگار، اخبار نویس، تاجر کا روپ دھارے ہوئے تھے۔ ان میں بے شمار لوگ ایسے ہیں، جو سالوں اسی منحوس دن کے لیے کام کرتے رہے ہیں اور آج پاکستان کی گردن کو بتدریج جھکتے دیکھ کر سکھ کا سانس لے رہے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو ہماری خدمت کے لیے آتے تھے مگر درونِ پردہ بڑی ہوشیاری سے ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہے تھے اور اب ہمارے زوال سے اپنے لیے اچھے مستقبل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تاثر ان چہروں کا ہے جنہیں میں تحریر کے ذریعے بیان نہیں کر سکتا مگر اسے صاف پڑھ سکتا ہوں، گو بیان نہیں کر سکتا حالانکہ ہمارا دل بہت دکھی ہو رہا ہے ـــ کل دوپہر کے قریب یہ لوگ پہنچے تو یہ باہر گیٹ پر کھڑے تھے۔ ان کے پاس عجیب عجیب کیمرے تھے۔ یہ چہرے بڑے ہی بے درد ہیں جو محفلوں کی رونق بھی رہے ہیں اور محفلوں سے پوشیدہ بھی رہے ہیں۔

(۳)

اس ہجوم میں چہروں کی چوتھی قسم عام اصطلاح میں "بہاری" کہلاتی ہے۔ یہ وہ

لوگ ہیں جو ۱۹۴۷ء میں بہار، آسام، یو۔پی، اور سی پی وغیرہ سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے اور دوسرے درجے کے شہری بن گئے۔ یہ چہرے بہت ہی مظلوم ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے علاقے پاکستان میں نہیں ہوں گے، بلکہ ہندوستان میں رہ جائیں گے ۱۹۴۷ء میں اپنے عزیزوں کی لاشوں پر تیرتے ہوئے خون کے سمندر پار کر کے یہاں پہنچے۔ مارچ اپریل ۱۹۷۱ء میں اس سے بھی بُرے دن دیکھے اور اب دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد پھر ان کے خون سے ہولی کھیلی جائے گی —— یہ لوگ ایک ہی نسل میں تین قتل عام سہہ کر بھی بے گھر ہیں، پاکستان انہیں تحفظ نہ دے سکا، گھر نہ دے سکا، وطن نہ دے سکا۔

حوالۂ متن یہ عبارت چہرے (مسعود مفتی) سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق مسعود مفتی اپنے براہ راست مشاہدات و تجربات کی روشنی میں سقوطِ ڈھاکہ کی باتیں کرتے ہیں۔

تشریح اس ہجوم میں چوتھی قسم کے لوگ بھی ہیں جنہیں بہاری کہا جاتا ہے —— یہ وہ لوگ ہیں جو ۱۹۴۷ء میں بہار سے، آسام، یو پی، سی پی وغیرہ سے مہاجر بن کر مشرقی پاکستان میں آئے تھے اور دوسرے درجے کے شہری بن کر زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ بڑے مظلوم لوگ ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا حالانکہ جانتے تھے کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہ ہو سکیں گے بلکہ ہندوستان کا حصہ بنیں گے۔ ۱۹۴۷ء میں یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کی لاشوں پر سے گزرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے بہت بُرے دن دیکھے تھے۔ اگر مارچ اپریل ۱۹۷۱ء میں اس سے بھی بُرے دن دیکھے اور اب دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد پھر انہی کا خون بہایا جا رہا ہے —— ان لوگوں نے ایک ہی نسل میں تین قتلِ عام سہے، پھر بھی بے گھر ہیں —— پاکستان ان کی حفاظت نہیں کر سکا۔ انہیں گھر نہیں دے سکا۔ انہیں وطن نہیں دے سکا۔ کتنے محروم لوگ ہیں۔

(۴۳)

آج پندرہ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے اور چاروں قسم کے یہ چہرے میرے گرد و پیش گھوم رہے ہیں۔ لفٹ میں، کاؤنٹر پر لاؤنج میں، کھانے کے کمرے کینٹے ارم میں —— متوحش نظریں، متفکر پیشانیاں اور متنازعہ خیالات —— پہلی قسم کے غیر ملکی چہروں کے

علاوہ باقی سب میں تشویش، قدرِ مشترک ہے جس میں قوم و ملک کا احساسِ زیاں اور ذات کا تحفظ بھی شامل ہیں ـــــ ان کے ہونٹوں سے صرف دعائیں نہیں نکل رہی ہیں، بلکہ ایسی باتیں بھی نکل رہی ہیں جنہیں کہنے سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا۔ ان کی باتیں سنتے ہوئے میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ قوم گزشتہ چوبیس برس میں حاکمِ وقت کی مدح سرائی کی بجائے کھل کر بات کرنے کی عادت ڈال لیتی تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

حوالۂ متن | یہ عبارت "چہرے" سے لی گئی ہے جس کے مصنف مسعود مفتی ہیں۔

سیاق و سباق | مسعود مفتی سقوطِ ڈھاکہ کے ایام کی بات کرتے ہیں۔ وہ ان دنوں وہیں تھے۔

تشریح | آج پندرہ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے اور چاروں ہی اقسام سے تعلق رکھنے والے لوگ میرے اردگرد گھوم پھر رہے ہیں۔ لفٹ میں، کاؤنٹر پر، لاؤنج میں کھانے کے کمرے کینٹے ارم میں ـــــ ہر جگہ ـــــ وحشی نظریں، پریشان پیشانیاں اور ایسے خیالات جو ابھی طے شدہ نہیں بلکہ متنازعہ فیہ ہیں ـــــ پہلی قسم کے غیر ملکی لوگوں کے علاوہ باقی سب کے ہاں پریشانی کا پہلو مشترک ہے۔ اس پریشانی کے پیچھے ملک اور قوم کے نقصان کا احساس بھی ہے اور اپنی ذات کی حفاظت بھی ـــــ یہ صرف دعائیں ہی نہیں مانگ رہے ہیں بلکہ ایسی ایسی باتیں بھی کہہ رہے ہیں جو انھوں نے اس سے پہلے کبھی نہ کہیں۔ ان کی باتیں سُن رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ قوم پچھلے چوبیس برس کے دوران حاکمِ وقت کی خوشامد کی بجائے کھل کر بات کرنے کی عادی ہوتی تو آج ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا ـــــ

انتظار حسین

خلاصہ

قومی پھول

ہاتھ میں کھرپا لیے ایک شخص اپنے کوارٹر کے سامنے بنی ہوئی کیاری میں زمین کھود رہا تھا۔ مصنف نے ان سے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو تو وہ کہنے لگا کہ میں پھولوں کا ہفتہ مناتے ہوئے چنبیلی کی قلم لگا رہا ہوں۔ اس پر مصنف کو پھولوں کی تنہائی یاد آئی تو کہنے لگا کہ پاکستانی عوام نے چنبیلی کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس پر وہ پہلے ہنسا اور بعد میں رونے لگا۔ مصنف کے پوچھنے پر کہنے لگا کہ ہنسا اس لیے تھا کہ چنبیلی ہمارا قومی پھول ہے اور رویا اس لیے کہ یہ ہمارے باغوں میں سبزۂ بیگانہ بن گئی ہے۔

دوستو نیرنگی زمانہ پر غور کرو کہ چنبیلی کو ہم نے کتنی عزت دی اور پھر کتنی ذلت کا شکار کر دیا۔ یعنی شہر میں نئی نئی کوٹھیاں بنتی ہیں ان میں لان بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان قومی پھولوں میں قومی پھول مفقود ہے اور اس کی جگہ ایسے ایسے انگریزی پھول لگائے جاتے ہیں۔ جن کے رنگ تو خوبصورت ہیں۔ لیکن خوشبو مفقود۔ حتیٰ کہ باغ جناح میں بھی موتیے یا ہار سنگھار کی مہک نہ آئی۔ اس شہر میں گل پھول ناپید ہیں۔ اور ہم گل پھول دیکھنے کہاں جائیں۔ چلتے پھرتے ایک کوچے سے گزرے تو خوشبو نے بڑھ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ غور کیا تو ارد گرد کہیں بھی کوئی باغیچہ نظر نہ آیا یہ دانا صاحب کا دربار تھا۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک گلاب اور موتیے کے انبار تھے۔ گویا خوشبو دانا کے کوچے ہی میں رہ گئی ہے۔ یہاں سے نکل کر گلبرگ میں جائیں تو یہاں کی کوٹھیوں میں بغیر خوشبو کے انگریزی گلاب کھلے ہوئے ملیں گے۔ کسی زمانہ میں موسم برسات میں لوگ بیلا، چنبیلی اور موتیا وغیرہ کی قلمیں لگاتے تھے۔ مگر اب برسات تو آتی ہے۔ لیکن چنبیلی کی قلموں کی تلاش نہیں ملتی۔

محکمہ زراعت نے ہفتہ شجرکاری تو منایا۔ لیکن پھولوں کا ہفتہ کبھی نہیں منایا۔ گل داؤدی کی نمائش کرنے والوں نے چنبیلی کو کبھی اپنی انجمن میں شریک نہیں کیا۔ چنبیلی ہمارا قومی پھول ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جو چیز قومی بن جائے۔ اسے فراموش کر دیا جاتا ہے

یعنی اردو ہماری قومی زبان تھی تو وہ بھی ملک سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ اسی طرح چنبیلی قومی پھول بننے کے بعد ملک سے ناپید ہو گیا ہے۔

فرہنگ

صفحہ ۱۵۳۔ معنیاتی امکانات: معانی کے حوالے سے امکانات۔ اساطیر: اسطورہ کی جمع قصے، کہانیاں، کہاوتیں۔ دیومالا: دیوتاؤں کے قصے، خیالی کہانیاں، علم الاصنام، مائیتھالوجی۔ معترف: اعتراف کرنے والا۔

صفحہ ۱۵۴۔ بایں ہمہ: اس کے باوجود۔ سبزۂ بیگانہ بن گئی: نایاب ہو گئی۔ نیرنگیٔ زمانہ: زمانہ کی گردش۔ قوتِ شامہ: سونگھنے کی قوت۔

صفحہ ۱۵۵۔ روش: طریقہ، باغ کی پٹڑی۔ طبلۂ عطار: عطار کی صندوقچی۔ انبار: ڈھیر۔ افراط: کثرت، زیادتی۔ عاری: تہی، خالی۔ آراستہ: سجے ہوئے۔ شرف: عزت۔ ہنوز: ابھی۔ صاحبِ خانہ: گھروالا۔

صفحہ ۱۵۶۔ فراموش کر دینا: بھلا دینا۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

صاحبو! تم نے اس نیرنگیٔ زمانہ پر غور کیا کہ چنبیلی کے پھول نے ایک ہی وقت میں ہماری آنکھوں دیکھتے کتنی عزت پائی اور کتنی ذلت اُٹھائی۔ اب جو پاکستان دیس کے سب پھولوں کا عالم ہے۔ اس شہر میں روز ایک نئی کوٹھی تعمیر ہوتی ہے اور ہر نئی کوٹھی میں پھلواری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس کوٹھی میں قدم رکھو وہاں پھولوں کے تختے نظر آئیں گے۔ ان پھولوں کے رنگ تمہاری نظروں کو اپنی طرف مخاطب کریں گے۔ مگر تمہاری قوتِ شامہ سے کوئی کلام نہیں کریں گے۔ وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ یہ انگریزی پھول ہیں۔ ان میں رنگ ہی رنگ ہے خوشبو نہیں ہے۔ جیسی تہذیب ویسے اس کے پھول۔ جس تہذیب میں خوشبو نہ ہوگی اُس کے پھولوں میں خوشبو کہاں سے آجائے گی۔

حوالۂ متن | یہ عبارت قومی پھول (انتظار حسین) سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق | انتظار حسین چنبیلی کے پھول کے حوالے سے باتیں کرتے ہیں جو ہمارا قومی پھول بھی ہے۔

تشریح | حضرات! آپ نے زمانے کی اس گردش پر بھی کبھی غور کیا کہ چنبیلی کے پھول نے بیک وقت ہمارے سامنے کتنی عزت اور کتنی ذلت پائی۔ اب جو حال پاکستان کے دوسرے پھولوں کا ہے وہی چنبیلی کے پھول کا ہے۔ اس شہر میں روز نئی کوٹھیاں بنتی ہیں، ان میں باغیچے لگتے ہیں۔ کہیں بھی داخل ہو کے دیکھو کوٹھی کے اندر پھولوں کے تختے کے تختے دکھائی دیں گے ان پھولوں کے رنگ آپ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے مگر آپ کی سونگھنے کی حس سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ یعنی یہ پھول آپ کو دیکھنے میں بہت خوبصورت لگیں گے۔ مگر ان میں خوشبو بالکل نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ___ سبب یہ ہے کہ یہ انگریزی پھول ہیں ___ ان میں صرف رنگ ہی رنگ ہیں ___ خوشبو بالکل نہیں ہے ___ درست ہے، جیسی تہذیب ہوگی، ویسے ہی پھول بھی ہوں گے ___ جس تہذیب میں خوشبو نہ ہوگی، اس کے پھولوں میں بھی خوشبو نہیں ہوگی ___

(۲)

چلتے پھرتے ایک کوچے سے گزرے۔ خوشبو نے بڑھ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ نہ کوئی باغ نہ کوئی باغیچی۔ کوچہ، طبلہ عطار بنا ہوا ہے۔ یہ داتا صاحب کا کوچہ ہے اور اس کنارے سے اُس کنارے تک تختوں پر گلاب کے انبار ہیں اور موتیے کی افراط ہے، تو خوشبو والے کوچے ہی میں رہ گئی ہے۔ باقی کوچے، نئے کوچے ہیں۔ خوشبو سے عاری، رنگ سے آراستہ۔

حوالۂ متن | یہ عبارت "قومی پھول" سے لی گئی ہے، جس کے مصنف انتظار حسین ہیں۔

سیاق وسباق | انتظار حسین چنبیلی کے پھول کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں جو ہمارا قومی پھول ہے۔

تشریح | ہم چلتے پھرتے ایک گلی میں سے گزرے ___ خوشبو نے ہمارا استقبال کیا ___ یہ خوشبو کہاں سے آگئی؟ ___ نہ کوئی باغ، نہ باغیچہ ___ یہ گلی ہی عطار کی صندوقچی بن گئی ہے ___ یہ داتا صاحب کی گلی ہی میں رہ گئی ہے ___ باقی گلیاں نئی گلیاں ہیں ___ اس لیے خوشبو سے خالی اور صرف رنگوں سے سجی ہوئی ہیں۔

(۳)

محکمہ زراعت درختوں کا ہفتہ منا چکا۔ درختوں کا ہفتہ محکمہ سال میں دو مرتبہ مناتا ہے۔ مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ اس نے پھولوں کا ہفتہ بھی منایا ہو اور گل داؤدی کی نمائش کرنے والوں کو کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ چنبیلی کو بھی انجمن میں شریک کریں۔ آخر چنبیلی پاکستان کا قومی پھول ہے۔ پتہ نہ چلا کہ اس دیس میں جو شے قومی بن جاتی ہے اُسے فراموش کر دیا جاتا ہے سو، جو اردو کا حال قومی زبان بن کر ہوا، وہ چنبیلی کا حال قومی پھول کر ہوا۔

حوالۂ متن | یہ عبارت انتظار حسین کے کالم "قومی پھول" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | انتظار حسین قومی پھول یعنی چنبیلی کے پھول کے حوالے سے باتیں کر رہے ہیں۔

تشریح | محکمہ زراعت درختوں کا ہفتہ منا چکا ہے۔ یہ محکمہ سال میں دو بار ہفتہ مناتا ہے — مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے پھولوں کا ہفتہ بھی منایا ہو — اور گل داؤدی کی نمائش کرنے والوں کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ چنبیلی کے پھولوں کو بھی اس نمائش میں جگہ دے دیں — آخر یہ پاکستان کا قومی پھول ہے — معلوم ہوا کہ اس ملک میں جو چیز بھی قومی بن جاتی ہے اسے بھلا دیا جاتا ہے۔ سو — جو حال اردو کا قومی زبان بن کر ہوا، وہی حال چنبیلی کا قومی پھول کر ہوا۔

مشفق خواجہ

خلاصہ

کتاب کا دُوسرا ایڈیشن

مصنف کے بقول عالمی سطح پر جون کے مہینے میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ ایک تو یہ کہ امریکہ کے وزیر خارجہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ عطاء الحق قاسمی کی کتاب "روزن دیوار" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ (مصنف اسے عالمی سطح کا اہم واقعہ اس لیے قرار دیتا ہے۔ کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے، خاص طور پر ادبی کتابیں۔ اس لیے کسی بھی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت نہیں آتی۔ ان حالات میں کسی ادبی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو جائے تو اسے اہم واقعہ ہی تصور کیا جائے گا) یہ عطاء الحق قاسمی کی بے احتیاطی نہیں، پڑھنے والوں کی بے احتیاطی ہے کہ انہوں نے کتاب خریدی اور دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت آ گئی اور مصنف کو شہرت سے ہم کنار کر گئی ورنہ کالم تو ہم (یعنی مشفق خواجہ) بھی لکھتے ہیں (مصنف کا مطلب یہ ہے کہ آخر ہمارے ہی تو کالم چھپتے ہیں) ہماری کتاب شائع نہیں ہوتی اور ہو تو دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آتی۔ "روزن دیوار" جب پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ تو کم خوبصورتی کے ساتھ اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ مگر جب دوسری بار شائع ہوئی ہے تو اس کی خوبصورتی قابلِ دید ہے۔ اس کا سرورق اسلم کمال کا بنایا ہوا ہے اور اس پر عطا کی تصویر بھی ہے۔ ہم بھی اپنے کالموں کا مجموعہ شائع کرا رہے ہیں۔ ہم بھی اس پر تصویر شائع کریں گے۔ مگر اپنی نہیں، عطا کی شائع کریں گے۔ ہماری تصویر کے ساتھ اسے کون خریدے گا۔

کتاب کے سرورق پر ضمیر جعفری، نصر اللہ خاں، شفیق الرحمٰن اور پروفیسر وارث میر کی آراء شائع کی گئی ہیں۔ مگر ہمیں تو شفیق الرحمٰن کی رائے پسند آئی ہے کہ وہ دن آیا مجھیں جب عطاء الحق قاسمی کو پڑھتے ہوئے آرٹ بکوالڈ کی یاد آئے گی۔

یہاں مصنف اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ عطاء کا اندازِ تحریر اتنا دلکش ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے کسی کی یاد آنا ممکن ہی نہیں۔ چاہے وہ خود عطا ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی کتاب

پڑھتے ہوئے قاری دلچسپ انداز تحریر کی حامل کتاب کے مطالعہ میں کھو جاتا ہے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

فرہنگ

صفحہ ۱۵۷۔ خوش فکر: اچھی سوچ رکھنے والے۔ صاحبِ نظر: گہری نظر رکھنے والے۔
صفحہ ۱۵۸۔ ذکاوت: ذہن کی تیزی، تیزیٔ طبع، تیز فہمی۔ طباعی: ذہانت۔ عجائباتِ عالم: دنیا کی عجیب چیزیں۔
صفحہ ۱۵۹۔ ٹوہ: تجسس۔ تقلید: پیروی۔ کوندا: بجلی کی چمک۔
صفحہ ۱۶۰۔ شہرۂ آفاق: زمانے بھر میں مشہور۔

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱)

جون کے مہینے میں عالمی سطح پر دو اہم واقعات پیش آئے۔ ایک تو یہ کہ امریکہ کے وزیرِ خارجہ ہیگ نے استعفیٰ دے دیا اور دوسرے یہ کہ عطاء الحق قاسمی کی کتاب "روزنِ دیوار سے" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ دوسرے واقعے کو عالمی اس لیے کہا گیا ہے کہ اردو ایک عالمی زبان ہے اور عطاء کی کتاب اسی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ یہ واقعہ اہم اس لیے ہے کہ اردو کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونا عجائباتِ عالم میں سے ہے۔

حوالۂ متن | یہ عبارت مشفق خواجہ کے کالم "کتاب کا دوسرا ایڈیشن" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | مشفق خواجہ "روزنِ دیوار" کے دوسرے ایڈیشن کی بات کر رہے ہیں۔

تشریح | جون کے مہینے میں عالمی سطح پر دو خاص واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ امریکہ کے وزیر خارجہ ہیگ مستعفی ہو گئے ہیں، دوسرا یہ کہ عطاء الحق قاسمی کی کتاب "روزنِ دیوار" کا دوسرا ایڈیشن چھپ گیا ہے ــــ کتاب کے چھپ جانے کو میں عالمی واقعہ اس لیے کہتا ہوں کہ اردو ایک عالمی زبان ہے اور یہ کتاب اسی زبان میں چھپی ہے ــــ یہ واقعہ اس اعتبار سے بھی خاص ہے کہ اردو کی کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپ جانا بذاتہ دنیا کے عجوبوں میں سے ایک ہے ــــ

(۲)

سمجھ دار لوگ تو اپنی کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپوانے میں بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں، لیکن یہاں بے احتیاطی عطاء الحق قاسمی کی نہیں، پڑھنے والوں کی ہے جنہوں نے پہلے ایڈیشن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی سلوک خود عطاء کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا، وہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے تھے اور اب دیکھتے ہی دیکھتے صفِ اوّل کے کالم نگار بن چکے ہیں۔ لیکن انہیں صرف کالم نگار کہنا زیادتی ہوگی۔ کالم نگاری تو ہم بھی کرتے ہیں، عطاء کی کالم نگاری کچھ اور چیز ہے۔ یہ ادبی و تخلیقی کام ہے۔ وہ کالم نہیں لکھتے، ادب لکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کالموں کا انتخاب اخباری چیز نہیں، ادبی ہے۔

حوالۂ متن | یہ اقتباس مشفق خواجہ کے کالم "کتاب کا دوسرا ایڈیشن" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق | کالم نگار "روزنِ دیوار" کے دوسرے ایڈیشن کے حوالے سے باتیں کر رہا ہے۔

تشریح | دانا لوگ تو اپنی کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع کرانے میں احتیاط برتتے ہیں۔ مگر یہاں بے احتیاطی برتنے والوں نے کی ہے، عطاء الحق قاسمی نے نہیں کی۔ وہ یوں کہ پڑھنے والوں نے کتاب بڑے شوق سے خرید لی — خود عطا کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوا ہے — جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا تو انہیں بڑے شوق سے پڑھا گیا تھا اور اس میدان میں ان کا والہانہ استقبال ہوا تھا اور اب وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اوّل درجے کے کالم نگار بن چکے ہیں — مگر — انہیں صرف کالم نگار کہنا ان کے ساتھ زیادتی ہے — کالم نگار تو ہم بھی ہیں — مگر — عطا کی کالم نگاری اور ہی شے ہے — یہ صرف کالم نہیں، یہ ادبی اور تخلیقی کام بھی ہے — سو وہ صرف کالم نہیں لکھتے ادب تخلیق کرتے ہیں — اسی لئے ان کالموں کا انتخاب کوئی صوفیانہ کوشش نہیں بلکہ ادبی کام ہے —

ہمارے کالموں کا انتخاب چھپنے والا ہے۔ ہم عطا صاحب کی تقلید کریں گے، یعنی اپنی کتاب کے سرورق پر اُن کی تصویر چھاپیں گے۔ مقصد، کتاب کی فروخت سے ہے اور یہ مقصد ہماری تصویر کی اشاعت سے حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہماری تصویر چھپنے کے بعد ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے ہم ہیں۔ اُمید ہے کہ عطا صاحب کو اس بے تکلفی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جب دوستوں کی تحریروں سے کام نکالا جا سکتا ہے تو اُن کی تصویروں سے کام کیوں نہ نکالا جائے!

حوالۂ متن | یہ عبارت مشفق خواجہ کے کالم "کتاب کا دوسرا ایڈیشن" سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق | کالم نگار "روزنِ دیوار" کے دوسرے ایڈیشن کے حوالے سے باتیں کر رہا ہے۔

تشریح | ہمارے کالموں کا انتخاب بھی شائع ہونے والا ہے —— ہم بھی عطا ہی کی پیروی کریں گے یعنی اپنی کتاب کے ٹائیٹل پر ان کی تصویر شائع کر دیں گے —— مقصد یہ کہ کتاب بکے اور یہ مقصد ہماری تصویر کے چھپنے سے تو پورا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہماری تصویر جب چھپتی ہے تب بھی ایسی ہی لگتی ہے جیسے ہم اصل میں ہیں —— امید ہے کہ عطا صاحب کو ہماری بے تکلفی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا —— جب دوسروں کی تحریروں سے لوگ کام چلاتے ہیں، تو ان کی تصویروں سے کیوں کام نہیں چل سکتا۔

جمیل الدین عالی

خلاصہ — سورج جیسا آدمی

جمیل الدین عالی ممتاز حسن صاحب کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ وہ انہیں ۱۹۴۷ء سے جانتے ہیں جب وہ دلی میں قائد ملت خان لیاقت علی خان کے سیکرٹری تھے۔ اس کے بعد جب پاکستان بن گیا تو وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے مگر عالی صاحب کا ان سے تعلق برقرار رہا بلکہ مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ مصنف کے بیان کے مطابق "ممتاز حسن میرے دوست نہیں بلکہ میں ان کا مداح ہوں۔ میں ان کے لیے عظیم کا لفظ بھی استعمال نہیں کروں گا۔ کیونکہ آج کے پس منظر میں یہ ان کے لیے عزت افزائی کی بجائے توہین ہوگی۔ ان کی ایک نہیں بلکہ کئی حیثیتیں ہیں وہ بیک وقت ایک بیوروکریٹ، ماہر مالیات، بینکر، منتظم، عالم، دانشور، ادیب، مقرر اور فنونِ لطیفہ کے قدر دان تھے۔ ان کی اتنی حیثیتیں ہیں اور ان سے فیض حاصل کرنے والے اتنی کثرت میں تھے کہ انہیں سورج سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ وہ بلاشبہ سورج جیسے آدمی تھے۔ جس سے کئی سیارے اور ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ خود ان کا یہ حال کہ زندگی بھر بڑے سے بڑے عہدے پر کام کیا مگر دنیا سے رخصت ہوئے تو بالکل خالی ہاتھ تھے ان عہدوں سے دنیاوی فائدے حاصل نہ کیے اور کوئی کمائی نہ کی۔ مگر ہمارے قومی پس منظر میں یہ

روایت اپنی جگہ بڑی شاندار ہے کہ انسان دنیاوی مناسب پر کام کرے مگر دنیاوی فوائد حاصل نہ کرے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ مگر انہیں کسی سے فیض حاصل نہ ہوا (بلکہ انہوں نے ایسا چاہا نہیں) الٹا لوگ ان سے مدد حاصل کرنے کے بعد انہی کو بُرا بھی کہتے تھے۔ ایک بار بھی میں نے انہیں کہا کہ ایسے لوگوں کو کم از کم بتا دیا کریں کہ آپ کو ان کی حرکات کا علم ہے۔ انہوں نے کہا " یار اللہ کسی کو پھل دار درخت بناتا ہے کسی کو خار دار۔ پھل دار درخت کا اپنے پھلوں پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ حاصل کرنے والے کا کام ہے کہ وہ پھل پتھر مار کر توڑتا ہے یا درخت ہی کی جڑ کاٹ دینا چاہتا ہے۔ نہیں بھائی درخت کچھ نہیں کر سکتا۔

ممتاز حسن صاحب نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ انہیں بیان کرنا آسان نہیں مگر میں ادبی، تحریری، دفتری تمام کارناموں سے زیادہ اہم کارنامہ تو اسے کہتا ہوں کہ انہوں نے اپنی تمام مصروفیات اور عیال داری کے باوجود ایک شریف انسان کی زندگی بسر کی۔ یہ کارنامہ کوئی معمولی نہیں۔ بہت بڑی بات ہے۔

فرہنگ

صفحہ ۱۶۱۔ میڈیم: ذریعہ۔ اضطراری: بے ساختگی۔ فراوانی: کثرت۔ سرچشمہ: سرچھوٹا پڑا۔

صفحہ ۱۶۲۔ حسبِ مقدرت: حسبِ مقدور، اپنی توفیق کے مطابق۔ شناسائی: واقفیت۔ دانش: عقل۔ اثاثہ: ترکہ، وراثت۔

صفحہ ۱۶۳۔ دریغ نہ کرنا: گریز نہ کرنا۔ خار دار: کانٹوں والا۔ عیال داری: بال بچہ ہونا۔ عیال ــــ بال بچے۔ شعری ادب: وہ ادب جو بصورتِ شعر موجود ہے۔

صفحہ ۱۶۴۔ مروجہ: رائج۔ لازماً: ضرور۔ متعین: مقرر۔

صفحہ ۱۶۵۔ ممنونین: وہ لوگ جو احسان ہوتے ہیں۔ ضخامت: موٹائی۔ مزاحم: [illegible]

متن کے حوالے سے اقتباسات کی تشریح

(۱) اُن کی ہمہ صفاتی، بعض اوقات بعض سرسری مطالعہ کرنے والوں کو اُلجھن میں مبتلا رکھتی تھی۔ ممتاز صاحب کیا ہیں؟ ـــ ایک بڑے بیوروکریٹ، ایک ماہرِ مالیات، بینکر، منتظم یا اسکالر، دانشور، ادیب، مقرر، فنونِ لطیفہ کے خادم۔ دراصل وہ بہ یک وقت سبھی کچھ تھے۔ اُن کی زندگی نے ثابت کر دیا کہ اللہ مہربان ہو تو ایک آدمی بہ یک وقت بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک سورج کی طرح تھے جس کی رنگ برنگی کرنیں

تمام سمتوں میں جاتی ہیں، جس سے تمام ستارے اور سیارے روشنی پاتے ہیں۔

(۲)

پھر پاکستان بنا اور یہاں اُن کی مختلف حیثیتوں میں اُن سے شناسائی ہوئی اور تعلق بڑھتا گیا۔ میں ــــ عمر، رتبے اور دانش کے اعتبار سے اپنے آپ کو ان کے دوستوں میں تو شمار نہیں کر سکتا۔ ان کے عاشق مداحوں میں اپنا نام ضرور لکھوا سکتا ہوں اور اس طویل مشاہدے کی بنا پر کہتا ہوں کہ میں نے اُن کا گھر کبھی عالموں، دانشوروں، ادیبوں، ثقافتی کارکنوں اور اہلِ غرض سے خالی نہیں دیکھا۔ یقیناً اُن کے طرزِ زندگی میں ان کی مرحومہ بیگم کا بڑا کریڈٹ تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی خاتون ہونے کے باوجود اپنے عدیم المثال جوہر کو اپنے گھریلو مطالبات کا زیر بار نہیں رکھتی تھیں جو انہیں ان کے چاہنے والوں اور اہلِ حاجت سے دور کر دے۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ یہ سب اس سورج ہی کی کارفرمائی تھی۔

حوالۂ متن | یہ اقتباس "سورج جیسا آدمی (جمیل الدین عالی) سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق | کالم نگار ممتاز حسن جیسے عظیم انسان کی باتیں کر رہا ہے۔

تشریح | پھر پاکستان بن گیا اور یہاں مختلف حیثیتوں میں میری ان سے واقفیت ہوئی اور پھر ان کے ساتھ میرے تعلقات بڑھتے ہی گئے ــــ عمر، مرتبے اور عقل کے لحاظ سے میں اپنے آپ کو ان کے دوستوں میں شمار نہیں کر سکتا بلکہ صرف ان کے عاشقوں اور مداحوں ہی میں شمار کر سکتا ہوں میں اپنے لمبے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کے گھر میں ہمیشہ عالموں، دانشوروں، ادیبوں، ثقافتی کارکنوں اور کام والے لوگوں کو موجود پایا ــــ یقیناً ان کے اس انداز زندگی میں ان کی مرحومہ بیگم کا بھی بڑا حصہ ہو گا جس کے لیے وہ تعریف کی مستحق ہیں ــــ وہ ایک سیدھی سادی خاتون تھیں مگر انہوں نے اپنے بے مثال خاوند کو کبھی ایسے گھریلو مطالبوں کے ذریعے پریشان نہیں کیا جو انہیں ان کے چاہنے والوں اور غرض مندوں سے دور کر دے ــــ لیکن ــــ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس سورج ہی کے کرشمے تھے۔

(۳)

ممتاز حسن صاحب کی موت، اُن کی زندگی کی طرح بھرپور اور شاندار تھی۔ وہ ایک مکان کے علاوہ ذاتی اثاثے چھوڑ کر نہیں گئے۔ اعلیٰ درجے کی ایک طویل سرکاری ملازمت، سات برس مرکزی فینانس سیکرٹری رہنا، پانچ برس نیشنل بنک کا مینجنگ ڈائریکٹر رہنا، سات

برس ریٹائرمنٹ کے بھی گزارنا۔ اس عالم میں کہ گورنمنٹ آف پاکستان کے تقریباً ایک چوتھائی اعلیٰ افسران، اُن کے سابق ماتحت، شاگرد اور مداح تھے، اس کے باوجود خالی ہاتھ بلکہ مالی طور پر زیر باری کے ساتھ دنیا سے اُٹھ جانا، یہ ہمارے موجودہ قومی پس منظر میں کیسی شاندار روایت ہے۔

حوالۂ متن | یہ اقتباس "سورج جیسا آدمی" (جمیل الدین عالی) سے لیا گیا ہے۔

سیاق وسباق | کالم نگار ممتاز حسن جیسی شخصیت کی باتیں کر رہا ہے۔

تشریح | جیسی ممتاز حسن صاحب کی زندگی شاندار اور بھرپور تھی، ویسی ہی ان کی موت بھی شاندار اور بھرپور تھی ـــــ وہ صرف ایک مکان کے علاوہ کوئی جائیداد چھوڑ کر نہیں مرے ـــــ وہ طویل عرصے تک بڑے سرکاری افسر رہے، سات سال مرکزی سیکرٹری مالیات رہے، پانچ سال نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر رہے اور پھر سات سال تک ریٹائرڈ زندگی گزارنا، اس حالت میں کہ حکومتِ پاکستان کے قریب قریب چوتھائی اعلیٰ افسراُن کے سابق ماتحت، شاگرد یا مداح تھے ـــــ اس کے باوجود وہ دنیا سے خالی ہاتھ گئے ـــــ بلکہ ـــــ مالی اعتبار سے مقروض ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ـــــ ہمارے آج کے قومی پس منظر میں دیکھا جائے تو اتنے بڑے اور اتنے با اثر انسان کا ہمارے معاشرے میں یوں بے سر و سامانی کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جانا بڑی عجیب مگر شاندار روایت ہے۔

(۴)

"میاں! اللہ کسی کو پھل دار درخت بنا دیتا ہے، کسی کو خار دار۔ پھل دار درخت کا اپنے پھلوں پر کوئی اختیار نہیں۔ جو انہیں حاصل کر سکتا ہے، حاصل کر لیتا ہے۔ یہ حاصل کرنے والے کا کام ہے کہ وہ انہیں پتھر مار کر توڑتا ہے یا درخت کی جڑ ہی کاٹ دینی چاہتا ہے۔ نہیں بھائی، درخت کچھ نہیں کر سکتا ـــــ"

حوالۂ متن | یہ اقتباس "سورج جیسا آدمی" (جمیل الدین عالی) سے لیا گیا ہے۔

سیاق وسباق | عالی ممتاز حسن کی باتیں کر رہے ہیں اور انہی کے ایک قول کا حوالہ دے رہے ہیں۔

تشریح | ممتاز حسن صاحب نے مصنف سے کہا تھا ـــــ "خداوند کریم کسی انسان کو پھلدار درخت کو اپنے پھلوں پر کوئی اختیار نہیں، وہ تو اس کے بس میں نہیں، جو چاہے لے جائے ـــــ چاہے وہ پتھر مار کر توڑے یا درخت کی جڑیں کاٹ کر

— نہیں بھائی درخت کچھ نہیں کہہ سکتا —" دراصل وہ خود کو پھلدار درخت سے تشبیہہ دے رہے ہیں —

(۵)

میں انہیں پارس پتھر بھی سمجھتا ہوں۔ جو اسے چھو جائے، سونا بن جائے، سونا بن جاتا ہے جو ممتاز صاحب کو چھوتا تھا، کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتا — علم، مسرت، معاش، شرافت کے عجیب و غریب سبق — جب کہ اُن کا کہنا یہ تھا اور اس میں زمانہ سازی نہیں تھی، بناوٹی انکسار نہیں تھا کہ وہ جس سے ملتے ہیں اُس سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں ڈاکٹر ممتاز حسن کے کارنامے بہت ہیں — علمی، ادبی سرپرستی کے کارنامے، دفتر کارنامے، تحریری کارنامے — میری نظر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ کچھ اور ہے۔ وہ ثابت کر گئے ہیں کہ عیال داری، کاروباری مصروفیات اور ناسازگار حالات کے باوجود ایک انسان نہایت شریف انسان ہو کر جی سکتا ہے۔

حوالۂ متن یہ عبارت جمیل الدین عالی کے کالم "سورج جیسا آدمی" سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق عالی ممتاز حسن کو سورج جیسا آدمی قرار دے کر ان پر کالم لکھ رہے ہیں۔

تشریح میں انہیں پارس پتھر تصور کرتا ہوں — جسے جونہی چھوئے، سونا بن جائے — جو ممتاز صاحب سے ملتا تھا، ان سے کچھ نہ کچھ حاصل ہی کرتا تھا — وہ علم، خوشی، معاش، شرافت کے نئے نئے سبق سیکھ کر جاتا — جبکہ وہ کہا کرتے تھے (اور یہ نہ تو دنیا داری کی بات ہے اور نہ ہی اس میں کوئی بناوٹی عجز ہے) کہ میں جس سے بھی ملا، کچھ نہ کچھ حاصل ہی کیا۔ ڈاکٹر ممتاز حسن کے کارنامے بے شمار ہیں — علمی اور ادبی سرپرستی کے کارنامے، دفتری کارنامے، تحریری کارنامے — مگر — میری نگاہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ تو کچھ اور ہی ہے — انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بال بچوں کے باوجود، طرح طرح کی کاروباری مصروفیتوں کے باوجود اور بدترین حالات کے باوجود اگر انسان چاہے تو ایک شریف انسان بن کر زندگی گزار سکتا ہے۔

اصناف نثر

اصنافِ ادب

بنیادی طور پر ادب کی دو قسمیں ہیں۔ نظم اور نثر۔ نظم اس ادب پارے کو کہتے ہیں جس میں باقاعدہ بحر ہو۔ جب کہ نثر میں کسی بحر کا التزام نہیں ہوتا۔ اس ظاہری فرق کے علاوہ نظم اور نثر میں معنوی فرق بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ نظم جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے اور نثر کے ذریعہ معلومات و تجربات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم پڑھنے سے پڑھنے والے کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ اس کے جذبات متاثر ہوتے ہیں اور وہ نظم پڑھ کر اس نظم کی خاص کیفیت اور مضمون کے مطابق غم، خوشی اور محبت کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے جب کہ نثر پڑھنے سے پڑھنے والے کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے جذبات پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ نظم کا تعلق دل سے ہے اور نثر کا دماغ سے

اصنافِ نثر

نفسِ مضمون کے لحاظ سے کوئی نثر افسانوی یا غیر افسانوی کہلا سکتی ہے۔ افسانوی نثر میں داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ شامل ہیں جب کہ غیر افسانوی نثر کی اہم اقسام میں مضمون، مقالہ، انشائیہ، خاکہ، تبصرہ، ترجمہ، مکتوب۔ آپ بیتی، سوانح عمری، سفرنامہ شامل ہیں۔ مذکرہ بالا اصنافِ نثر کی تشریح کی جاتی ہے۔

داستان:

داستان سے مراد وہ قدیم قصے کہانیاں ہیں جن کی بنیاد رومان یا تخیل پر ہوتی ہے اور جن میں مافوق الفطرت عناصر کی بھرمار ہوتی ہے۔ پرانی داستانوں میں میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" رجب علی سرور کی "فسانۂ عجائب" اور اور حیدر بخش حیدری کی "آرائش محفل" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں وہ تمام باتیں ترتیب وار دی جاتی ہیں جو کسی داستان کا جزو ہوتی ہیں۔

۱۔ داستان بہت طویل ہوتی ہے۔

۲۔ اکثر داستانوں کے پلاٹ ایک جیسے ہوتے ہیں ان میں کوئی حقیقی نیا پن نہیں ہوتا۔

۳۔ داستان کی بنیاد تخیل اور رومان پر ہوتی ہے اور مصنف پڑھنے والوں کو خیالی اور رومانی دنیا میں لے جاتا ہے۔

۴۔ داستانوں میں بیان کردہ ماحول بالعموم پڑھنے والوں کے لیے غیر مانوس ہوتا ہے اور ایسی طلسماتی فضا نظر آتی ہے جو خلافِ فطرت ہوتی ہے

۵۔ داستان میں بہت سی غیر ضروری باتیں قصے کو طویل کرنے کے لیے شامل کرلی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان میں کئی بے بنیاد باتیں۔ کئی بعید از قیاس عناصر اور کئی غیر ضروری تفاصیل ملتی ہیں۔

۶۔ داستان میں تصنع اور تکلف ملتا ہے اور محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے اور جگہ جگہ اشعار اور اقوال کے حوالے اور دوسری زبانوں کے مشکل اور اجنبی الفاظ ملتے ہیں۔

۷۔ داستانوں کے اکثر کردار ایسے ہوتے ہیں جو کہانی کے اندر تو ملتے ہیں مگر عملی زندگی میں ایسے لوگ کہیں نہیں ملتے۔ چنانچہ داستانوں میں کہیں سخاوت کے مجسمے ملتے ہیں تو کہیں بدی کے مجسم نمونے مگر ان میں اتنی مبالغہ آمیزی ہوتی ہے کہ دنیا میں اتنا سخی ہی ملتا ممکن ہوتا ہے اور نہ ہی اتنا برا آدمی۔

۸۔ داستانوں کے اکثر واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے مشاہدے میں آ ہی نہیں سکتے۔ انہیں جادو، خواب یا کرامات کا نام دے کر یونہی شامل کرلیا جاتا ہے۔

۹۔ داستانوں میں اکثر ذیلی یا ضمنی کہانیاں بھی ہوتی ہیں، جو جگہ جگہ وضاحتوں یا مثالوں کے بہانے سے محض کہانی کو طویل کرنے کے لیے شامل کی جاتی ہیں۔

۱۰۔ داستان ہمیشہ طربیہ انداز میں ختم ہوتی ہے یعنی اس کا انجام ہمیشہ خوشگوار ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ واقعات چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کا نتیجہ ہمیشہ خوشگوار ہی نکلے۔

۱۱۔ داستان میں دلچسپی کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اکثر اوقات اصلاحی مقاصد پیشِ نظر ہوتے۔ تاہم جہاں کہیں داستان گو اصلاحی مقصد سامنے رکھتا ہے وہاں اس کا انداز زیادہ واضح ہو کر تقریر یا وعظ کا رنگ اختیار کر جاتا ہے۔

۱۲۔ اکثر اوقات داستان کسی اور زبان کی طویل کہانی کا ترجمہ ہوتی ہے۔

ناول

ناول اس قصے یا کہانی کو کہتے ہیں جس کا موضوع انسانی زندگی ہو۔ چنانچہ ناول نگار اپنے خاص انداز میں اور خاص ترتیب سے ناول کی صورت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ و مشاہدہ پیش کرتا ہے۔ ناول کی بنیاد ٹھوس حقائق پر ہوتی ہے اور اس میں فرضی اور مافوق الفطرت

باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ناول کا ایک واضح پلاٹ ہوتا ہے اور کہانی کے کئی کردار ہوتے ہیں جن میں سے ایک یا دو مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسرے کرداروں کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔ یہ کردار ہماری روزمرہ زندگی ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت ایسی مثالی نہیں ہوتا۔ جس کا وجود ہی ممکن نہ ہو۔ اُردو کے خاص قابل ذکر ناولوں میں توبۃ النصوح (نذیر احمد) فسانۂ آزاد (رتن ناتھ سرشار) امراؤجان ادا (مرزا رسوا) میدان عمل (پریم چند) خواب ہستی (مرزا محمد سعید) شکست (کرشن چندر) ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی) محمد بن قاسم (نسیم حجازی) رقص ابلیس (ایم اسلم) آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر) خدا کی بستی (شوکت صدیقی) آنگن (خدیجہ مستور) آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد) اداس نسلیں (عبداللہ حسین) اور تلاش بہاراں (جمیلہ ہاشمی) کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

داستان اور ناول میں فرق

۱۔ داستان بہت طویل ہوتی ہے۔ جب کہ ناول کو بلا وجہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں بنایا جاتا۔

۲۔ داستان میں اکثر جگہ غیر مانوس ماحول ملتا ہے۔ جب کہ ناول میں ایسا نہیں ہوتا۔

۳۔ داستان میں کئی بعید از قیاس اور بے بنیاد عناصر بھی شامل کر لیے جاتے ہیں۔ جب کہ ناول میں ہمارے اپنے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔

۴۔ داستان میں تصنع اور تکلف ملتا ہے اور محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جگہ جگہ اشعار اور اقوال کے حوالے اور دوسری زبانوں کے مشکل اور اجنبی الفاظ ملتے ہیں، لیکن ناول ایسا نہیں ہوتا۔

۵۔ بیشتر داستانیں دوسری زبانوں سے ترجمہ ہیں مگر ناول طبع زاد ہوتا ہے۔

۶۔ داستان کے اکثر کردار مثالی ہوتے ہیں اور عملی زندگی میں ان جیسے لوگ کہیں نہیں ملتے جب کہ ناول کے کردار ہماری زندگی ہی سے لیے گئے ہوتے ہیں۔

۷۔ داستان کے بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے مشاہدہ میں آہی نہیں سکتے۔ جادو، خواب، کرامات وغیرہ کا نام دے کر انہیں یونہی شامل کر لیا جاتا ہے۔ جب کہ ناول میں ایسا نہیں ہوتا۔

۸۔ داستان میں عموماً ضمنی یا ذیلی قصے بھی آتے ہیں۔ مگر ناول میں ایسا نہیں ہوتا۔

۹۔ داستان ہمیشہ طربیہ انداز میں ختم ہوتی ہے یعنی اس کا انجام ہمیشہ خوشگوار ہوتا ہے اور ناول میں ایسا نہیں ہوتا۔ ناول کا انجام طربیہ بھی ہو سکتا ہے اور المیہ بھی۔

۱۰۔ داستان میں دلچسپی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے جب کہ ناول میں دلچسپی کے علاوہ زیادہ زور کسی اصلاحی مقصد پر ہوتا ہے جسے اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ کہیں وعظ یا تقریر کا رنگ پیدا نہ ہو۔

۱۱۔ افسانہ

افسانہ ناول کے مقابلے میں مختصر ہوتا ہے اور اس کی کہانی میں کئی کرداروں کی بجائے ایک کردار کو اور زندگی کے بے شمار واقعات کی بجائے کسی ایک واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ پریم چند اردو کا پہلا افسانہ نگار تھا جس نے بے شمار اصلاحی اور معاشرتی افسانے لکھے۔ پریم چند کے بعد سجاد حیدر یلدرم، علی عباس حسینی، ل احمد، سلطان حیدر جوش، اعظم کریوی، حیات اللہ انصاری، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور سعادت حسن منٹو کے نام اہم ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے بعد جن لوگوں نے اردو افسانے میں گراں قدر اضافے کیے ان میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی ممتاز شیریں، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، ممتاز مفتی، واجدہ تبسم، صادق حسین اور آغا بابر کے نام لائق ذکر ہیں۔ آج کل جن لوگوں کے خوبصورت افسانے ہمارے سامنے ہیں ان میں غلام ثقلین نقوی، مسعود مفتی، انور سجاد، بانو قدسیہ مرزا ریاض، جمیلہ ہاشمی، فرخندہ لودھی، فہمیدہ اختر، قیوم راہی وغیرہ کے نام خاصے اہم ہیں۔

ناول اور افسانے میں فرق

۱۔ ناول طویل ہوتا ہے اور افسانہ مختصر۔

۲۔ ناول میں زندگی کے کئی گوشے نمایاں کیے جا سکتے ہیں جب کہ افسانے میں زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ناول میں کئی کردار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن افسانہ ایک ہی کردار کی کہانی پیش کرتا ہے۔

۴۔ ناول میں زائد تشریحات اور ضمنی قصے کی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔

۵۔ ناول میں کہانی کے آگے بڑھنے کی رفتار سست ہوتی ہے لیکن افسانے میں تیز ہوتی ہے۔

۶۔ ناول کے مقابلے میں افسانے میں وحدتِ تاثر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

ڈراما

ڈراما بھی ایک کہانی ہوتا ہے، لیکن اس میں مصنف خود کہانی بیان نہیں کرتا، بلکہ سب کچھ اپنے کرداروں کی زبانی کہلاتا ہے۔ ڈرامے میں زندگی کے کئی پہلو پیش کیے جا سکتے ہیں اور کوئی ایک پہلو بھی۔ دوسری صورت میں ڈراما، ایک ایکٹ کا ڈراما کہلائے گا جب کہ پہلی صورت میں اس کے کئی ایکٹ ہو سکتے ہیں۔ جس ڈرامے کا انجام خوشگوار ہوا سے طربیہ ڈراما یا کامیڈی کہتے ہیں جب کہ اس ڈرامے کو جس کا انجام المناک ہو المیہ یا ٹریجیڈی کہتے ہیں۔ امانت لکھنوی آغا حشر، اور عبدالحلیم شرر نے اردو کو نہایت خوبصورت ڈرامے دیے ان کے بعد اب تک ڈرامے کے سلسلے میں جن لوگوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے ان میں حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج اور میرزا ادیب کے نام سرفہرست ہیں۔

مضمون

کسی بھی مضمون پر اپنے خیالات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون نگار اپنے علم اپنی سوچ اپنے تجربات اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں کسی بھی موضوع پر لکھ سکتا ہے۔ اپنے علم اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں کسی بھی موضوع پر لکھ سکتا ہے اپنے علم اور اپنے موضوع کی مناسبت سے دلائل حوالے اور دوسروں کے اقوال بھی شامل مضمون کر سکتا ہے۔ کامیاب مضمون نگار وہ ہے جس سے کوئی واضح نتیجہ بھی نکلتا ہو۔ سرسید احمد خان پہلے باقاعدہ مضمون نگار ہیں۔ ان کے علاوہ قریب قریب سبھی باقاعدہ لکھنے والوں نے تھوڑے یا زیادہ مضمون ضرور لکھے ہیں۔

مقالہ

کسی موضوع پر علمی اور تحقیقی انداز میں لکھا ہوا مضمون مقالہ کہلاتا ہے بظاہر مضمون اور مقالہ ایک چیز ہی ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ مقالے کی فضا علمی اور تحقیقی ہوتی ہے۔ اگرچہ مقالہ عموماً مضمون سے طویل ہوتا ہے۔ لیکن مقالے اور مضمون میں طویل یا مختصر ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ ہی زیادہ یا کم طوالت ہی کو ملحوظ رکھ کر کسی نثر پارے کو مضمون یا مقالہ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں عنصر فاضل تو نثر پارے کا مزاج ہے جو اگر علمی و تحقیقی ہے تو اسے مقالہ کا نام دیا جائے گا ورنہ مضمون کا اردو کے اہم مقالہ نگاروں میں سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر احسن فاروقی، ممتاز شیریں کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

خاکہ

خاکہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں کسی شخصیت کا گہرا تاثر پیش کیا جائے۔ خاکے کا انداز تحریر شگفتہ ہوتا ہے اور خاکہ نگار بے تکلفی کے ساتھ زیر بحث شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیاں بھی گنواتا چلا جاتا ہے۔ جس سے پڑھنے والے ذہن میں اس شخصیت کا ایسا گہرا تاثر جاگزیں ہوتا ہے جو اصل کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ خاکے کی ابتدائی مثالیں محمد حسین آزاد اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاں ملتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو، رشید احمد صدیقی مولوی عبدالحق اور محمد طفیل نے خاکہ نگاری میں بڑے خوبصورت اضافے کیے ہیں۔ چنانچہ سعادت حسن منٹو کی گنجے فرشتے۔ رشید احمد صدیقی کی "گنجہائے گراں مایہ" "مولوی عبدالحق کی چند ہم عصر اور محمد طفیل کی "صاحب" اور جناب" خاکوں پر مشتمل اہم کتابیں ہیں۔

انشائیہ

انشائیہ مضمون کی وہ خاص صورت ہے جو انگریزی میں ESSAY کے نام سے بہت پہلے سے موجود رہی ہے اردو میں اسے بہت بعد میں اپنایا گیا۔ انشائیہ کا ہلکا پھلکا انداز اس کی بے تکلفی کی فضا اور اس کا اسے عام مضمون سے واضح طور پر الگ ایک صنف ادب ظاہر کرتے ہیں۔ مسلسل مطالعہ کرنے والے کے لئے انشائیے کو مضمون سے تمیز کرنا مشکل نہیں۔ انشائیے کے موضوعات میں بڑی وسعت ہوتی ہے اور انشائیہ نگار معمولی سے معمولی موضوع پر بھی قلم اٹھا سکتا ہے اور خوبصورت انشائیہ تخلیق کر سکتا ہے۔ انشائیہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام سرفہرست ہے

سفرنامہ

رپورتاژ یا سفرنامہ کسی سفر کے حالات پر مشتمل تحریر کو کہتے ہیں لکھنے والے نے سفر کے دوران جو جو کچھ دیکھا ہوتا ہے اسے بے تکلفی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے اور سفر کے دوران گزرے ہوئے حالات و واقعات پر خوبصورتی سے روشنی ڈالتا چلا جاتا ہے۔ جس سے سفرنامہ ایک دلچسپ روئیداد بن کر سامنے آتا ہے۔ سفرنامہ کسی شخص کے سفر کی تحریری فلم ہوتی ہے اور دیکھنے والے کا مقصد کوئی خاص نتیجہ برآمد کرنا نہیں ہوتا۔ پرانے سفرناموں میں "مسافران لندن" (سرسید احمد خان) "سیر ایران" (محمد حسین آزاد) جب کہ نئے سفرناموں میں "سات سمندر پار" (اختر ریاض الدین) "چلتے ہو تو چین چلیے" (ابن انشاء) نکلے تیری تلاش میں (مستنصر حسین تارڑ) امریکہ اور امریکہ (عطاءالحق قاسمی) بڑے خوبصورت سفرنامے ہیں۔

مقصد کے اعتبار سے نثر کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ بیانیہ نثر

جس میں تاریخی یا فرضی واقعات مسلسل بیان کیے جاتے ہیں اسے بیانیہ نثر کہتے ہیں۔ افسانہ، داستان، ناول، تاریخ، سوانح عمری، سفرنامہ وغیرہ شامل ہیں۔ تسلسل بیانیہ نثر کی خاص خوبی ہے۔

۲۔ وصفیہ نثر

جس میں کسی منظر، واقعہ یا کردار کی تصویر کشی ہو اسے وصفیہ نثر کہتے ہیں۔

۳۔ توضیحیہ نثر

جس میں اپنے نظریہ کو مخاطب تک وضاحت کے ساتھ پہنچایا جائے اسے توضیحیہ نثر کہتے ہیں۔

۴۔ استدلالیہ نثر

جس میں کسی دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کیے جائیں تاکہ مخاطب اس دعوے کی سچائی کو مان جائے اسے استدلالیہ نثر کہتے ہیں۔ اندازِ تحریر کے لحاظ سے نثر کی تقسیم یوں بھی کی جاتی ہے۔

۱۔ سادہ نثر

ایسی نثر جس کی زبان آسان اور عام فہم ہو۔

۲۔ رنگین نثر

ایسی نثر جس میں فطری اندازِ بیان کی بجائے شاعرانہ انداز میں صنائع و بدائع کا استعمال کیا گیا ہو اور رعایتِ لفظی سے کام لیا گیا ہو۔

۳۔ سلیس نثر

ایسی نثر جس میں آسان تر صورت میں مطالب کو پیش کیا گیا ہو۔

۴۔ دقیق نثر

ایسی نثر جس کے مطالب تشریح کے بغیر سمجھ میں نہ آئیں۔

۵۔ عاری نثر

ایسی نثر جس میں صنائع و بدائع قطعاً نہ ہوں بلکہ کوئی تشبیہ اور استعارہ تک بھی نہ ہو۔

۶۔ مرصع و مقفیٰ نثر

ایسی نثر جس میں ایک فقرے کے تمام الفاظ دوسرے فقرے کے ہم قافیہ اور ہم وزن ہوں۔